تحقیقی مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی اُردو

ابدال بیلا کی کتاب آقا ﷺ میں سیرت، سوانح، تاریخ اور ادب کے عناصر کا تنقیدی تجزیہ

محقق

افشاں بتول

60-FLL/PHDURDU/S18

نگران

پروفیسر ڈاکٹر نجیبہ عارف، پروفیسر، شعبہ اُردو

شریک نگران

ڈاکٹر غلام فریدہ، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

K

TH-27828

PhD
297.63
ق ا

حضرت محمدؐ پیغمبر اسلام بحیثیت رسول
سیرت، تاریخ اور ادب کے [illegible]
تجزیہ

الجامعة الإسلامية العالمية
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
شعبہ اُردو

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ افشاں بتول رجسٹریشن نمبر 60-FLL/PHDURDU/S18 نے پی۔ایچ۔ڈی اُردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے مقالہ بعنوان **"ابدال بیلا کی کتاب آقاﷺ میں سیرت ، سوانح ،تاریخ اور ادب کے عناصر کا تنقیدی تجزیہ"** رقم کیا ہے۔میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

نگران: پروفیسر ڈاکٹر نجیبہ عارف
پروفیسر، شعبہ اُردو

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: **AFSHAN BATOOL**

Title of the Thesis: ابدال بیلا کی کتاب آقاﷺ میں سیرت، سوانح، تاریخ اور ادب کے عناصر کا تنقیدی تجزیہ

Registration No: **60-FLL/PHDURD/S18**

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Doctor of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

Chairperson Viva Committee:

Dr. Kamran Abbas Kazmi
Chairperson
Department of Urdu, IIUI

External Examiner-I:

Prof. Dr. Rubina Shahnaz
Professor
Deptt. of Urdu, NUML, Islamabad

External Examiner-II:

Dr. Saeed Ahmed
Associate Professor
IMCB, F-8/4, Islamabad

Internal Examiner:

Dr. Saira Batool
Assistant Professor
Department of Urdu, IIUI,

Supervisor:

Prof. Dr. Najeeba Arif
Dean FLL/ Professor
Department of Urdu, IIUI

Co-Supervisor:

Dr. Ghulam Farida
Assistant Professor
Department of Urdu, IIUI

ID PB-CKL-68ABEC182EBD6E04
Type Low Denomination
Amount Rs 100/-

Scan for online verification

Description	AFFIDAVIT - 4
Applicant	Afshan Batool [37203-3941793-0]
D/O	Malik Shoukat Hayat
Agent	Self
Address	Talagang
Issue Date	1-Feb-2023 3:45:15 PM
Delisted On/Validity	8-Feb-2023
Amount in Words	One Hundred Rupees Only
Reason	Affidavit
Vendor Information	Muhammad Ammar Raza | PB-CKL-27 | Tehsil Courts Talagang Katcheri

نوٹ یہ ٹرانزیکشن تاریخ اجرا سے سات دنوں تک کے لیے قابل استعمال ہے ای اسٹامپ کی تصدیق بذریعہ ویب سائٹ،کیوآر کوڈ یا ایس ایم ایس سے کی جا سکتی ہے۔
Type "eStamp <16 digit eStamp Number>" send to 8100

M. AMMAR RAZA STAMP VENDOR TALAGANG Licence No. 27 01 FEB 2023

﴿بیان حلفی﴾

منکہ مسماۃ افشاں بتول بنت ملک شوکت حیات رجسٹریشن نمبر60,FLL/PHD URDU/S18 حلفیہ بیان دیتی ہوں کہ میں نے اپنا تحقیقی مقالہ بعنوان "ابدال بیلا کی کتاب آقا ﷺ میں سیرت،سوانح،تاریخ اور ادب کے عناصر کا تنقیدی تجزیہ" برائے حصول سند پی۔ایچ۔ڈی،ڈاکٹر نجیبہ عارف کی زیر نگرانی اپنی محنت سے تحریر کیا ہے۔یہ مقالہ،سرقے سے پاک ہے اور اس میں تحقیق و تنقید کے اصول و ضوابط کو مد نظر رکھا گیا ہے نیز اس سے پہلے یہ کسی جامعہ میں برائے حصول سند پیش نہیں کیا گیا اس میں شامل تمام حوالہ جات کا استناد موجود ہیں اور اس میں مقالے کے تمام نتائج تحقیق کی ذمہ دار ہوں مندرجہ بالا میں جو کچھ لکھا گیا ہے میرے علم و آگہی کے مطابق بالکل صحیح و درست ہے اور اس میں کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھی گئی۔

العبد

دستخط:-

نام :- افشاں بتول

والد کا نام:- ملک شوکت حیات

شناختی کارڈ نمبر:- 37203-3941793-0

گواہ شد

دستخط:-

نام :- شیراز فضل داد

والد کا نام:- فضل داد

شناختی کارڈ نمبر:- 61101-1734509-2

ATTESTED BY

بسم الله الرحمن الرحيم

In the name of Allah the most beneficent the most merciful

عرضِ حال

اس مقالے میں ابدال بیلا کی سیرت کی کتاب آقاﷺ کا چار مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا گیا ہے۔ سیرت بایو گرافی/سوانح کی ایک قسم ہے تاہم یہ عام سوانح سے مختلف ہے۔ اس لیے اس پر سوانح نگاری کے عمومی اصولوں کا کلی اطلاق نہیں کیا جاسکتا، لہٰذا اس کتاب کے لیے چار مختلف علوم؛ سیرت، سوانح، تاریخ اور ادب کے جدید اصول و قواعد اور نظری پیمانے کے تناظر میں ایک ایسا فریم ورک تشکیل دیا گیا ہے جس کے تحت آقاﷺ کا تحقیقی و تنقیدی تجزیہ جدید تکنیکی اور سائنسی بنیادوں پر کیا جاسکے۔ شاید سب کے اذہان میں یہ بات گونج رہی ہوگی کہ کہاں سیرت؟ جو ایک برتر بایو گرافی (Super Biography) ہے اور کہاں عام مفکرین کے نظریات؟ یہ سچ ہے کہ جب اردو ادب کے آغاز میں سیرت و سوانح نگاری میں تحقیق کی بجائے عقیدت کا زیادہ رجحان پایا جاتا تھا، تو سرسید، مولانا حالی اور علامہ شبلی نعمانی نے بھی جدید سیرت و سوانح نگاری کی بنیاد اس وقت کے جدید مغربی نظریات کے تناظر میں ہی رکھی تھی۔ اردو میں چوں کہ اس موضوع پر تحقیقی کام کم ہے، اس لیے اس فریم ورک کی تشکیل میں انگریزی بایو گرافی کی تحقیقی کتب سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ اس محنت اور جستجو کا ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ اس تلاش میں نئے کام کرنے والوں کے لیے کچھ نئے در بھی وا ہوئے۔

میرے بعد آنے والے دیں دعائیں میری وحشت کو
بہت کانٹے نکل آئے مرے ہمراہ منزل سے

ڈاکٹر نجیبہ عارف صاحبہ کی نگرانی میں، ان کی ہدایات کے مطابق اس مقالے "ابدال بیلا کی کتاب آقاﷺ میں سیرت، سوانح، تاریخ اور ادب کے عناصر کا تنقیدی تجزیہ" کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ باب اوّل میں موضوع کا تفصیلی تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر سابقہ تحقیقات کا جائزہ لیا گیا ہے اور مجوزہ تحقیق کے لیے منتخب کردہ نظریاتی ڈھانچے کی تعریف و وضاحت کی گئی ہے۔ باب دوم میں سیرت نگاری کے میدان میں نئے محرکات اور امکانات کا کھوج لگانے کے لیے معروف علما و محققین و ناقدین، مولانا شبلی نعمانی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، ڈاکٹر حمید اللہ، ڈاکٹر سید عبداللہ اور مستشرقین میں سے لیزلی ہیزلٹن کے وضع کردہ اصول سیرت نگاری کو مد نظر رکھتے ہوئے کچھ اصول سیرت نگاری اخذ کیے گئے ہیں۔ ان اخذ کردہ اصول سیرت نگاری کی مختلف عنوانات کے تحت درجہ بندی کی گئی ہے۔ ان اصولوں کا آقاﷺ کے متن پر اطلاق کر کے آقاﷺ میں سیرت کے عناصر کا تنقیدی تجزیہ کیا گیا ہے۔ باب سوم میں آقاﷺ کا تنقیدی تجزیہ جدید اصولِ سوانح کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لیے جیمز لوری کلفرڈ (James Lowry Clifford:(۱۹۰۱ء-۱۹۷۸ء) کی تصنیف *From Puzzles to*

اور مائیکل بینٹن(Micheal Benton) کی تصنیف *Literary Biography : An Introduction* میں موجود نظریاتی و *Portraits : Problems of Literary Biographer* تنقیدی مباحث کو آقا ﷺ کے سوانحی عناصر کی تحقیق کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ان کتب میں موجود مباحث کی روشنی میں آقاﷺ کے حوالے سے سوانح نگاری کی نوعیت اور سوانح کی ترتیب و تشکیل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ باب چہارم میں آقاﷺ کا تنقیدی تجزیہ تاریخ نگاری کے اصولوں کی روشنی میں کیا گیا ہے۔آقاﷺ میں تاریخی پہلوؤں کی جانچ، پرکھ کے لیے دو معاصر تاریخ دان جارن ریوزن Jorn Rusen (۱۹۳۸ء) اور ڈیوڈ کار David Carr (۱۹۴۰ء) کے تاریخی نظری مباحث کو پیمانے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ان مصنفین کے یہ نظری مباحث ان کی تصانیف بالترتیب *History: Narration,Interpretation,Orientation* اور *History , Fiction and Human Time: Historical imagination* میں بیان ہوئے ہیں۔ ان کتب میں موجود مباحث کی روشنی میں آقاﷺ میں تاریخی بیانیے کی نوعیت، معروضی حقائق کی موضوعی وضاحت اور آقاﷺ کے تاریخی بیانیے میں تخیل کی کارفرمائی کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔ باب پنجم میں میں آقاﷺ کے ادبی عناصر کا جائزہ، معروف محقق اور مصنف ڈیوڈ جولف (۱۹۳۹ء، David Jolliffe) کی طرف سے دیے گئے Rhetorical Framework کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ماحصل میں مقالے کے بنیادی سوالاتِ تحقیق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے نتائج مرتب کیے گئے ہیں۔

اس مقالے کی تکمیل میں سب سے بڑی دشواری کا سامنا تب کرنا پڑا، جب وبائی مرض، کرونا کی وجہ سے لائبریریاں بند ہو گئیں۔ موضوع کے مطابق آن لائن کتب کی تلاش بلاشبہ ایک مشکل مرحلہ تھا، لیکن ہر دل عزیز استاد محترمہ ڈاکٹر نجیبہ عارف صاحبہ کی رہنمائی میں سارے مشکل مرحلے طے ہوتے چلے گئے۔

اس مقالے کی تکمیل پر سب سے پہلے خدائے بزرگ و برتر کے حضور سجدہ شکر بجالاتی ہوں، جس کے فضل اور رحمتِ خاص کی بدولت ہی میں آج اس مقام پر پہنچی۔اس تحقیقی کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے مجھے میری والدہ اور باقی تمام گھر والوں کا بھی خصوصی تعاون حاصل رہا۔یقیناًان کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کے بغیر یہ کام ممکن نہ تھا۔میں ان سب کے انتہائی خلوص، محبت اور شفقت کے لیے ان کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔خاص طور پر اپنی بیٹی، عیشل فاطمہ کی، جس نے اپنا قیمتی وقت ہر مرحلے پر بخوشی مجھے دیا اور یہ کہہ کر میرا حوصلہ بڑھایا کہ :

"Mama you can do it."

اس موقع پر اپنی نگران استاد محترمہ ڈاکٹر نجیبہ عارف صاحبہ کا بھی صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔ یہ اعتراف کرنے میں مجھے کوئی عار نہیں کہ مجھے اس مقدس موضوع پر تحقیقی کام کرنے کی سعادت ان ہی کی نظرِ کرم اور

عنایت کی وجہ سے نصیب ہوئی۔ موضوع کے انتخاب سے لے کر مقالے کی تکمیل تک کے تمام مراحل میں میڈم صاحبہ کی خصوصی توجہ، شفقت، رہنمائی اور نہ اکتانے والا انداز اس طرح سے میرے شاملِ حال رہے کہ ایک ایک لفظ گویا ان ہی کی رہنمائی میں ذہن سے نکلا اور صفحہ قرطاس پہ منتقل ہوا۔ آن لائن کلاس کے دوران میرے طویل مباحث سن کر بھی اپنی جبیں پہ ایک شکن تک نہ لانے والی ہستی، اپنی شفیق ترین استاد محترمہ کو میری طرف سے عقیدت و احترام سے لبریز سلام۔

معاون نگران ڈاکٹر غلام فریدہ بھی خصوصی شکریے کی مستحق ہیں، جنہوں نے مقالے کی تکمیل کے دوران پیش آنے والے مسائل بہت توجہ اور خلوص سے سنے اور ہر ممکن حد تک ان کے حل کے لیے میری رہنمائی کی۔

آخر میں ان تمام لوگوں کا خلوصِ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے اس مشکل وقت میں میری دل جوئی کی، ہمت بندھائی اور دعاؤں میں یاد رکھا۔ خداوند عالم کے حضور دست بہ دعا ہوں کہ وہ ان سب کو شاد و آباد اور بامراد رکھیں۔ آمین۔

افشاں بتول

اپریل ۲۰۲۲ء

فہرست موضوعات

صفحہ نمبر	عنوانات	نمبر شمار
	عرضِ حال	
۱	باب اوّل: آقاﷺ: تحقیقی و نظری اساس اور پس منظری مطالعہ	
۲	کتاب و مصنف کا تعارف	۱.۱
۳	سیرت نگاری: مفہوم و تعبیر	۱.۲
۵	سوانح نگاری: عمومی مباحث	۱.۳
۶	سیرت اور سوانح نگاری میں تعلق	۱.۴
۸	تاریخ نگاری کے منہج	۱.۵
۱۱	سیرت و سوانح اور تاریخ نگاری میں تعلق	۱.۶
۱۳	ادبی اظہار کے قرینے	۱.۷
۱۵	سیرت و سوانح میں ادبی پیرایہ اظہار اور اس کے نتائج	۱.۸
۱۶	منتخب نظری ڈھانچہ: تعریف و وضاحت	۱.۹
۲۱	سیرت نگاری پر سابقہ تنقید و تحقیق: مطالعہ	۱.۱۰
۲۹	سوانح نگاری کی تحقیق کی روایت	۱.۱۱
۳۱	حوالہ جات	
۳۵	باب دوم: اصولِ سیرت اور آقاﷺ: تنقید و تجزیہ	
۳۶	اصول سیرت نگاری و منہج تحقیق	۲.۱
۳۹	مولانا شبلی نعمانی کے اصولِ سیرت نگاری	۲.۲
۴۰	ابوالحسن ندوی کے اصولِ سیرت نگاری	۲.۳
۴۱	ڈاکٹر سید عبداللہ کے اصولِ سیرت نگاری	۲.۴
۴۲	ڈاکٹر حمید اللہ کے اصولِ سیرت نگاری	۲.۵

۲.۶ لیزلی ہیزلٹن(Lasely Hezeltan)کے اصولِ سیرت نگاری ۴۴
۲.۷ اصولِ سیرت نگاری: نظری ڈھانچہ ۴۵
۲.۷.۱ مآخذ و مصادر ۴۶
۲.۷.۲ اسلوبِ بیان ۴۶
۲.۷.۳ تخیل آرائی/تصویر بانی ۴۶
۲.۷.۴ عہدِ نبوی ﷺ کے ماحول سے واقفیت ۴۷
۲.۷.۵ سیرت نگاری اور دیگر علوم میں تعلق کی اہمیت سے آگاہی ۴۷
۲.۷.۶ معاصر عہد سے ہم آہنگی ۴۷
۲.۸ آقاﷺ پر ا اصولِ سیرت نگاری کا اطلاق ۴۸
حوالہ جات ۸۴

باب سوم: اصول سوانح اور آقاﷺ: تنقید و تجزیہ ۸۹
۳.۱ جیمز لوری کلفرڈ(James Lowry Clifford)کے مباحث ۹۱
۳.۲ کلفرڈ کی بیان کردہ سوانح نگاری کی اقسام ۹۴
۳.۲.۱ معروضی بایو گرافی ۹۵
۳.۲.۲ علمی، تاریخی بایو گرافی ۹۶
۳.۲.۳ فنکارانہ (ادیبانہ) بایو گرافی ۹۶
۳.۲.۴ بیانیہ بایو گرافی ۹۸
۳.۲.۵ افسانوی بایو گرافی ۹۸
۳.۳ مائیکل بینٹن(Micheal Benton)کے مباحث ۹۹
۳.۴ کلفرڈ اور بینٹن کے مباحث کا آقاﷺ پر اطلاق ۱۰۰
۳.۴.۱ آقاﷺ کا ابتدائی حصہ ۱۰۰
۳.۴.۲ آقاﷺ کا وسطی حصہ ۱۰۴
۳.۴.۳ آقاﷺ کا اختتامی حصہ ۱۱۷
حوالہ جات ۱۲۶

باب چہارم: تاریخ نگاری کے معاصر اصول اور آقا ﷺ	۱۳۰
۴.۱ آقا ﷺ میں تاریخی بیانیے کی نوعیت	۱۳۲
۴.۱.۱ روایتی بیانیہ	۱۳۴
۴.۱.۲ مثالی بیانیہ	۱۳۷
۴.۱.۳ تنقیدی بیانیہ	۱۴۰
۴.۱.۴ جینیاتی بیانیہ	۱۴۲
۴.۲ معروضی حقائق کی موضوعی وضاحت	۱۴۶
۴.۳ آقا ﷺ کی تاریخ نگاری میں بیانیے کا کردار	۱۴۹
۴.۴ آقا ﷺ کے تاریخی بیانیے میں تخیل کی کارفرمائی	۱۵۵
حوالہ جات	۱۶۵
باب پنجم: آقا ﷺ میں ادبی حربوں کا استعمال: تحقیقی و تنقیدی تجزیہ	۱۶۹
۵.۱ ادبی حربوں کی جانچ پرکھ کے لیے نظری ڈھانچہ	۱۷۰
۵.۱.۱ بلاغت	۱۷۱
۵.۱.۲ کشش انگیزی	۱۷۲
۵.۲ نظری ڈھانچے کے اجزا اور ان کا اطلاق	۱۷۳
۵.۲.۱ ضرورت	۱۷۳
۵.۲.۲ قارئین	۱۷۴
۵.۲.۳ مقصد	۱۷۴
۵.۲.۴ عقلی اصوَل/طرزِ استدلال کا استعمال	۱۷۵
۵.۲.۵ ترتیب	۱۷۸
۵.۲.۶ اسلوب	۱۷۹
۵.۳ ڈکشن	۱۸۰
۵.۴ نحویات	۱۸۵
۵.۴.۱ فعال جملے/طورِ معروف	۱۸۶
۵.۴.۲ غیر فعال جملے/طورِ مجہول	۱۸۷

۵.۴.۳ جملوں میں حروفِ عطف کا تواتر سے استعمال	۱۸۸
۵.۴.۴ غیر معطوف جملے	۱۹۰
۵.۵ ادبی حربے	۱۹۲
۵.۵.۱ امیجری	۱۹۳
۵.۵.۲ تلمیح	۱۹۵
۵.۵.۳ تکرار	۱۹۶
۵.۵.۴ مبالغہ	۲۰۰
۵.۵.۵ تشبیہ	۲۰۲
۵.۵.۶ استعارہ	۲۰۳
۵.۵.۷ خطیبانہ سوالات	۲۰۳
حوالہ جات	۲۰۸
ماحصل	۲۱۷
کتابیات	۲۲۹

باب اوّل

آقا ﷺ: تحقیقی و نظری اساس اور پس منظری مطالعہ

باب اوّل:

آقا ﷺ: تحقیقی و نظری اساس اور پس منظری مطالعہ

اکیسویں صدی عالمگیریت کی صدی ہے، جس نے ساری دنیا کے لوگوں کو ایک ہی معاشرے میں اکٹھا کر کے سرحدی حدود کو ختم کرنے کی جانب اپنا سفر شروع کیا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تیز رفتار ترقی نے جہاں اس صدی کے تعلیم یافتہ روشن خیال طبقے کے ذہن کو نئی معلومات سے آشنا کیا ہے، وہیں اس کے ذہن میں نئے سوالات بھی پیدا کیے ہیں۔ پہلے سے قائم شدہ نظریات وعقائد کی اندھا دھند پیروی کی بجائے ناقابلِ تردید شواہد کی فراہمی پر اصرار کا رجحان بڑھ چکا ہے۔ اس لیے منطق اور استدلال کے ساتھ حقائق کی از سر نو پرکھ کے لیے ادبی تھیوریز کی کارفرمائی سے ادبی تحریروں کا تنقیدی تجزیہ معروضی اور سائنسی انداز میں کیا جا رہا ہے۔ ان جدید فکری مباحث اور معاشرے کے بدلتے ہوئے رجحانات کی وجہ سے دنیا بھر میں ادب کی تفہیم و تجزیے کے بنیادی نظریات و خیالات میں تیزی سے تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں، جس سے ادب کی تعبیر و وضاحت کا ایک نیا رخ سامنے آیا ہے۔ وقت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق سوانح نگاری میں بھی سائنسی اور عقلی، تنقیدی طریقوں کے زیر اثر، نئے مکاتب فکر اور رجحانات و میلانات پروان چڑھے ہیں۔ چناں چہ سوانحی ادب میں نئے اسالیب اور نئی جہتیں متعارف کروائی گئی ہیں۔ سوانحی ادب جو کہ انیسویں صدی تک عظیم انسانوں کی داستان حیات، حکمرانوں کے عروج و زوال اور تاریخ وار حقائق کے بیان تک محدود تھا، بیسویں صدی میں سماجی اور معاشی سطح پر اس کا کینوس وسیع ہوا۔ اب اکیسویں صدی میں بین العلومی رویہ عام ہو چکا ہے۔ جس کے تحت سوانحی ادب میں صرف مادی اور ثقافتی مطالعات کا احاطہ ہی نہیں کیا جاتا بلکہ سائنس کی دیگر شاخوں مثلاً جغرافیہ، سماجیات، معاشیات، نفسیات، علم آثار قدیمہ، علم بشریات، علم لسان وزبان اور جنسیات و نسلیات وغیرہ میں بھی ربط پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی سے سوانح نگاری کی تحقیق کا رجحان تعلیمی میدان میں بڑھ رہا ہے۔[۱] سوانح و سیرت نگاری کے تحقیقی طریقہ کار نہ صرف مؤرخین کے لیے بلکہ ادب، معاشیات اور سیاسیات سمیت دیگر شعبوں میں ہونے والی تحقیق کے لیے بھی بہت اہم ہیں۔ زیر نظر مقالہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس مقالے میں ابدال بیلا کی کتاب آقا ﷺ کو سیرت، سوانح، تاریخ اور ادب کے جدید نظریات کے تحت دیکھا گیا ہے۔ ان نظریات کی تفصیل آئندہ صفحات میں بیان کی گئی ہے۔ ذیل میں آقا ﷺ کتاب اور اس کے مصنف کا تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

کتاب و مصنف کا تعارف:

اس کتاب کے مصنف ابدال بیلا، ۱۴ دسمبر ۱۹۵۶ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام چودھری فضل الدین تھا، جن کا تعلق لدھیانہ شہر سے تھا، بعد میں انہوں نے لاہور ہجرت کی اور وہیں آباد ہو گئے۔ابدال بیلا کی اسکول اور کالج کی تعلیم لاہور ہی میں مکمل ہوئی۔انہوں نے ایم بی بی ایس ڈاکٹر کے طور پر پاکستان کی فوج میں ایک کیپٹن کی حیثیت سے اپنی پیشہ ورانہ زندگی شروع کی۔۲۰۰۷ء میں ڈپٹی ڈائریکٹر آئی ایس پی آر کے طور پر خدمات انجام دیتے ہوئے پاکستان آرمی سے بحیثیت کرنیل سبک دوش ہوئے۔آپ ناول نگار ،افسانہ نگار اور تجزیہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کالم نگار بھی ہیں۔ان کا شمار اچھے فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔ابدال بیلا قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی اور اشفاق احمد کے فکر و فلسفہ سے متاثر ہیں۔آپ کو ۲۰۱۲ء میں بھارت نے ادبی خدمات پر ساحر ایوارڈ اور اسی برس نشان دوستی ایوارڈ سے نوازا۔آپ نے تقریباً تیس سے زائد کتب تصنیف کی ہیں، جن میں سن فلاور، گڈمڈ، عرضی،رنگ پچکاری،سازش،بوندا باندی، کبوتر با کبوتر، ماؤ میو وال، دہلی کی ارجمند بانو، زیر لبی، سورج کے رخ پر، انہونیاں، جادو نگری، مفتی جی، لب بستہ، ککراں ہیٹھ گُلی، تُم، سائیں بگوشا، بین بجاؤ، ندی کنارے، شاہ سائیں، اُرمیلا، لال قلعہ، بٹوارہ ،ٹرین ٹو پاکستان، پاکستان کہانی، بیلا کہانی، ابدالیات ، دروازہ کھلتا ہے، رستہ اور آقاﷺ وغیرہ شامل ہیں۔ان کی تمام کتب سنگ میل پبلی کیشنز سے شائع ہوئی ہیں۔ان کتب میں سات ناول اور سات افسانوی مجموعے ہیں جب کہ ابدالیات میں نظمیہ رنگ کے افسانے ہیں اور کبوتر با کبوتر میں شخصی مضامین شامل ہیں جن کی تعداد ۱۴ ہے۔بین بجاؤ، کالموں کا مجموعہ ہے،دروازہ کھلتا ہے، ناول ہے ۔اس کے علاوہ ممتاز مفتی پر ضخیم کتاب مفتی جی بھی ترتیب دی ۔ ان کی تصنیف آقاﷺ سیرت کی کتاب ہے۔اس کتاب میں ایک سے زیادہ اصناف کے عناصر یکجا نظر آتے ہیں، یوں تو یہ تصنیف سیرت نگاری کا نمونہ ہے، جس میں سید الانبیا حضرت محمد ﷺ کی زندگی، سیرت اور سوانح بیان کی گئی ہے لیکن اس میں سیرت کے روایتی طریقے کی بجائے سوانح نگاری کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔یہ کتاب ۱۱۴۴ صفحات پر مشتمل ہے اور سنگ میل پبلی کیشنز کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔کتاب کا زیادہ حصہ غار حرا میں بیٹھ کر مکمل کیا گیا ہے۔کتاب کا انتساب ''قرآن مجید کے مطابق دنیا کی برگزیدہ ترین مقدس خاتون سیدہ مریم علیہ السلام کے بیٹے عظیم رسول اللہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام، جنہوں نے میرے آقا ﷺ عظیم ترین رسول حضرت محمد ﷺ کے آنے کی بشارت دی'' ہے۔

اس کتاب میں اصول سیرت نگاری ،اصول سوانح نگاری ،تاریخ نویسی اور ادبی نثر کے اصول و ضوابط کا استعمال ملتا ہے۔اس تصنیف کے کثیر الجہت ہونے کی وجہ سے اس کا تحقیقی و تنقیدی تجزیہ بھی کثیر العلومی انداز سے کیا

جا رہا ہے۔اس مقصد کے لیے چار مختلف علوم؛ سیرت، سوانح، تاریخ اور ادب کی تحقیق و تنقید کے نظری پیمانے استعمال کیے گئے ہیں۔ان اصناف کے ادبی اظہار کی جانچ کے لیے ایک ایسا فریم ورک تشکیل دیا جا رہا ہے جس کے تحت آقاﷺ کا تحقیقی و تنقیدی تجزیہ جدید معروضی بنیادوں پر کر کے نتائج کی منطقی پرکھ کے قابل ہوا جا سکے۔ زیرِ نظر مقالے کے تحقیقی مقاصد درج ذیل ہیں۔

۱۔ آقاﷺ میں سیرت نگاری کے روایتی اسلوب کی پیروی اور اس سے انحراف کی صورتیں معلوم کرنا۔

۲۔ جدید اصولِ سوانح نگاری کی روشنی میں آقاﷺ کی ہیئت، ساخت اور بنیادی ڈھانچے کا تنقیدی تجزیہ کرنا۔

۳۔ آقاﷺ میں جدید اصولِ تاریخ نگاری کے استعمال کا مطالعہ و تجزیہ کرنا۔

۴۔ آقاﷺ میں استعمال ہونے والی نثر کے ادبی عناصر کا مطالعہ و تجزیہ کرنا۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے درج ذیل سوالات مرتب کیے گئے ہیں، جن کے دورانِ تحقیق جوابات تلاش کیے جائیں گے۔

۱۔ آقاﷺ میں سیرت نگاری کے روایتی اسلوب کی پیروی اور اس سے انحراف کی کیا صورتیں اختیار کی گئی ہیں؟

۲۔ ہیئت، ساخت اور بنیادی ڈھانچے کے اعتبار سے آقاﷺ کی نوعیت کیا ہے اور اس تصنیف کو جدید سوانح نگاری کی کون سی قسم میں شمار کیا جا سکتا ہے؟

۳۔ آقاﷺ میں تاریخی بیانیے کی کون سی قسم کو کس انداز سے برتا گیا ہے؟ نیز تاریخی واقعات کے بیان میں معروضی حقائق کی موضوعی وضاحت کس طرح کی گئی ہے؟ اور اس بیان میں تخیل کی کارفرمائی کس حد تک نمایاں ہے؟

۴۔ آقاﷺ کے اسلوب میں ادبی حربوں کا استعمال واقعہ نگاری کو کس طرح متاثر کرتا ہے؟

اس مقصد کے لیے ایک فکری ڈھانچہ (Conceptual Frame work) تشکیل دیا گیا ہے، جس کے چار حصے ہیں۔ سیرت، سوانح، تاریخ اور ادب۔ ذیل میں ان چاروں اصناف کا مختصر اً تعارف پیش کر کے ان کے مابین تعلق کی وضاحت کی جا رہی ہے، تاکہ موضوع اور منتخب نظری ڈھانچے کی وضاحت ممکن ہو سکے۔

سیرت نگاری: مفہوم و تعبیر

عربی میں لفظ السیرۃ کا مطلب طریقہ اور حالت ہے۔[۲] اردو میں سیرت سے عادت، طریقہ، طرزِ زندگی، نیکی، خاصیت، حالات و واقعات اور سوانحِ حیات مراد لی جاتی ہے۔[۳] سیرت نگار جب کسی فرد کی داستانِ حیات کی تفصیلات فراہم کرتے ہوئے اخلاقیات پر روشنی ڈالتا ہے تو وہ حصہ سیرت کہلاتا ہے۔ تاہم اصطلاح میں سیرت کا لفظ

نبی ختم المرتبت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی سوانح عمری کے لیے ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ سیرت نگاری کی خاصیت صرف تفریح طبع ہی نہیں بلکہ یہ قاری میں مثالی تبدیلی کی تحریک پیدا کرتی ہے اور فرد کی مجموعی بہتری کے لیے اس کی عملی زندگی کے اسباق کا احاطہ کرتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سیرت نگار اپنی طرف سے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کے سوانحی واقعات میں رد و بدل کا مجاز نہیں ہوتا، لیکن بطور مؤلف، وہ سیرت کے واقعات کا درست انتخاب کر کے بہترین اسلوب میں پیش کرنے میں خود مختار ہوتا ہے۔ سیرت نگاری کے لیے مصنوعی لفاظی کی ضرورت نہیں ہوتی کیوں کہ سیرت کا موضوع اپنی عظمت کے اعتبار سے ہر موضوع سے بلند ترین ہے۔ اس کے لیے مصنف کو حسن بیان، حسن ترتیب اور حسن انتخاب کی ضرورت ہوتی ہے۔[۴] تاریخ اسلام میں بہت سے ایسے تاریخ نگار گزرے ہیں جنھوں نے نبی اکرم ﷺ کی سوانح حیات پر لکھا۔ ۲ ہجری تک سیرت نبویؐ کے لیے لفظ "مغازی" استعمال ہوتا تھا جس میں غزوات نبیؐ کا تفصیلی بیان ہوتا تھا۔ ابن شہاب الزہری نے ۲ ہجری کے بعد سب سے پہلے نبی اکرم حضرت محمد ﷺ کی سوانح حیات کے لیے سیرت کا لفظ استعمال کیا۔ سب سے پہلے باقاعدہ سیرت کے موضوع پر کتاب ابن ہشام نے لکھی۔ ان کا اصل نام ابو محمد عبد الملک بن ہشام بن ایوب حمیری ہے۔ آٹھویں صدی عیسوی میں آپ نے السیرۃ النبویۃ کے نام سے آقائے دو جہان حضرت محمد ﷺ کی حیات مبارکہ پر تفصیلی کتاب لکھی، جسے سیرت کی اولین کتاب کا اعزاز حاصل ہے۔ عربی زبان کے بعد، جو خود صاحب سیرت کی زبان ہے، سیرت کے حوالے سے سب سے زیادہ لٹریچر اردو زبان میں موجود ہے، باوجود اس کے کہ اردو زبان کی تاریخ دو سو سال سے زیادہ پر محیط نہیں ہے۔[۵] اردو سیرت نگاری کی روایت کا آغاز مولود ناموں، معراج ناموں، شمائل ناموں، وفات ناموں اور نور ناموں سے ہوتا ہے۔ ان منظوم سیرت نگاری کے نمونوں میں شعرائے کرام نے نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی حیات مقدسہ کو موضوع بناتے ہوئے آپ ﷺ کی ذات مبارکہ سے اپنی عقیدت کے پہلو کو نمایاں کیا۔ اس دور میں سیرت نگاری پر مصنف کے ذاتی جذبات کا رجحان حاوی تھا۔ اسی لیے سیرت نبیؐ کے علاوہ اولیائے کرام کی سوانح عمریوں میں بھی ان کی زندگی کے حقائق کا کم اور ان کے معجزات و کرامات کا ذکر زیادہ ملتا ہے۔ انیسویں صدی میں جب اسلامی دنیا کو اہل مغرب کی سائنسی افہام و تفہیم کا سامنا کرنا پڑا تو سیاسی، سماجی اور اقتصادی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ ادب نے بھی مغربی فکر کا اثر قبول کرنا شروع کیا۔ اس عرصے میں جو بھی تحقیقات کی گئیں، جو بھی ادب تخلیق ہوا، اس کو مغربی عالمی نظریے کے پیش نظر لکھا گیا۔ دنیا کے دیگر معاشروں کی طرح برصغیر پاک و ہند کے مسلمان دانشور بھی مغربی طرز فکر کو اپنانے اور پوری اسلامی تہذیب کی وضاحت اسی نقطہ نظر سے کرنے پر آمادہ ہوئے۔ اس دور میں ہندوستان پر برطانوی راج تھا، انگریزوں کی تخلیقات اور ایجادات ہندوستانی عوام کے اذہان کو بہت زیادہ متاثر کر رہی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ اردو نثر نگاروں نے مغربی اصناف کو اردو میں متعارف کروا کے اردو نثر کا دامن بہت جلد وسیع

کر لیا۔ ہر چند کہ کچھ تحقیقی تصانیف ایسی بھی تھیں جن میں مغربی اصولوں کو بالکل روا نہیں رکھا گیا، تاہم زیادہ تر تحقیقی کام ایسے تھے جو جدید سائنسی انداز فکر کے تحت انجام پائے تھے۔ کچھ تحقیقی کام مغربی مستشرقین کی تصانیف کے رد عمل کے طور پر سامنے آئے۔ اس حوالے سے سر سید احمد خان (۱۸۹۸ء-۱۸۱۷ء) کا نام کسی طور پر بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ تحریک سر سید کے زیر اثر جہاں نثری ادب میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں وہاں سوانح و سیرت نگاری کی صنف نے بھی بہت ترقی کی۔ اردو سیرت نگاری کا باقاعدہ آغاز سر سید احمد خان کی تصنیف الخطبات الاحمدیہ سے ہوتا ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ A Series of Essays on the Life of Mohammad and Subjects Subsidiary Thereto in 1870 کے نام سے لندن سے ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔ یہ کتاب در اصل انگریز مصنف ولیم میور کی تصنیف (۱۸۶۱ء) *The Life of Mahomet* (جس میں حضرت محمدؐ اور اسلام کے بارے میں نفرت آمیز انداز اختیار کیا گیا تھا) کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ سر سید کی یہ تصنیف بارہ خطبات اور ایک دیباچے پر مشتمل ہے۔ سر سید سیرت نگاری میں تحقیقی اسلوب کے بانی ہیں۔ ان کے بعد مولانا شبلی نعمانی نے اردو سیرت نگاری کا باقاعدہ آغاز کیا۔ ان کی کتاب سیرۃ النبی منظر عام پر آئی جس کی دو جلدیں شبلی کے ہاتھ سے پایہ تکمیل کو پہنچیں، جب کہ باقی کی جلدیں ان کے شاگرد سید سلیمان ندوی نے مکمل کر کے شائع کروائیں۔ اس کے بعد تو جیسے ایک پورا سلسلہ چل نکلا اور بہت سے سیرت نگاروں نے سیرت نگاری کی روایت کو تسلسل کے ساتھ آگے بڑھایا۔

سوانح نگاری: عمومی مباحث:

ویبسٹرز ڈکشنری (Webster,s Dictionary) میں سوانح عمری کی تعریف کچھ اس طرح کی گئی ہے:

Biography is "the written history of a person life".[۶]

کارلائل کی رائے میں سوانح عمری ایک انسان کی حیات ہے۔[۷] اچھی اور عمدہ سوانح عمری ہماری بصیرت کے ساتھ ساتھ ہماری روح کی بھی ترجمان ہوتی ہے۔ سوانح نگار تاریخ پر روشنی ڈالتا ہے اور مثالوں کے ذریعے ارد گرد کی دنیا کو متاثر کرتا ہے۔ قارئین کے خیالات و تصورات، زندگی کے ممکنات کو جلا بخشتا ہے۔ اچھی سوانح عمری قارئین کے لیے عمر بھر کا نمونہ فراہم کرتی ہے، تاکہ یہ دیکھا جائے کہ کیسے کوئی اپنی زندگی میں پیش آنے والی مہمات کو سر کرتا ہے۔ ایک اچھا سوانح نگار وہ ہوتا ہے جو اپنے مشاہدہ کی قوت کا صحیح معنوں میں استعمال کر کے واقعات کو ترتیب دے اور اپنی تحریر میں زندگی کی زندہ تصویر پیش کرے۔ معروف سوانح نگار لیئن ایڈل (Leon Edel) اپنی تصنیف

Writing Lives : Principia Biographica میں لکھتے ہیں کہ :

Biographers write lives.[۸]

یہ اتنا سیدھا سادہ بیانیہ نہیں۔ کسی کی زندگی کو ضابطہ ء تحریر میں لانا عام سوانح سے کہیں زیادہ وسیع تر مفہوم کا حامل ہے۔ سوانح نگار کو انتہائی احتیاط کے ساتھ دستیاب معلومات کی مدد سے ممکنات کا سراغ لگا کر صاحب سوانح کی زندگی کی کہانی بیان کرنا ہوتی ہے۔ اس تخلیقی عمل میں اس بات کا خاص طور سے دھیان رکھنا ہوتا ہے کہ وہ اپنے تخیل کی پرواز کو اس حد تک بلندی پہ نہ لے جائے کہ دیانت داری اور سچائی کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ سید شاہ علی سید نے اپنی تصنیف میں کہا ہے کہ "سوانح نگار واقعہ نگار ہے، صاف گوئی اس کی تحریر کا نمک ہے، اسے موضوع کی زندگی کے روشن اور تاریک پہلوؤں سے بحث نہیں، اس کا کام ایماندارانہ اور سچی مرقع کشی ہے۔"[۹]

بیسویں صدی کے ربع آخر میں سوانح نگاری پر نفسیات کے اصولوں کے اطلاق نے اس صنف کو ایک نئی جہت سے روشناس کروایا ہے اور ایک عام سوانح عمری کو باضابطہ اور سائنٹیفک بایو گرافی میں تبدیل کر دیا ہے۔ تحلیل نفسی کے طریقوں سے فرد کے قول و فعل کی بنیاد پر اس کی باطنی خصوصیات کا سراغ لگایا جاتا ہے۔ اب قدیم انداز کی طرح سوانح کا مقصد کسی فرد کے کارنامے بیان کرنا ہی نہیں بلکہ صداقت اور خلوص کے ساتھ شخصیت کے ظاہری اور باطنی دونوں پہلوؤں کی ترجمانی کرنا سوانح کا اولین مقصد ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں ناول اور افسانہ سے زیادہ سوانحی ادب کے مطالعے میں دلچسپی کے امکانات بڑھ گئے ہیں۔ اب سوانح عمری میں حالات و واقعات کے اسباب و علل کے جائزے کے ساتھ ساتھ سیرت کے پہلوؤں کو بھی پرکھا جاتا ہے اور باطنی حقیقت تلاش کی جاتی ہے۔[۱۰] سوانح نگار کے لیے ضروری ہے کہ اس کی تحریر میں اس کے ذاتی نظریات کی بے جا مداخلت نہ ہو۔ اس کا کام حقائق کو من و عن صداقت کے ساتھ قاری تک پہنچانا ہے۔ قاری اس شخصیت کے بارے میں کیا رائے قائم کرتا ہے یہ اس کا اپنا فیصلہ ہے۔ سوانح عمریاں عام طور پر قارئین میں عزم اور حوصلہ پیدا کرتی ہیں، لیکن اگر مصنف صاحب سوانح کو فوق البشر دکھانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگائے تو یہ اس کی سوانح عمری کا عیب تصور ہو گا کیوں کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ بزرگوں کی خطاؤں میں بھی قارئین کے لیے سیکھنے کا عنصر ہوتا ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ صاحب سوانح کو پیکر بشریت میں ہی دکھایا جائے۔[۱۱]

سیرت اور سوانح نگاری میں تعلق :

اکثر ناقدین قائل ہیں کہ سیرت کی اصطلاح سوانح عمری سے مختلف ہے، کیوں کہ سوانح کسی فرد کی زندگی کی وہ دستاویز ہے، جس میں اس کی زندگی کے ہر پہلو کو نمایاں کیا جاتا ہے، جبکہ سیرت کا موضوع ایک ایسی شخصیت کا احاطہ کرتا ہے جو غیر معمولی ہونے کے ساتھ ہر خطا سے پاک ہے۔ آج کل سیرت و سوانح کو انگریزی لفظ "لائف" کے

مترادف قرار دیا جاتا ہے جب کہ سیرت کے اپنے معنی "طریقہ" اور "مسلک" کے ہیں۔اسی فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے سیرت نگاروں نے آپ ﷺ کی سوانح عمری کے لیے "حیات" کی بجائے "سیرت" کا لفظ استعمال کیا، کیوں کہ سیرت میں طرز عمل، کردار و عادات اور اخلاق وغیرہ شامل ہوتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ ﷺ کی حیات مبارکہ کا سب سے اہم پہلو آپ ﷺ کی رسالت ہے، جسے کسی صورت بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔یہی وجہ ہے کہ سیرت نگاری میں صرف چند تاریخی واقعات اور سوانح حیات ہی نہیں آئیں گے بلکہ پورے قرآن کا احاطہ ہو جائے گا۔ان سب تعلیمات کا ذکر ہو گا جن کی تعلیم آپ ﷺ نے فرمائی۔رسالت کے وصف کی بنا پر سیرت عام سوانح سے برتر ہے۔[۱۲] ڈاکٹر سید عبداللہ بھی سیرت کو بایو گرافی سے برتر قرار دیتے ہیں۔ان کے نزدیک یہ ارفع و اشرف تشکیلی عمل ہے۔اسے محض سوانح عمری سمجھنا غلط ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب یہ بھی مانتے ہیں کہ سیرت نگاری کا فن سوانح عمری کے اصولوں سے مستثنیٰ نہیں ہے۔[۱۳] سوانح حیات کی طرح سیرت نگاری میں بھی صرف سیرت و اخلاق کا مطالعہ ہی نہیں کیا جاتا بلکہ پورے ضابطہ اخلاق کا تفصیلی جائزہ لیا جاتا ہے۔سیرت نگاری اور سوانح نگاری کی مشترک خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے شبلی نعمانی مقدمہ سیرت النبیؐ جلد اوّل میں سیرت اور بایو گرافی کو مترادف قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کا علوم و فنون میں ایک خاص درجہ ہے۔ہر انسان کے حالات زندگی عبرت اور حقیقت شناسی کے لیے دلیل راہ ہیں۔[۱۴] نعیم صدیقی اپنی تصنیف محسن انسانیت میں سیرت کو عام سوانح عمری سے الگ گردانتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ کی سیرت ایک فرد کی سوانح نہیں ہے بلکہ وہ ایک عظیم ترین تہذیبی تحریک کی آئینہ دار اور ایک تاریخی طاقت ہے۔اسی کے واسطے سے ہم قرآن کا ترجمہ عمل کی زبان میں پڑھ سکتے ہیں اور اسی کی روشنی میں ہم اجتماعی انقلاب کی کٹھن راہوں کو طے کر سکتے ہیں، جن سے ہو کر انسانیت اسلامی نظام کی جنت تک پہنچ سکتی ہے۔[۱۵]

ڈاکٹر صلاح الدین ثانی پانچ نکات میں سیرت اور سوانح میں فرق گنواتے ہیں۔

۱۔ پہلا فرق یہ ہے کہ سیرت، حیاتِ انسانی کے ایک ایسے مثالی نمونے کو موضوع بناتی ہے، جو ہر خطا و تقصیر سے پاک ہے، جب کہ سوانح میں ان خوبیوں کا ہونا ضروری نہیں۔

۲۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ سیرت میں تقدس ہے، غور و خوض ہے، جب کہ سوانح میں اس عنصر کا ہونا ضروری نہیں۔

۳۔ تیسرا فرق یہ ہے کہ سوانح میں واقعہ کی صداقت صرف روایت یا سماعت کی بنیاد پر ہوتی ہے جب کہ سیرت میں واقعہ کی صداقت روایت و درایت (حدیث کے اصول تنقید) کی بنیاد پر کی جاتی ہے، اس لحاظ سے سیرت، سوانح سے زیادہ مستند ہے۔

۴۔ سوانح تصویر کشی، تخیل و قیاس کی بنیاد پر ہوتی ہے جب کہ سیرت میں اس کی گنجائش ہی نہیں، بلکہ دروغ گوئی کے زمرہ میں ہونے کے سبب حرام ہے۔

۵۔ سوانح میں خوبیاں اور خامیاں دونوں بیان کی جاتی ہیں جب کہ سیرت کے بارے میں ہمارا عقیدہ ہے کہ نبی کریم ﷺ

خامیوں سے پاک ہیں اور معصوم ہیں، للہذا آپ کی خامیاں نکالنا گستاخی اور گناہ ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں مستشرقین دھوکہ کھا گئے ہیں اور عام بشر و نبی میں فرق قائم نہیں رکھ سکے ہیں اور ہرزہ سرائی کے مرتکب ہوئے ہیں۔[۱۶]

تاریخ نگاری کے منہج:

انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کے مطابق تاریخ نگاری کی تعریف کچھ یوں کی گئی ہے:

> The writing of history, especially the writing of history based on the critical examination of sources, the selection of particular details from the authentic materials in those sources, and the synthesis of those details into a narrative that stands the test of critical examination. The term historiography also refers to the theory and history of historical writing.[۱۷]

گذرے ہوئے واقعات کا صحت اور محنت کے ساتھ بیان تاریخ کہلاتا ہے۔ پروفیسر ایم نذیر احمد تشنہ اپنی کتاب فلسفہ تاریخ میں لفظ "تاریخ" کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

> یونانی زبان میں اس کے لیے ہسٹوریا (Historia) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ جس کے معنی ہیں سچائی کو بروئے کار لانے کا منصوبہ اور انگریزی زبان کا لفظ ہسٹری(History)، اِس یونانی لفظ(Historia) ہسٹوریا سے ماخوذ ہے جس سے مراد واقعے کی ابتدائی تفتیش اور تحقیق کی بنیاد پر حاصل ہونے والا علم ہے۔[۱۸]

جو واقعہ ماضی کا حصہ بن جائے، اُس تک پہنچنے کے لیے تحقیق اور تدقیق کا بیان تاریخ ہے۔ تاریخ ہر انسان کی زندگی کا اہم تہذیبی عنصر ہے، کیوں کہ انسان کی زندگی کو وقت کے ساتھ ساتھ ایک سمت متعین کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ ماضی کو سامنے رکھ کر ہی متعین کی جا سکتی ہے۔ جب ماضی کو بیان کیا جاتا ہے تو یہ "بیانیہ" ماضی کو تاریخ میں بدل دیتا ہے، جس میں گزشتہ کے تجربات اور آئندہ کی توقعات یکجا ہو جاتی ہیں۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ "تاریخ" ماضی اُس وقت بنتی ہے جب حال اور مستقبل گھمن گھیر کھاتے کھاتے لمحہ بہ لمحہ ماضی کی تہ میں اُتر جائیں۔ یوں اس طرح کے واقعات کا بیان تاریخ نویسی کہلاتا ہے۔[۱۹] دراصل مؤرخین کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی قوتِ ادراک سے یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ماضی میں حقیقتاً کیا ہوا؟ آسان الفاظ میں تاریخ کو ان الفاظ میں سمجھا جا سکتا ہے:

> History is time which has gained sense and meaning. History is meaningful and sense-bearing time. It

combines past, present and future in a way that human beings can live in the tense intersection of remembered past and expected future. History is a process of reflecting the time order of human life, grounded on experience and moved by outlooks on the future.[20]

تاریخ نگاری نسبتاً ایک ایسا فن ہے جس میں مؤرخ، انسانی سر گرمیوں کو قلم بند کرنے اور ان سے صحیح نتائج اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ انسانی تجربہ کے مطالعہ کو ایک ناگزیر اور فطری عمل قراد دینے اور تاریخ کو سائنٹفک نقطہ نظر سے جانچنے کے تصور نے اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کی ابتدا میں فروغ پایا۔ اٹھارہویں صدی سے قبل کی تہذیب میں بھی تاریخ نگاری کو اہم مقام حاصل نہ تھا۔ وہ نہ تو باقاعدہ تعلیم کا جزو سمجھی جاتی تھی اور نہ بحیثیت مجموعی انسانی زندگی کی تشریح و تفسیر اس کا منشا تھا۔ یہ کام مذہب، فلسفہ، ڈراما اور شاعری کی حدود میں آتے تھے۔ ارسطو اپنی تصنیف بوطیقا میں تاریخ کو حقارتاً محض اس لیے ناقابل اعتنا قرار دیتے ہیں کہ اس میں صرف مخصوص واقعات ہی کا ذکر ہوتا ہے اور ڈرامے کی طرح ایک مربوط پلاٹ کے ذریعہ کسی صداقت کا اظہار نہیں کیا جاتا۔[21]

ارسطو کہتے ہیں کہ شاعری اپنی خصوصیات میں تاریخ نگاری کی نسبت فلسفیانہ اور زیادہ اہمیت کی حامل ہے، کیوں کہ شاعری کو "عمومی" تصور کیا جاتا ہے جب کہ تاریخ نگاری کو خاص علم۔ اسی عمومیت کے ساتھ لوگ شاعری کو اعلیٰ معیار کی حیثیت سے دیکھتے ہیں، کیوں کہ شاعری عام چیز کو خاص بنا کے بیان کرتی ہے۔ اس حوالے سے ان کا کہنا ہے کہ:

Poetry is more philosophic and of greater importance than historiography, because poetry treats of the general and historiography of the particular. The general consists of describing the things which people regard as of high quality, and do so because it is reasonable and necessary; poetry occupies itself with the general and supplies it with the particular.

The particular concentrates on reporting what Alcibiades did or experienced.[۲۲]

لیکن اب عقلیت پسندی کے جدید رجحان کی بدولت تاریخ کے علم نے بھی عقلی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ تاریخ عام طور پر سائنس کے دائرہ کار میں آتی ہے۔ سائنس کے دوسرے علوم کی طرح یہ بھی معلوم سے نامعلوم کی طرف سفر کرتی ہے۔ تاریخ کا نقطہ نظر دوطرفہ ہے، اس کا بنیادی کام دستیاب شواہد کی مدد سے ماضی کے واقعات اور ان کے امکانات پر سوالات اٹھانا ہے، جب کہ اس کا دوسرا کام ان سوالات کے جوابات ان ہی شواہد کی روشنی میں ڈھونڈ نکالنا ہے۔ تاریخ نہ صرف ماضی کے واقعات کو جانچنے کا علم ہے، بلکہ ان اسباب کا کھوج لگانا بھی تاریخ کے زمرے میں ہی آتا ہے کہ یہ واقعات کیوں رونما ہوئے؟ تاریخ کا سائنسی پہلو ان اسباب و وجوہات کی تحقیق میں مضمر ہے جو کسی بھی انسانی فعل کا محرک قرار پاتے ہیں۔ تاریخ کے اسی سائنسی مطالعے کو تاریخ نگاری کہا جاتا ہے، گویا یہ ماضی کے ان واقعات کا شعور ہے جو تاریخ نگار مناسب تحقیق کے بعد پیش کرتا ہے۔ تاریخ نگاری میں انسانی شخصیات اور زمان و مکان کی جزئیات تفصیل سے بیان کی جاتی ہیں۔ اس کے لیے مخصوص اصول تاریخ نگاری کا لحاظ رکھنا ضروری تصور کیا جاتا ہے۔ تاریخ نگار محنت اور تن دہی سے دستیاب مواد کی جانچ کے بعد مخصوص حقائق کا انتخاب کرتا ہے اور منتخب شدہ حقائق کو مناسب ترکیب و ترتیب سے منظر عام پر لاتا ہے۔ عمدہ تاریخ نگاری میں محتاط انداز میں تجزیاتی طور پر نہایت محنت اور عرق ریزی سے ادبی پیرائے میں حقائق کی نقاب کشائی کرنا ہوتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تاریخ نگار کو جو بھی حقائق ملے ہیں، ان کو یکجا کرے، ترتیب دے، ان کی جانچ کرے۔ ان کی اہمیت کا جائزہ لے اور معتدل تناسب سے انہیں بیان کر دے۔ ان تمام مراحل میں اس بات کا خصوصی دھیان رہے کہ وہ حقیقت سے چشم پوشی اختیار نہ کرے۔ اس سلسلے میں علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ:

> اگر سچی بات کہنے کے لیے مؤرخ کو مذہب بھی قربان کرنا پڑے تو اسے جھجکنا نہیں چاہیے۔ اسلامی مؤرخ طرف داری سے الگ رہتا ہے، وہ واقعات کی غیر جانبدارانی تلاش میں اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ اس کا اثر اس کے مذہب، اعتقادات اور قومیت پر بھی پڑے گا یا نہیں۔[۲۳]

تاریخی عمل کا ڈھانچہ تاریخی مطالعات کو ایک الگ علمی شعبے کی حیثیت سے بیان کرتا ہے۔ تاریخ کو اگر واقعی الگ شعبے کی حیثیت دی جائے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اصولوں میں مندرجہ ذیل خصوصیات پائی جائیں۔

۱۔ تاریخی علم میں توجہ اور وزن پیدا کرنے کے لیے لوگوں کی ضروریات ان امور کی طرف راغب کرنے کی ضرورت ہے جو تاریخی سوچ کے لیے فیصلہ کن ہیں۔

۲۔ انسانی ماضی کے بارے میں غالب نقطہ نظر، تاریخ کو حال اور مستقبل سے مکمل ہم آہنگ کرنا ہے۔

۳۔ یہ وہ اصول ہیں جو تاریخی طریقہ کار کو سائنسی و تجراتی تحقیق کے اصولوں کے طور پر متعارف کرواتے ہیں۔

۴۔ یہ اصول تاریخ نگاری کی ان تمام اقسام کے بارے میں ہیں، جن کی روشنی میں تحقیق کے ذریعے سے تاریخی علم حاصل ہوتا ہے۔

یہ تاریخ نگاری کے عمل کے دوران، موجودہ دور کی ثقافت فراہم کرنے والے اصول ہیں، جو کہ وقت کے ساتھ ساتھ لوگوں کی زندگیوں کو اصل سمت عطا کرتے ہیں۔ [۲۴]

سیرت وسوانح اور تاریخ نگاری میں تعلق:

اسلامی علوم میں سیرت کو ایک نیم تاریخی صنف قرار دیا جاتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کا فنِ تاریخ، فنِ سیرت نگاری سے متاثر ہوا۔[24] مسلمانوں کا خصوصی اعزاز ہے کہ انہوں نے اپنے نبی پاک ﷺ کی حیات مبارکہ کا تحقیقی مطالعہ کرنے کے لیے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں زندگیوں کا مطالعہ کیا ہے۔کوئی بھی دوسری قوم بالخصوص مذہبی طبقہ اس حوالے سے مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا، کیوں کہ انہوں نے تاریخی تحقیق میں تحقیقی منہاج کے نئے ضوابط قائم کیے، جسے انہوں نے اسماالرجال کا نام دیا۔ یہ وہ علم ہے جس میں حضور اکرم ﷺ کی احادیث کے راویوں کے نام، حسب و نسب، قوم و وطن اور علم و فضل وغیرہ کا بیان ہوتا ہے۔ اس علم کے ذریعے آنحضرت ﷺ کی ذات مقدسہ کے بارے میں روایات بیان کرنے والے راویوں کی شہادت کی صحت و سقم کا پتہ لگایا جاتا ہے۔اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کس قدر محنت اور عرق ریزی سے حیات نبوی ﷺ پر دستیاب مواد کو مستند بنا کر عوام کے سامنے پیش کرنے کی سعی کی گئی۔بقول ڈاکٹر حمید اللہ:

> یہ امر قابل ذکر ہے کہ آنحضور ﷺ کی حیات مبارکہ میں دائرہ اسلام میں داخل ہونے والے بے شمار صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنھم میں سے ایک لاکھ سے زائد نے اپنے معلم و مدرس کی حیات طیبہ کے بارے میں کم از کم ایک ایک حقیقت آنے والی نسلوں تک ضرور پہنچائی۔فرد واحد کی زندگی کے بارے میں اس قدر زیادہ تعداد میں قریبی ذرائع اور عینی گواہ کہ جن کی روایات ہم تک پہنچی ہیں آپ ﷺ سے پہلے بھی ایسی مثال نہیں ملتی اور حتیٰ کہ آپ ﷺ کے بعد بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کبھی بھی ایسی مثال نہیں ملے گی۔ [۲۵]

نبی کریم ﷺ کی حیات مقدسہ کے علاوہ کسی اور نبی کی سوانح حیات کو اس قدر اہتمام سے محفوظ نہیں رکھا جا سکا۔غیر مسلم نقاد و محققین بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں۔ایک مستشرق ایف،ای، پیٹرس (F.E.Peters) اپنے ایک مضمون "The Quest of the Historical Muhammad (PBUH)" میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور نبی آخرالزمان ﷺ کی مقدس سوانح کے تاریخی استناد کا موازنہ

کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کے حالات کے بارے میں مستند اور تفصیلی معلومات میسر نہیں۔ عیسائی مذہبی مؤرخین نے جو کچھ ان کے بارے میں بتایا، اس کو ایسے ہی مان لیا گیا لیکن حضرت عیسیٰؑ کے برعکس حضرت محمد ﷺ کی ذات پر مستند مواد کافی تعداد میں موجود ہے۔ اس لیے حضرت عیسیٰؑ کی نسبت نبی پاک ﷺ کی حیاتِ مبارکہ تصنیف کرنے والے سیرت نگاروں کے پاس صداقت جانچنے کے معتبر ذرائع موجود ہیں۔ [۲۶]

سیرت و سوانح نگاری در حقیقت تاریخ ہی ہے۔ سیرت نگار تاریخ لکھتے ہیں مگر اپنے عہد کو بھی متاثر کرتے ہیں، اسی طرح سوانح عمری تاریخ کی ایک ایسی شکل ہے، جو انسانی نسلوں اور گروہوں سے نہیں بلکہ افراد سے متعلق ہے۔[27] ایک بنیادی فرق جو عام تاریخ نگاری اور سیرت میں پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ سیرت کے مآخذ و مصادر اعتبار کے قابل ہوتے ہیں جب کہ عام تاریخ معتبر نہیں ہوتی کیوں کہ تاریخ میں قیاس سے کام لیا جاتا ہے۔ تاریخ نگار بذات خود اس زمانہ، جس کی وہ تاریخ بیان کر رہا ہوتا ہے، سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، جب کہ سیرت میں قیاس کا عمل دخل اصول سیرت کے منافی سمجھا جاتا ہے کیوں کہ سیرت کی اکثر روایات کے خود صحابہ کرام گواہ ہیں۔ جس طرح کی بھی روایات سیرت نگار کو حاصل ہوتی ہیں، وہ ان کو من و عن پیش کرنے کا پابند ہوتا ہے۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ وہ ان روایات کی چھان پھٹک میں کس قدر جانفشانی کا مظاہرہ کرتا ہے۔[۲۸] مناظر احسن گیلانی اپنی تصنیف میں سیرت اور تاریخ کے مابین فرق بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے پاس اس وقت تاریخ کے جو عام ذخیرے ہیں ان کا تعلق کسی قوم کی حکومت، کسی عظیم الشان جنگ، الغرض اس قسم کی منتشر اور پراگندہ چیزوں سے ہے جن کا احاطہ آسان نہیں ہے بر خلاف اس کے سیرت و حدیث اس تاریخ کا نام ہے جس کا تعلق براہ راست ایک خاص شخصی وجود یعنی کہ سرور کائنات ﷺ کی ذات اقدس سے ہے۔ ایک قوم، ایک ملک، ایک حکومت، ایک جنگ کے تمام اطراف و جوانب کو صحیح طور سے سمیٹ کر بیان کرنا ایک طرف ہے اور دوسری طرف ملک نہیں، ملک کی کوئی خاص قوم نہیں، کسی قوم کا کوئی قبیلہ نہیں، کسی قوم کا کوئی خانوادہ نہیں بلکہ ایک واحد بسیط شخص کی زندگی کے واقعات کا بیان کرنا ہے، خود اندازہ کیجیے کہ احاطہ و تدوین کے اعتبار سے دونوں کی آسانی و دشواری میں کوئی نسبت ہے؟ پہلی صورت میں کوتاہیوں، غلط فہمیوں اور غلطیوں کے جتنے قوی اندیشے ہیں یقیناً اسی نسبت سے دوسری صورت میں صحت و واقعیت کی اسی قدر عقلاً توقع کی جا سکتی ہے۔[۲۹]

یہی وجہ ہے کہ سیرت نگاری کے واقعات و حقائق کے بیان میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے تاریخی واقعات کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے دو ذرائع بتائے ہیں۔

ا۔ روایت:

جو بھی واقعہ بیان کیا جائے، اسی شخص کی وساطت سے بیان کیا جائے جس کا خود بیان کیے جانے والے واقعہ سے تعلق ہو اور اس سے لے کر آخری راوی تک روایت کا سلسلہ متصل ہو اور اس کے ساتھ تمام راویوں کے بارے میں یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ صحیح الروایت اور باضابطہ تھے یا نہیں؟ [۳۰]

۲۔ درایت:

عقلی اصولوں سے واقعہ کی تنقید کی جائے۔ [۳۱]

شبلی نے مؤرخ کے لیے صحتِ واقعہ میں روایت کے پہلو بہ پہلو درایت سے کام لینا بھی ضروری قرار دیا ہے، بلکہ اپنے تمام اصولِ تاریخ نویسی میں سب سے زیادہ زور اسی پر دیا ہے۔ سیرت وسوانح نگاری میں واقعات کی تحقیق وتنقید کے لیے روایت و درایت میں توازن قائم کرنے کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ علامہ صاحب اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ تاریخی واقعات کی کھوج میں اصول درایت سے بہت حد تک مدد مل سکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ درایت کو مستقل فن کا درجہ دیتے ہیں، ان کے خیال میں درایت کے درج ذیل اصول و قواعد تاریخی واقعات کی وضاحت و تعبیر میں مدد آور ثابت ہو سکتے ہیں۔

ا۔ واقعہ مذکورہ اصول، عادت کی رو سے ممکن ہے یا نہیں؟

۲۔ اس زمانے میں لوگوں کا میلان عام واقعہ کے مخالف تھا یا موافق؟

۳۔ واقعہ اگر کسی حد تک غیر معمولی ہے تو اس نسبت سے ثبوت کی شہادت زیادہ قوی ہے یا نہیں؟

۴۔ اس امر کی تفتیش کہ راوی جس چیز کو واقعہ ظاہر کرتا ہے اس میں اس کے قیاس ورائے کا کس قدر حصہ شامل ہے؟

۵۔ راوی نے واقعہ کو جس صورت میں ظاہر کیا ہے، وہ واقعہ کی پوری تصویر ہے یا اس امر کا احتمال ہے کہ راوی اس کے ہر پہلو پر نظر نہیں ڈال سکا اور واقعہ کی تمام خصوصیتیں نظر میں نہ آسکیں۔

۶۔ اس بات کا اندازہ کہ زمانے کے امتداد اور مختلف راویوں کے طریقہ ادا نے روایت میں کیا کیا اور کس قسم کے تغیرات پیدا کر دیے ہیں۔ [۳۲]

ادبی اظہار کے قرینے:

انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کے مطابق ادب کی تعریف یہ ہے:

Literature, a body of written works. The name has

> traditionally been applied to those imaginative works of poetry and prose distinguished by the intentions of their authors and the perceived aesthetic excellence of their execution.[۳۳]

تحریری کام کے مجموعے کو ادب کہا جاتا ہے لیکن صرف وہ تحریر جس میں زندہ رہنے کی سکت ہو۔ادب میں زندہ رہنے کی قابلیت ہوتی ہے۔وہ الفاظ جو محفوظ نہ رہ سکیں، وہ ادب نہیں۔ لفظ ادب خاص طور پر ایسی تحریروں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جن کو فن کا درجہ دیا جا سکے اور جو قارئین کے جمالیاتی ذوق کو جلا بخشیں۔ادب کے لیے ضروری ہے کہ اس میں افکار و نظریات، خیالات و جذبات اور مشاہدات و تجربات کو اس طرح سے بیان کیا جائے کہ سننے والے میں مسرت کا احساس پیدا ہو۔ادب معاشرے کا آئینہ ہوتا ہے۔روزمرہ زندگی میں جس صلاحیت اور اہلیت کی ضرورت ہوتی ہے، ادب اسے فراہم کرتا ہے اور اس میں اضافہ کرتا ہے۔دراصل ادب وہی ہے جسے ہم اپنے معاشرے میں دیکھتے ہیں، محسوس کرتے ہیں، مشاہدہ کرتے ہیں اور مختلف اصناف کے ذریعے احاطہء تحریر میں لے آتے ہیں۔ معروف ادبی نقاد جے لانگ (J Long) کا کہنا ہے کہ:

> Behind every book is a man; behind the man is the race; and behind the race are the natural and social environments whose influence is consciously reflected.[۳۴]

عام طور پر مفکرین ادب کو ذہنی عمل کے ذریعے تخلیق کردہ ایک ممکنہ دنیا گردانتے ہیں۔روایتی طور پر ادب کو جمالیاتی انداز میں معلومات منتقل کرنے کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا ہے، کیوں کہ ادب کا تعلق براہ راست سائنس کی بجائے جمالیات سے ہے۔پہلے سے موجود حقائق کی من و عن نمائندگی کا نام ادب نہیں بلکہ ادب میں تخلیقی عمل، ایک تخیلاتی فن ہے۔

جمالیاتی اظہار بذاتِ خود علم کی ہی ایک صورت ہے۔بقول عابد علی عابد:

> یہ وہ علم ہے جو عقلِ استدلالی کی فعالیت سے مقدم ہوتا ہے۔انسان کلیات کی تشکیل سے پہلے تخیلی تصورات تخلیق کرتا رہتا ہے۔ تفکر کی منزل سے پہلے ادراک کرتا ہے۔زبان کی تنظیم سے پہلے گیت گاتا رہا ہے۔ذہن کے دائرے میں کوئی ایسی چیز نہیں جو حواس کے دائرے میں نہ آ چکی ہو۔[۳۵]

عربی کا یہ شعر فنکار کے اسی تخیلاتی و وجدانی فن کی طرف اشارہ کرتا ہے:

ان الكلام لفی الفؤاد وانما
جعل اللسان علی الفؤاد دلیلاً [۳۶]

" کلام تو اصلاً دل (دماغ) میں ہوتا ہے اور زبان تو محض اس
دل (دماغ) کی ترجمان ہے۔"

ادیب کے جمالیاتی تجربے میں الفاظ اور معنی اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ ان کی الگ پہچان تقریباً ناممکن ہو جاتی ہے۔ کوئی بھی فنکار اپنی وجدانی کیفیت کو اگر دنیا کے سامنے آشکار کرنے میں کامیاب ہو جائے تو دوسرے لوگ بھی اس کے تجربے کو محسوس کر سکتے ہیں۔ گویا فنکار کی وجدانی کیفیت اوروں تک منتقل ہو جاتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ادب کے ذریعے ہمارے لیے ایک دوسرے کو سمجھنا اور رابطے پیدا کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔

سیرت وسوانح میں ادبی پیرایہ اظہار اور اس کے نتائج:

ادب میں اگرچہ حقیقت نگاری تو ہوتی ہے لیکن حقیقی دنیا کی نقاشی کا کام نہیں ہوتا۔ ادب میں جب کہیں حقیقت کی تصویر کشی کی جائے تو بھی یہ گمان یا ظن کی ذیل میں آتی ہے۔ خاص طور پر جب سیرت وسوانح یا تاریخ میں حقیقت نگاری کی جائے تو مکمل حقائق دستیاب نہ ہونے کی صورت میں یہ اور بھی مشکوک ہو جاتی ہے، جیسا کہ علامہ شبلی نعمانی کا کہنا ہے کہ تاریخ اور انشاپردازی کی حدیں جدا جدا ہیں۔[۳۷] شاید یہی وجہ ہے کہ بہت سے ناقدین تاریخ نویسی کو ادب سے الگ گردانتے ہیں۔ ان کے خیال میں چونکہ تاریخ نگاری میں حقیقت نگاری ہوتی ہے اس لیے یہ چیز تاریخ نگار کو ادیب سے ممتاز کرتی ہے۔ ادیب اس ذمہ داری سے آزاد ہوتا ہے لیکن ادبی تھیوریز کے جدید مباحث اس فرق کو قبول کرنے سے انکاری ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت سی ادبی تحریریں ایسی ہیں جو اپنے اندر تاریخ کے عناصر رکھتی ہیں، چونکہ تاریخ نگار کے لیے بھی ادب کا سہارا لینا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اسی لیے ادبی تحریر میں تخیل کی کارفرمائی سے انکار ممکن نہیں۔

> مؤرخ جب محض واقعات بیان کرتا ہے تو کچھ واقعات حذف کر دینے سے وہ ایک ایسی صورت پیدا کرتا ہے کہ اس کی اپنی رائے، جو تخیل میں سموئی ہوئی ہوتی ہے، آپ کے سامنے ہوتی ہے،۔۔۔۔ادبی فنکار لازماً عالمانہ شان رکھتا ہے۔۔۔فنکار اپنے الفاظ کے انتخاب کی بنا پر، اپنی عبارت کی تشکیل کے باعث اور اپنی توقیف کے خصائص کے اعتبار سے پہچانا جاتا ہے۔[۳۸]

ادیب تخیل کی مدد سے اپنی تحریر میں زور پیدا کرتا ہے اور اپنی تخیلاتی پرواز سے ماضی اور مستقبل، دونوں کو حال میں دیکھ سکتا ہے۔ مجنوں گورکھ پوری کا کہنا ہے کہ، "جب تک موجود میں ممکن، واقعہ میں تخیل، حال میں مستقبل کا عنصر داخل نہ ہو، ادب وجود میں نہیں آتا۔"[۳۹]

جدید سوانح اور سیرت کو حقیقت اور تخیل کا امتزاج کہا جاتا ہے کیوں کہ سوانحی ادب اپنے جدید رجانات میں فکشن کی طرف مڑتا جارہا ہے۔ جیسا کہ معروف سوانح نگار لیئن ایڈل کا کہنا ہے کہ سوانح نگار کو تخیل میں ڈوب کر سچ کو ڈھونڈ نکالنا چاہیے۔

To be as imaginative as he pleases, so long as he does not imagine his facts .[40]

زیر نظر مقالہ میں آقاﷺ کتاب کے ادبی عناصر کا جائزہ لے کر یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے گی کہ آقائے دو جہاں ﷺ کی سیرت و سوانح کے تاریخی واقعات کے بیان میں کس حد تک تخیل اور قیاس سے کام لیا گیا ہے اور ادبی حربوں کے استعمال سے کس طرح مطلوبہ تاثرات قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

منتخب نظری ڈھانچہ: تعریف ووضاحت

تحقیق میں نظری فریم ورک کی اہمیت و وقعت کو پیش نظر رکھتے ہوئے محقق نے ابدال بیلا کی کتاب آقاﷺ کا تحقیقی و تنقیدی تجزیہ کرنے کے لیے ایک فریم ورک تشکیل دیا ہے، تاکہ تحقیقی عمل کو ایک خاص سمت مل جائے۔ اس موضوع پر ہونے والی سابقہ تحقیقات کے ساتھ اپنی موجودہ تحقیق کو مربوط کیا جاسکے اور اپنی تحقیق کے لیے مطلوبہ مواد چھانٹنے کے ساتھ ساتھ تحقیق کے نتائج کو زیادہ معنی خیز اور عام فہم بنایا جاسکے۔ اس سلسلے میں اس امر کا بطور خاص خیال رکھا ہے کہ محقق کا منتخب کردہ نظریاتی فریم ورک متعلقہ تحقیق کے طریق کار پیشکش اور نتائج کے مباحث سے ہر صورت ہم آہنگ ہو۔ چار مختلف علوم؛ سیرت و سوانح، تاریخ اور ادب کے جدید اصول و قواعد اور نظری پیمانے کے تناظر میں ان اصناف کے ادبی اظہار کی جانچ کے لیے ایک ایسا فریم ورک تشکیل دیا جارہا ہے جس کے تحت کتاب آقاﷺ کا تحقیقی و تنقیدی تجزیہ جدید تکنیکی اور سائنسی بنیادوں پر کیا جاسکے۔

سیرت نگاری: سیرت نگاری کے میدان میں نئے محرکات اور امکانات کا کھوج لگانے کے لیے معروف علما و محققین و ناقدین؛ مولانا شبلی نعمانی [41]، مولانا ابوالحسن علی ندوی [42]، ڈاکٹر حمید اللہ [43]، ڈاکٹر سید عبد اللہ [44] اور مستشرقین میں سے لیزلی ہیزلٹن [45] کے وضع کردہ اصول سیرت نگاری کو مد نظر رکھتے ہوئے محقق نے کچھ اصول سیرت نگاری اخذ کیے ہیں۔ ان اخذ کردہ اصول سیرت نگاری کی مختلف عنوانات کے تحت درجہ بندی کی گئی ہے، ان اصولوں کی روشنی میں آقاﷺ کا تجزیہ کیا جائے گا۔

محقق کے اخذ کردہ اصول سیرت نگاری درج ذیل ہیں:

مآخذ و مصادر:

۱۔ سب سے پہلے واقعہ کی تلاش قرآن مجید میں، پھر احادیث صحیحہ میں پھر عام احادیث میں کرنی چاہیے، اگر نہ ملے تو روایات سیرت کی طرف توجہ کی جائے، نیز اسرار نبوت ﷺ کی بنیاد اولین اور اصل مآخذ یعنی قرآن مجید پر ہو اور اس کی تعبیر میں قرآن و حدیث سے سر مو انحراف نہ کیا جائے۔

۲۔ کتب سیرت محتاج تنقیح ہیں اور ان کی روایات و اسناد کی تنقید لازم ہے۔

۳۔ فن سیرت میں واقعات کے پرکھنے کے لیے حدیث کی روایت اور اس پر عقلی و تجربی درایت کا طریقہ استعمال کیا جائے۔

۴۔ صداقت کی جستجو کے لیے ہر ممکن ذرائع کا استعمال کیا جائے اور قدیم و جدید دونوں مآخذ سے استفادہ کیا جائے۔

اسلوب بیان:

۱۔ سیرت کے لیے ضروری ہے کہ عصری و علمی اسلوب میں لکھی گئی ہو اور اس میں ہر زمانے کے مروج اسلوب کا لحاظ رکھا جائے۔

۲۔ سیرت نگار ادب سے واقفیت رکھتا ہو تاکہ اسے قرآن الحکیم کی غیر معمولی قدر و قیمت کا علم ہو سکے۔

عہد نبوی ﷺ کے ماحول سے واقفیت:

۱۔ سیرت نگاری کے وقت نبوت محمدی ﷺ کے عہد اور ماحول کو نظر انداز نہ کرے۔

۲۔ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں عقل کے معیار اور تہذیب و تمدن کی سطح سے باخبر ہو۔

۳۔ سیرت نگار لازمی طور پر یہ جانتا ہو کہ متعلقہ ملک کی قدیم تاریخ کیا ہے، تاکہ وہ اپنے ہیرو کے کاموں اور کارناموں کی بھرپور تعریف و توصیف کر سکے۔

۴۔ سیرت نگار اس دور کی بین الاقوامی تاریخ بھی جانتا ہو تاکہ عالمی تاریخ میں اسے محمد ﷺ کی جدوجہد اور کوشش و کاوش کے پس منظر اور نتائج کا علم ہو سکے۔

تخیل آرائی/تصویر بافی:

۱۔ انسائیکلوپیڈیا کی طرز پر نہ لکھی جائے، نیز ملحوظ رہے کہ روایت میں اصل واقعہ کس قدر ہے؟ اور راوی کی ذاتی رائے اور فہم کا کس قدر جزو شامل ہے۔

۲۔ عقل وجذبات دونوں کی کارفرمائی ہو، عالمانہ بحث محبت وعشق کی کیفیت پر غالب نہ آجائے اور نہ ہی جذباتی و ایمانی عنصر عقل سلیم کے تقاضوں پر غالب آئے۔

۳۔ سیرت کے موضوع پر کتاب کی تصنیف میں کسی طرح کی دشواری، ابہام، معروضات قائم کرنے اور قیاس سے کام لینے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ آپ ﷺ کی سیرت سب سے مکمل ہے۔

۴۔ بااصول سیرت نگاری کو ادبی قصہ یا ناول کی طرح نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی جدید سوانح نگاری کی طرح سیرت نگاری میں ہو بہو تصویر کشی ہو۔

۵۔ جدید سوانح نگاری کی طرح نبی اکرم ﷺ کو عام بشر سمجھ کر ان کی طرف کوئی کمزور بات منسوب نہ کی جائے۔

۶۔ نیز اس میں مدح طرازی، مبالغہ آرائی اور ابہام و قیاس سے اجتناب کیا جائے۔۔

۷۔ سیرت چونکہ برتر بایو گرافی ہے لہٰذا اس میں واقعات کے محرکات بھی برتر انسانیت کے پیمانے پر ناپے جائیں۔

سیرت نگاری اور دیگر علوم میں تعلق کی اہمیت سے آگاہی:

۱۔ سیرت نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ تاریخ و جغرافیہ اور تقابلی مطالعہ کے میدان میں جدید ترین مباحث و معلومات سے آگاہ ہو۔

۲۔ وہ عسکری سائنس جانتا ہو تا کہ اسے سپہ سالار حضرت محمد ﷺ کی فاتحانہ صلاحیتوں سے آگاہی ہو۔

۳۔ وہ نفسیات سے شناسا ہو تا کہ اسے مشرف بہ اسلام ہونے والوں میں قبول اسلام کی وجہ سے ذہنی و قلبی تبدیلی سے شناسائی ہو۔

۴۔ معاشرتی علوم میں ہونے والی حالیہ علمی تحقیق سے واقفیت رکھتا ہو۔

۵۔ وہ سوشیالوجی (عمرانیات) کا ماہر ہو تا کہ اسے پتہ چل سکے کہ آپ ﷺ نے اپنے پیروکاروں کی تہذیب و تمدن کا معیار کس طرح بلند کیا۔

دور جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگی:

۱۔ سیرت نگاری میں نئی نسل کے ذہن، ذوق، فہم اور اس کی نفسیات کی موجودہ سطح کا خیال رکھا گیا ہو۔

۲۔ نئے تقاضوں، ضرورتوں، موجودہ دور میں رائج طرز تحقیق اور طرز کلام کی پوری رعایت ہو۔

سوانح نگاری: سوانح نگاری کی تحقیق دراصل معیاری تحقیق کے مختلف پیمانوں اور طریق کار کا ایک وسیع و عریض میدان ہے۔اس کی تحقیق کرنے سے پہلے ہر محقق کو چاہیے کہ اس کثیر العلومی صنف کے تحقیقی منہاج کے گھنے جنگل میں الجھنے کی بجائے اپنے لیے تحقیق کی ایک واضح راہ متعین کرے۔اسی بنا پر محقق نے جیمز لوری کلفرڈ (1978ء-1901ء: Clifford James Lowry)[۲۶] کی تصنیف *From Puzzles to Portraits : Problems of Literary Biographer* اور مائیکل بینٹن(Micheal Benton)[۲۷] کی تصنیف *Literary Biography : An* Introduction میں موجود نظریاتی و تنقیدی مباحث کو آقاﷺ کے سوانحی عناصر کی تحقیق کے لیے منتخب کیا ہے۔ان کتب میں موجود مباحث کی روشنی میں آقاﷺ کے حوالے سے درج ذیل نکات کا تجزیہ کیا جائے گا۔

۱۔ سوانح نگاری کی نوعیت
۲۔ سوانح کی ترتیب و تشکیل

کلفرڈ کے خیال میں ایک سوانح نگار کے لیے اپنی سوانح نگاری کی نوعیت، ساخت، ہیئت اور بنیادی سمت متعین کرنا ایک مشکل اور اہم فیصلہ ہوتا ہے۔سوانح نگاروں کی اسی مشکل کو کم کرنے کے لیے آپ نے سوانح نگاری کی مختلف اقسام میں درجہ بندی کی ہے۔ہر چند کہ یہ درجہ بندی آسان کام نہیں تاہم کلفرڈ نے سوانح نگاری کی مندرجہ ذیل اقسام گنوائی ہیں۔

۱۔ معروضی بایو گرافی(Objective Biography)
۲۔ فنکارانہ (ادیبانہ) بایو گرافی(Artistic Biography)
۳۔ بیانیہ بایو گرافی(Narrative Biography)
۴۔ افسانوی بایو گرافی(Fictional Biography)
۵۔ تاریخی بایو گرافی(Historical Biography)

سوانح نگاری کے جدید اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے مندرجہ بالا اقسام کی روشنی میں یہ دیکھا جائے گا کہ کتاب آقا ﷺ کو سوانح نگاری کی کون سی قسم میں رکھا جا سکتا ہے۔

آقاﷺ میں سوانح کی ترتیب و تشکیل کے حوالے سے مائیکل بینٹن کے تنقیدی مباحث سے استفادہ کیا جائے گا۔ان کی تصنیف میں ادبی سوانح نگاری کے خصائص کا تفصیلی تجزیہ ملتا ہے۔اس میں وضاحت کی گئی ہے کہ کس طرح تاریخی حقائق کو بیانیہ کی روایت سے جوڑا جائے؟ بینٹن نے ادبی سوانح نگار کے لیے ضروری قرار دیا کہ ان کی "زندگی کی کہانی" میں روایتی کہانی کی طرح آغاز، وسط اور اختتام ہونا چاہیے۔اس مقصد کے لیے انہوں نے سوانح نگار کے لیے

بیانیہ میں مہارت کو ضروری قرار دیا ہے۔ان کے تنقیدی مباحث کی روشنی میں یہ دیکھا جائے گا کہ ادبی سوانح نگار کی حیثیت سے آقاﷺ کتاب کے مصنف،اپنی تصنیف میں کہانی کے تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے کس طرح آغاز،وسط اور اختتام کی طرف بڑھے ہیں۔

تاریخ نگاری: سوانح نگاری کے جدید نظریات اس بات کے متقاضی ہیں کہ سوانح نگاری کا مطالعہ کرنے کے لیے تاریخی منہاج استعمال کیے جائیں اور سوانح کو اس کے تاریخی تناظر میں سمجھا اور پرکھا جائے۔آقاﷺ کتاب کے تاریخی پہلوؤں کی جانچ،پرکھ کے لیے محقق نے دو معاصر تاریخ دان جارن ریوزن Jorn Rusen (1938ء)[۸] اور ڈیوڈ کار David Carr (1940ء)[۹] کے تاریخی نظری مباحث کو پیمانے کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ان مصنفین کے یہ نظری مباحث ان کی تصانیف بالترتیب *History :Narration, Interpretation, Orientation* اور *History , Fiction and Human Time: Historical imagination* میں بیان ہوئے ہیں۔ان کتب میں موجود مباحث کی روشنی میں آقاﷺ میں تاریخ کے حوالے سے درج ذیل نکات کا تجزیہ کیا جائے گا۔

۱۔ تاریخی بیانیے کی نوعیت

۲۔ معروضی حقائق کی موضوعی وضاحت

۳۔ تاریخی بیانیے میں تخیل کی کارفرمائی

ریوزن نے مذکورہ بالا تصنیف میں تاریخی بیانیے کی چار اقسام؛ روایتی بیانیہ،مثالی بیانیہ،تنقیدی بیانیہ،جینیاتی بیانیہ،گنوائی ہیں۔ان کے خیال میں ہر تاریخی بیانیے میں تاریخ نگار کے تاریخی شعور کے مطابق یہ چاروں اقسام پائی جاتی ہیں۔اس تصنیف میں ریوزن نے معروضی حقائق کی موضوعی وضاحت کا نظریہ بھی پیش کیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ تاریخی حقائق کے بیان میں معروضی حقائق کی موضوعی وضاحت بھی کی جاتی ہے۔لہٰذا یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ تاریخی حقائق کی موضوعی وضاحت کہاں کہاں اور کیوں کر کی گئی ہے؟

دوسرا پیمانہ ڈیوڈ کار نے دیا ہے۔مذکورہ بالا تصنیف میں آپ نے تاریخی واقعات کے بیان میں تخیل کی کار فرمائی پر بحث کرتے ہوئے اس نکتے پر زور دیا ہے کہ تاریخی حقائق کے بیان میں تخیل کی گنجائش موجود ہوتی ہے چناں چہ تاریخی مطالعات کے دوران یہ بھی دیکھا جانا چاہیے کہ تاریخی حقائق کے بیان میں تخیل کا استعمال کس طرح اور کس حد تک کیا گیا ہے؟اور اسے تاریخی عمل کے لیے کس حد تک جائز مانا جا سکتا ہے؟

ادبی عناصر: کسی بھی کلام،تحریر یا گفتگو میں حسن،لطافت،شگفتگی اور جدت وایجاز وغیرہ کی تلاش علم بیان،علم بدیع اور علم معانی کے اصول و قواعد کی روشنی میں کی جاتی ہے۔یہ قواعد بہت سے ایسے حربے اور آلات مہیا کرتے ہیں،جن کی

مدد سے کسی بھی ادبی تحریر میں زبان کے کردار اور علامات کے استعمال کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ ان حربوں کے ذریعے مصنف کے انداز و اسلوب، اس کے جملوں اور ڈھانچے کے انتخاب کا پتا چلتا ہے۔ مصنف کے لہجے سے موضوع اور قاری کے متعلق مصنف کے رویے کی نشان دہی ہوتی ہے۔ زیر نظر مقالے میں آقاﷺ کتاب کے ادبی عناصر کا جائزہ، معروف محقق اور مصنف ڈیوڈ جولف (پ 1939ء، (David Jolliffe) [۵] کی طرف سے دیے گئے Rhetorical Framework کی روشنی میں کیا جائے گا۔ ان کا دیا گیا فریم ورک کسی بھی زبانی یا تحریری کام کا علم بیان و بدیع کی مدد سے تجزیہ کرنے کی حکمتِ عملی ہے۔ اس فریم ورک سے سے استفادہ کر کے یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے گی کہ:

۱۔ واقعہ نگاری کے لیے کس طرح کی زبان استعمال کی گئی ہے؟ کیا ابلاغ معنی کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے اور اس مقصد کے لیے غیر مانوس و غریب الفاظ کے استعمال میں کس حد تک احتیاط، نیز سادگی و اختصار کو ملحوظ رکھا گیا ہے؟ اور اس کا تصنیف پر کیا اثر پڑا ہے؟

۲۔ مصنف نے کس قسم کے جملے استعمال کیے، ان کا تصنیف پر کیا اثر پڑا ہے؟

۳۔ کیا بیان و بدیع کے استعمال میں اعتدال سے کام لیا گیا ہے؟

۴۔ زور بیان میں جذبات کی شدت اور تخیل کے توازن و تناسب کا کس طرح خیال رکھا گیا ہے؟

5۔ مصنف کا لہجہ پڑھنے والے پر کیا اثر ڈالتا ہے؟

مندرجہ بالا نظریاتی مباحث کی روشنی میں یہ دیکھا جائے گا کہ آقاﷺ میں واقعات کی تعبیر و وضاحت اور اسباب و علل کے بیان میں معروضی حقائق کی موضوعی وضاحت کس قدر اور کس طرح کی گئی ہے؟ اس میں تخیل کی کارفرمائی کس حد تک ہے؟ کیا مصنف کا تخیل اور حقائق کی وضاحت، واقعات کی صداقت پر اثر انداز تو نہیں ہو رہے؟ کیا اس تصنیف میں روایتی کہانی کے لوازمات: آغاز، وسط اور اختتام کا التزام رکھا گیا ہے؟ نیز آقاﷺ کتاب میں ادبی حربوں کی نوعیت کیا ہے؟ اور اس کتاب کو سوانح نگاری کی کون سی قسم میں رکھا جا سکتا ہے؟

سیرت نگاری پر سابقہ تنقید و تحقیق: مطالعہ

سیرت رسول اکرم ﷺ پر اتنا کام ہو چکا ہے کہ بظاہر اس میں مزید کسی اضافے کی گنجائش موجود نہیں لیکن اس کے باوجود واقعات کی تعبیر و وضاحت اور اسباب و علل کے جائزے میں نت نئے امکانات ہر دور میں موجود رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور کے بدلتے ہوئے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے نئے اسالیب کے مطابق سیرت پر کتابیں لکھی گئیں۔ سیرت نگاری کے شعبے میں مختلف مذاہب اور اقوام کے لوگوں نے مختلف زبانوں میں اپنے قلم کے

جوہر دکھائے ہیں اور نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ مقدسہ کے ہر پہلو پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اسی لیے مغربی مفکر مارگولیتھ(Margoliouth)نے حضرت محمد ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے بارے میں تحریر کردہ اپنی تصنیف *Muhammad and the rise of Islam* کی ابتدا میں لکھا ہے کہ :

> The biographers of the Prophet Muhammad from a long series which it is impossible to end but in which it would be honorable to find a place.[۵۱]

"حضرت محمد ﷺ کے سیرت نگاروں کا ایک طویل سلسلہ ہے، جس کو ختم کرنا ممکن نہیں ہے مگر ان میں جگہ پانا شرف کا باعث ہے۔"

اردو ادب میں سیرتِ رسولِ مقبولؐ پر بہت سی کتب تحریر کی گئیں، ان کتب کو مختلف ناقدین اور محققین نے مختلف تنقیدی و تحقیقی زاویوں سے دیکھا اور ان پر بہت سی تحقیقی کتب بھی تحریر کی گئیں۔ بیسویں صدی میں سیرتی مواد کی جمع وتدوین کے کام کو رجحان حاصل ہوا اور ذرائع ابلاغ خصوصاً اخبارات و جرائد نے مختلف مواقع پر خصوصاً عید میلاد النبیؐ کے موقع پر سیرت کے موضوع پر مقالات شائع کیے اور سیرت رسولؐ نمبر بھی شائع کیے۔ ان میں سیرت نگاری کے حوالے سے مختلف تحقیقی مقالات بھی ضبطِ تحریر میں لائے گئے۔ عبد الماجد دریابادی کے سیرتی مقالات "سلطان ما محمد" (۱۹۸۲ء) اور نقوش کے رسولؐ نمبر، جو کہ سیرۃ النبیؐ کے موضوع پر خصوصی نمبر کی حیثیت سے تیرہ جلدوں میں شائع ہوئے جس کی پہلی جلد سیرت نگاری کے فن اور اسلوب پر مشتمل مباحث پر مبنی ہے۔ اس میں سیرت کے مفاہیم، جمع وتدوین، فن سیرت نگاری کے مختلف ادوار، مآخذ سیرت اور اولین سیرت نگاروں کی تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے اور باقی کی جلدوں میں سیرت طیبہ کے مختلف موضوعات پر مشتمل مقالہ جات اور مضامین ہیں جن میں علوم انسانی پر حضور اکرم ﷺ کی سیرت و تعلیمات کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مولانا سعید اکبر نے نقوش کے رسولؐ نمبر کے بارے میں رائے دیتے ہوئے کہا کہ "اسے نمبر کیوں کہیے، یہ تو اردو زبان کی سیرت طیبہ پر انسائیکلوپیڈیا ہے"۔[۵۲]
اسی عرصے میں فنِ سیرت نگاری کے موضوع پر مختلف مقالات کے مجموعے شائع ہوئے مثلاً نقشِ سیرت (۱۹۶۸ء) ڈاکٹر نثار احمد کے تحقیقی مقالاتِ سیرت کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں نبوت و رسالت کے لغوی مفہوم، نبوت کے خصائص، سیرت کا تحریری سرمایہ، اردو میں سیرت نگاری اور چند مغربی سیرت نگاروں سے متعلق تنقیدی و تحقیقی مضامین شامل ہیں۔ اس مجموعے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں تمام مقالات کو موضوعات کے اعتبار سے زمانی ترتیب کے تحت یکجا کیا گیا ہے، جس کی وجہ سے اس نے ایک لحاظ سے ایک مستقل تصنیف کی حیثیت اختیار کر

لی ہے۔ بعض مقالات سیرت کی اہم کتب سے اخذ کیے گئے ہیں۔ تذکار محمد رسول اللہ از حکیم محمد سعید (۱۹۷۰ء) میں بھی سیرت کے موضوع پر مختلف مقالات درج ہیں۔

مولانا ابو الکلام آزاد کی تصنیف رسولِ رحمتؐ (مرتبہ: مولانا غلام رسول مہر) مولانا آزاد کی متفرق تحریروں کا مجموعہ ہے جن میں معنوی ربط پیدا کرنے کے لیے مولانا غلام رسول مہر نے جابجا اضافے کیے ہیں اور تمہیدی عبارتیں تحریر کی ہیں اور جہاں ضروری تھا وہاں حواشی بھی لکھے ہیں۔ بقول غلام رسول مہر "سیرت کا جو حصہ اتفاقاً ان (مولانا آزاد) کے سامنے آجاتا اس پر مقالہ لکھ دیتے یا کسی معاملے کے متعلق کہیں سے استفسار آجاتا تو عادت شریف کے مطابق اس کا مفصل جواب چھاپ دیتے۔" مرتب نے رسول رحمتﷺ میں ظہور قدسی، بعثت و نبوت، دعوت اسلام، ہجرت حبشہ، عالمی دعوت و تبلیغ، پیغام حق کے معجزاتی نتائج، حج، رسول اکرم ﷺ کی وفات، اسوہ محمدیؐ، اور رحمت اللعالمینؐ کے عنوانات کے تحت مولانا ابو الکلام آزاد کے مقالات سیرت اور استفسارات کے جوابات کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ ان مضامین میں سیرت نگاری کے حوالے سے مولانا آزاد کی تنقیدی آرا کا اظہار ملتا ہے، خصوصاً کتاب کے مقدمہ میں سیرتِ نبویؐ کا مقام، اشاعتِ سیرتِ طیبہ اور رسولؐ کا احترام اور اس کا مقام وغیرہ کے موضوعات پر مباحث ملتے ہیں۔ اس کتاب کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا زیادہ تر حصہ قرآن کریم کی روشنی میں احاطہ تحریر میں لایا گیا ہے۔

۱۹۷۶ء میں محمد منیر سیالکوٹی کی مرتبہ آئینہء نبوت شائع ہوئی جس میں سیرت نگاری کے موضوع پر متعدد اہلِ قلم کے تنقیدی و تحقیقی مضامین جمع کیے گئے ہیں۔

ڈاکٹر انور محمود خالد کی کتاب اردو نثر میں سیرت رسولؐ (۱۹۸۹ء) سیرت کے موضوع پر ہونے والے تحقیقی کام میں ممتاز مقام کی حامل ہے۔ اس کتاب میں سیرت نگاری کے فن، اسالیب اور رجحانات کے بارے میں مفید معلومات ملتی ہیں۔ مصنف نے اردو زبان میں سیرت کے موضوع پر ہونے والے سارے کام کا تحقیقی و تنقیدی تجزیہ کیا ہے اگرچہ اردو شعر وادب کے ابتدائی نمونوں میں بھی ہمیں سیرتِ نبویؐ کا کافی مواد ملتا ہے مگر اس کتاب میں زیادہ تر اردو نثر کی حد تک تاریخی مواد فراہم ہوتا ہے۔

سید عزیز الرحمٰن کی تصنیف پاکستان میں اردو سیرت نگاری، ایک تعارفی مطالعہ میں قیامِ پاکستان کے بعد تخلیق ہونے والے سیرتی ادب کی روایت کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

قائدِ انسانیت از سلیم احمد فاروقی میں مولانا شبلی نعمانی، مولانا ابو الاعلیٰ مودودی، امین احسن اصلاحی، مولانا ابو الحسن ندوی اور پروفیسر حمید اللہ خان کے سیرت نگاری کے موضوع پر مقالات کو شائع کیا گیا ہے ان مقالات میں فنِ سیرت نگاری اور مصادرِ سیرت پر مباحث موجود ہیں۔

علم سیرت اور متعلقاتِ سیرت پر ایک اور وقیع تحقیقی کتاب مصادر ِسیرت ِ نبویؐ : اسلام کا علمی و ثقافتی ورثہ (۲۰۱۵ء) ہے جو کہ ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر کی تصنیف ہے۔اس میں کم و بیش پچاس کتب سیرت کا اجمالی تعارف موجود ہے یہ مآخذ سیرت اور مصادر سیرت پر اردو زبان میں ایک جامع کتاب ہے۔

بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں سیرت کی کتب کے تذکرے، فہارس اور اشاریے شائع کیے گئے تاکہ سیرت نگاری پر تحقیق کرنے والوں کے لیے سیرت کی کتب تک رسائی کو ممکن و آسان بنایا جاسکے۔

شیر نوروز خان کی مرتب کردہ تصنیف حضرت محمدؐ : منتخب کتابیات اردو کتب و مقالات (۲۰۱۶ء) ہے۔اس میں مختلف کتب سیرت کی موضوعات کے لحاظ سے فہرست دی گئی ہے۔ان کتب میں مختلف زبانوں پر مبنی کتب بھی شامل ہیں۔ان زبانوں میں انگریزی، جرمن، روسی، ہسپانوی وغیرہ کے علاوہ اپنے رومن خط کی وجہ سے ترکی زبان کی کتب سیرت بھی شامل ہیں۔لیکن ان کتب پر کسی قسم کا تجزیہ نہیں کیا گیا۔اس کتاب میں سیرتی مقالات کے مجموعے وغیرہ بھی شامل ہیں۔مستشرقین کی زبانوں سے مغربی زبانوں میں ترجمہ شدہ کتب بھی اس کتاب کا حصہ ہیں۔مصنف نے اس کتاب میں حیات محمد ﷺ پر مشتمل چالیس عنوانات کو الف بائی ترتیب میں بیان کیا ہے۔

سید حسنین عارف نقوی کا مقالہ " پاکستانی رسائل کے سیرت نمبر " بھی اپنے مواد کے اعتبار سے سیرت پر تحقیق کرنے والوں کے لیے مفید مقالہ ہے۔

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کی طرف سے دورِ جدید میں سیرت نگاری کے رجحانات کے موضوع پر ایک بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد کیا گیا، جس میں امریکہ، یورپ، افریقہ اور وسطی ایشیا سے مقالہ نگاروں نے شرکت کی۔اردو کے منتخب اہم مقالات سیرت تجزیہ و تحلیل کے بعد کتابی شکل میں دورِ جدید میں سیرت نگاری کے رجحانات (۲۰۱۱ء) کے عنوان سے شائع ہوئے۔اس کتاب میں مختلف محققین و ناقدین کے سیرت نگاری کے اصول و مصادر، سیرت نگاری اور غیر مسلم، سیرت نگاری کے اسالیب و مناہج، سیرت نگاری کے تاریخی و علاقائی جائزے اور چند اہم کتب سیرت کے تنقیدی مطالعات کے حوالے سے مباحث ملتے ہیں۔ہر مقالے کا اسلوب، زبان و بیان دوسرے مقالے سے مختلف ہے، تاہم تدوین سے متعلقہ امور میں یکسانیت کا ممکنہ حد تک خیال رکھا گیا ہے۔اس کتاب میں سیرت نگاری کے تاریخی اور علاقائی جائزے میں پاک و ہند کے تمام علاقوں اور بڑی زبانوں کے احاطے کے حوالے سے تشنگی کا احساس ہوتا ہے، لیکن اس کے باوجود اس ضخیم مجموعے میں جو مقالات شامل اشاعت ہیں وہ سیرت کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے کافی مددگار ہیں۔

محمد شکیل صدیقی کا پی ایچ ڈی کا مقالہ "برصغیر پاک و ہند میں سیرت نگاری کے رجحانات (۱۹۸۷ء-۱۸۵۷ء) "میں سیرت نگاری کے ارتقاء ورجحانات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔اردو شاعری اور نثر میں سیرت نگاری کی روایت کا بھی اجمالی ذکر کیا گیا ہے۔ عربوں کی آمد سے ۱۸۵۷ء تک عہد بہ عہد سیاسی و تہذیبی اور تاریخی حالات کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے، نیز ۱۸۵۷ء سے قبل کے سیرت کے تحریری مواد اور اس کے محرکات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مصنف نے عیسائی مشنریوں کی مذہبی تبدیلیوں کے تعلیم، زبان اور ادب وغیرہ پر اثرات کا بھی جائزہ لیا ہے اور ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۸۷ء تک لکھی جانے والی سیرت کی کتب کا تنقیدی تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ تحریک استشراق اور تحریک سیرت کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ مولود ناموں کی قدیم روایت اور سیرت نگاری کے ارتقائی سفر کا بھی جامع جائزہ لیا گیا ہے جو کہ ۱۹۱۹ء-۱۸۹۸ء تک کے عرصے پر محیط ہے۔ یہ عہد چونکہ یورپی و مغربی استعماریت کے سیاسی و تہذیبی غلبہ واثرات سے عبارت ہے، چنانچہ اس دور میں لکھی گئی سیرت نگاری کے آہنگ، انداز و سوچ اور نئے رجحانات کا بھی تفصیلی تجزیہ کیا گیا ہے۔ برصغیر کی تقسیم اور قیام پاکستان کے بعد کی سیرت نگاری کے نئے رجحانات و اسالیب کی نشاندہی مشہور کتب سیرت کی روشنی میں کی گئی ہے۔ سیرت نگاری کے سرکاری محرکات واثرات کے ساتھ جدید تحقیقی رجحان کو بھی نمایاں کیا گیا ہے اور ڈاکٹر حمید اللہ کی سیرت نگاری کو خصوصی طور پر تفصیل سے موضوع گفتگو بنایا گیا ہے۔

ہندوستان میں سیرت نگاری کے موضوع پر ہونے والے سیمینار میں پڑھے جانے والے مقالات کے مجموعے کو کتابی شکل میں ہندوستان میں اردو سیرت نگاری کے عنوان کے تحت شائع کیا گیا ہے۔ یہ دوروزہ قومی سیمینار اسلامک سٹڈیز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ۱۱-۱۰ مارچ ۲۰۱۸ء کو منعقد کیا گیا تھا۔اس کتاب میں مختلف محققین و نقادوں کے مقالہ جات شامل کیے گئے ہیں۔

اصول سیرت نگاری : تعارف ، مآخذ و مصادر از پروفیسر ڈاکٹر صلاح الدین ثانی میں سیرت نگاری کے دیگر علوم مثلاً سیرت اور حدیث، سیرت اور تاریخ، سیرت اور میلاد، سیرت اور نعت اور سیرت اور سوانح میں تعلق و امتیاز کی وضاحت کی گئی ہے اور فن سیرت نگاری کا ارتقائی جائزہ لیتے ہوئے قرون اولیٰ کے چند اہم سیرت نگاروں کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ سیرت نگاری کے پچیس اصول بھی بیان کیے گئے ہیں۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تصنیف سیرت سرور عالمﷺ مولانا صاحب کے مختلف مقالات سیرت کا مجموعہ ہے، جسے نعیم صدیقی اور عبدالوکیل علوی نے مرتب کیا۔ جب مولانا مودودی کے سامنے ان کی بکھری تحریروں کو کتاب کی شکل میں پیش کیا گیا تو وہ خود بھی حیران رہ گئے۔انہیں اپنی تحریروں پر یقین نہیں ہو رہا تھا، چنانچہ انہوں نے نہایت باریک بینی سے سارے مواد کا جائزہ لیا اور بہت عمدہ طریقے سے مدون کر کے دنیا کے سامنے پیش

کیا۔ اگرچہ یہ مجموعہ ایک مستقل کتاب کی کمی کو تو پورا کرنے سے قاصر ہے مگر اس میں جو مضامین یکجا کیے گئے ہیں ان سے رسول اکرم ﷺ کی شخصیت اور آپ ﷺ کے کارنامہ حیات کو سمجھنے میں بہت حد تک مدد مل سکتی ہے۔

ابوالخیر کشفی کے مقالہ "اردو میں سیرت نگاری" میں اردو سیرت کی روایت کو جامع اور مفصل انداز میں بیان کیا گیا ہے اور مختلف کتب کے مصنفین کے اسلوب اور مواد پر تنقید کی گئی ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کا مضمون "فن سیرت نگاری پر ایک نظر" رسالہ فکر و نظر میں شائع ہوا ہے۔ یہ سیرت کے لحاظ سے ایک بہت معلوماتی مضمون ہے۔ اس میں سیرت نگاری کے اصول و ضوابط متعین کیے گئے ہیں۔ اور سیرت نگاری اور جدید سوانح نگاری کے مابین فرق کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے دلائل کے ساتھ اپنے مضمون میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جدید دور کے عام اشخاص کی بایو گرافی کو سیرت کہنا زیادتی ہے۔ وجہ چاہے کچھ بھی ہو، اس کے جزوی مفہوم کچھ بھی ہوں، سیرت کے لفظ کو اصولی طور پر آنحضرت ﷺ کے حالات ہی سے مخصوص سمجھنا چاہیے۔ ان کے خیال میں جدید دور کی بہترین سوانح عمریوں کی تعداد تین ہے، جن میں سے ایک تو علامہ شبلی نعمانی و سید سلیمان ندوی کی سیرت النبی ﷺ ہے، اور دوسری بہترین سوانح عمری محمد حسین ہیکل کی حیات محمد ﷺ ہے، جب کہ تیسری سوانح عمری مغربی مصنف منٹگمری واٹ کی دو کتابیں محمد ایٹ مکہ اور محمد ایٹ مدینہ کو قرار دیتے ہیں۔ اپنے مضمون کے آخر میں علامہ شبلی کی تصنیف کو اردو کے سیرتی سرمائے میں خصوصی اہمیت کا حامل سمجھتے ہیں۔ اس فوقیت کے مختلف اسباب و وجوہات بھی بیان کرتے ہیں۔ ان کی رائے ہے کہ شبلی و سلیمان کی مرتب کردہ یہ سیرت ہمارے دینی ادبیات عالیہ میں بلند حیثیت کی مالک ہے۔ اس میں حضور اکرم ﷺ کی لفظی شبیہ بھی آگئی ہے اور حضور ﷺ کا اسوہ بھی۔ سیرۃ النبی ﷺ کہانی نہیں دین ہے اور یہی چیز اسے سیرت کی باقی کتابوں سے ممتاز کرتی ہے۔ [۵۳]

مولانا ابوالحسن ندوی کے مضمون "سیرت نگار کی ذمہ داریاں" میں جدید سیرت نگاری کے اصول بیان کیے گئے ہیں۔ ان کا یہ مضمون نقوش کے "رسول نمبر" کی جلد اوّل میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں مولانا نے سیرت نگاری کے اصول و ضوابط اور اسلوب کے حوالے سے بحث کی ہے۔ مصنف کے خیال میں ان کی بیان کردہ معلومات سیرت کا مطالعہ کرنے والے کے لیے روشنی کا کام کرتی ہے۔ اور اس کے سامنے بعثت محمدی ﷺ کی عظمت و وسعت اور منصب نبوت کی نزاکت و اہمیت اور اس کے عظیم الشان نتائج کی مکمل تصویر پیش کرتی ہے۔ اپنے اس مضمون میں انہوں نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ عہد حاضر کے سیرت نگار کے لیے بحث و تحیص سے کام لینا بہت ضروری ہے۔ اس کا کام اس وقت تک تکمیل کا درجہ نہیں پا سکتا جب تک وہ بحث و تنقید کا جدید انداز نہ

اپنائے اور آغاز اسلام کے وقت عہد جاہلیت کا نقشہ اور اس کے فساد و اضطراب ، اخلاقی پستی و خود فراموشی کی زندہ و متحرک تصویر پوری امانت داری کے ساتھ بے کم و کاست پیش نہ کرے۔ [۵۴]

"صدر اوّل میں سیرت نگاری کے مناہج و رجحانات : ایک ارتقائی جائزہ" از عطاء الرحمٰن ، حافظ عبد الغفور میں علم مغازی و سیرت نگاری کا ارتقائی جائزہ ابتدائی زمانہ کے ماخذات کی روشنی میں لیا گیا ہے۔

مجتبیٰ فاروق کا مقالہ "اردو میں کتب سیرت : ایک مختصر تعارف" اردو کی کتب سیرت کے حوالے سے بہت معلوماتی مقالہ ہے اس میں تنقیدی آرا کی بجائے ان کتب کا مختصراً تعارف دیا گیا ہے۔

"منہج حرکی : سیرت نگاروں کا جدید رجحان" از محمد علیم ، محمد سجاد میں منتخب کتب سیرت کا تنقیدی مطالعہ سیرت کے سیاسی اور حرکی پہلو کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ منہج حرکی مغربی استعماریت کے خلاف رد عمل کی ایک کیفیت کا نام ہے۔ مقالہ نگار کی رائے میں سیرت نگاری کا یہ جدید رجحان اسلامی نشاۃ ثانیہ کے لیے کام کرنے والی تحریکوں کی نہ صرف بنیادی ضرورت ہے بلکہ اجتماعی رہنمائی کے لیے رول ماڈل کے خدوخال بھی واضح کرتا ہے۔ مقالہ نگار نے اس رجحان کی حامل مختلف کتب سیرت اور ان کتب کے مندرجات پر مختصراً روشنی ڈالی ہے اور ہر کتاب کے بارے میں اپنی تنقیدی رائے کا اظہار کیا ہے۔ مقالے کے آخر میں مختلف علما کی طرف سے سیرت کے منہج حرکی رجحان پر کیے گئے اعتراضات بیان کیے ہیں اور سفارشات پیش کی ہیں تاکہ انقلاب اور تحریک کی اصطلاحات پر از سر نو غور کر کے ان کے معانی کو نہ صرف متعین کیا جائے بلکہ ان کے استعمال کے حق میں اور مخالفت میں آرا کا غیر جانبداری سے جائزہ لیا جا سکے۔

ثمینہ احمد کے مقالے "ڈاکٹر حمید اللہ کی تحقیقات کی روشنی میں مطالعہ سیرت کی نئی جہات" میں سیرت نبویہ ﷺ کی تحقیق میں ڈاکٹر حمید اللہ کے انداز و اسلوب کی روشنی میں ان جہات کی نشاندہی کی گئی ہے جن پر ڈاکٹر صاحب نے پہلی مرتبہ ٹھوس علمی و تحقیقی انداز میں کام کیا اور بعد ازاں انہی بنیادوں پر سیرت نگاروں نے مستقل تصانیف پیش کیں۔ مقالہ کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ عہد نبوی ﷺ کا سیاسی و سفارتی نظام ، عہد نبوی ﷺ میں نظام مالیہ۔ عہد نبوی ﷺ میں نظام تشریع و عدلیہ ، عہد نبوی ﷺ کا نظام تعلیم ، عہد نبوی ﷺ میں نظام دفاع۔ اس مقالہ میں ان جہات پر بحث ڈاکٹر حمید اللہ کی سیرت نبویہ ﷺ پر تحقیق کی روشنی میں کی گئی ہے۔

"پاکستان میں بچوں کے لیے سیرت نگاری" از ام سلمیٰ ، ڈاکٹر طاہرہ بشارت میں بچوں کی سیرت نگاری کے آغاز و ارتقا کے بارے میں تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے۔ بچوں کے سیرتی ادب کو تین ادوار میں تقسیم کر کے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ پہلا دور آغاز و ارتقا کے بارے میں ہے۔ دوسرے دور میں متحدہ ہندوستان میں بچوں کے لیے اردو سیرت نگاری پر بحث کی گئی ہے ، جبکہ تیسرے دور میں پاکستان میں بچوں کے سیرتی ادب کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس مقالے

میں ہر دور میں لکھی جانے والی کتب سیرت کے تعارف کے ساتھ ان پر تفصیلی تبصرہ بھی درج ہے۔آخر میں تجاویز و سفارشات پیش کی گئی ہیں جن کی روشنی میں بچوں کے لیے جدید دور میں سیرت النبی ﷺ کو آسان پیرایہ میں تحریر کیا جاسکتا ہے۔

سفیر اختر کا مقالہ " برصغیر پاک وہند میں سیرت نگاری (دوسری صدی ہجری سے بارھویں صدی ہجری تک)" اور حافظ محمد نعیم کا مقالہ " برصغیر میں سیرت نگاری کا روادارانہ اسلوب: ۱۹۴۷ء تا ۱۸۵۷ء (ہندوؤں اور سکھوں کی کتب سیرت کی روشنی میں)" سیرت نگاری کی روایت کے لحاظ سے کافی معلوماتی ہیں۔ماہنامہ فکر و نظر میں شائع ہونے والے مقالے "دور جدید میں سیرت نگاری کے رجحانات "از نوید احمد شہزاد میں سیرت نگاری کے جدید رجحانات و مناہج اور اسالیب پر بہت عمدہ بحث کی گئی ہے۔مقالہ نگار نے موجودہ دور میں جدید تحقیقی اسلوب کی بدولت سیرت نگاری کے میدان میں نمایاں ہونے والے درج ذیل رجحانات مثلاً عصری مسائل کے تناظر میں سیرت نگاری، سیرت نگاری میں جدید ذرائع ابلاغ کا استعمال، مصادر سیرت کی از سر نو ترتیب و تنظیم، کتب سیرت کے تراجم، کتب سیرت کی تحقیق و تخریج اور اسالیب سیرت نگاری وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔

"خصائص نبویؐ پر عصری تصنیفی اسالیب کا تحقیقی جائزہ" از ڈاکٹر محسنہ منیر میں اوائل دور کے علمائے کرام کی کتب سیرت اور جدید دور کی کتب سیرت کی فہرست پیش کی گئی ہے اور جدید دور کی وہ کتب سیرت جو کہ خصائص و امتیازات رسول ﷺ کے حوالے سے ہیں، ان کا مختصراً تعارف بھی کروایا گیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے اسالیب پر بھی مثالوں کے ذریعے روشنی ڈالی گئی ہے۔خصائص نبوی پر مبنی کتب کو دو گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے، مستقل کتب اور ضمنی کتب۔ مستقل کتب میں آنحضرت ﷺ کی سیرت پاک کے ان پہلوؤں کو اہمیت دی گئی ہے جو عمل کے ساتھ مخصوص ہیں جبکہ ضمنی کتب میں خصائص نبوی ﷺ پر مشتمل آیات کی وضاحت میں کتب تفاسیر، شروح وحدیث اور سیرۃ النبی ﷺ پر مواد شامل ہے۔مقالہ نگار کے خیال میں ضمنی کتب کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں کیوں کہ تفاسیر، شروح وحدیث اور کتب سیرت تحریر کرنا علماوخواص کا کام ہے اور ان کے انداز تحریر میں پائے جانے والی علمیت سے استفادہ بے حد مفید ہوتا ہے۔

شیخ عنایت اللہ کا مقالہ "رسول ﷺ کے سیرت نگار" تحقیقی حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔اس میں مطالعہ سیرت کی اہمیت، سیرت نگاری کی ابتدا، سیرت نبویؐ کے مصادر اور متقدمین کی مؤلفات کا تحقیقی و تنقیدی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

فن سیرت نگاری کے حوالے سے ہونے والی تحقیق کا مختصراً جائزہ لینے کے بعد فنِ سوانح نگاری کا جائزہ بھی ذیل میں پیش کیا جارہا ہے تاکہ سوانح نگاری کی تحقیق کی روایت سے آگاہی حاصل کی جاسکے۔

سوانح نگاری کی تحقیق کی روایت:

اردو ادب میں مختلف اصنافِ ادب پر کی جانے والی تحقیق پر اگر نظر دوڑائی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سوانح نگاری کے حوالے سے کی جانے والی تحقیقات بہت کم ہیں۔ حالانکہ سوانح عمریاں ہر دور میں لکھی گئی ہیں۔

سوانح نگاری پر الطاف فاطمہ کی تحقیقی کتاب اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا (۱۹۶۱ء) اس موضوع پر پہلی تحقیقی کاوش ہے۔ الطاف فاطمہ خود اپنی کتاب کے مقدمہ میں لکھتی ہیں کہ:

اردو میں سوانح عمریاں اور اس فن کی مختلف اصناف کثرت سے لکھی گئی ہیں، لیکن اس فن کے متعلق بہت کم لکھا گیا۔ میں نے جس وقت اپنے مقالے کے لیے اس موضوع کو منتخب کیا تو مجھ کو اس امر کا علم نہ تھا کہ اس موضوع یعنی "اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا" پر کوئی باضابطہ کام اب تک ہوا ہی نہیں۔ [۵۵]

الطاف فاطمہ نے سوانح نگاری کے فن کے بارے میں بنیادی مباحث بیان کیے ہیں۔ مغرب میں فن سوانح نگاری کی سر گزشت مختصراً بیان کی ہے۔ اردو سوانح نگاری کا تصور اور اس کی مختلف شاخوں کا بھی جامع انداز میں ذکر کیا ہے۔ انہوں نے اردو کی سوانح عمریوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ ان کی تصنیف نہ صرف فن سوانح نگاری کے حوالے سے اہم ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ حالی و شبلی کی سوانح نگاری کے بارے میں بھی تفصیلی مواد فراہم کرتی ہے۔

سوانح نگاری میں تحقیق کے حوالے سے ایک اور تصنیف ڈاکٹر سید شاہ علی کی اردو میں سوانح نگاری (۱۹۶۱ء) ہے۔ ابتدائی دو ابواب میں سوانح نگاری کے اصول، مسائل، خصوصیات اور اقسام کا تجزیہ کیا گیا ہے ان کے خیال میں مغرب کی سوانح نگاری اردو سوانح نگاری کے مقابلے میں ترقی یافتہ ہے۔ اپنی کتاب کے آخر میں انہوں نے اردو ادب میں اردو سوانح نگاری کا درجہ متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس حوالے سے تیسری اہم کتاب فاخرہ ممتاز کی تصنیف اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا (۱۹۷۵ء-۱۹۱۴ء) ہے جو کہ ۱۹۸۴ء میں منظر عام پر آئی۔ انہوں نے خود نوشتوں اور شخصی خاکوں کو بھی سوانح عمری میں شامل کیا ہے۔ پہلے باب میں فن سوانح نگاری کے ساتھ ساتھ ادب کی دیگر اصناف مثلاً ناول، افسانہ اور ڈرامہ کی طرح سوانح عمری میں اسلوب کی اہمیت پر بحث کی ہے۔ باب دوم میں ابتدا سے لے کر ۱۹۱۴ء تک کا سوانحی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ سوانح عمری کی روایت کو تاریخوں، تذکروں اور سیرت کی کتابوں میں تلاش کرنے کی سعی کی گئی ہے نیز اس دور کی سوانح عمریوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے صف اول کے سوانح نگاروں مثلاً حالی و شبلی اور ان کے معاصرین کی سوانح عمریوں کا تنقیدی تجزیہ کیا گیا ہے۔ بعد میں دوم سوم درجہ کی سوانح عمریوں پر تبصرہ کیا گیا

TH-27828

ہے۔ تیسرے باب میں ۱۹۴۷ء۔۱۹۱۴ءتک کی سوانح عمریوں کاارتقائی جائزہ پیش کر کے تنقیدی تجزیہ کیا گیا ہے۔ باب چہارم میں تقسیم کے بعد سوانح نگاری کے فن میں تبدیلیوں اور نئے رجحانات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

فن سوانح نگاری پر ایک طویل مضمون امیر اللہ خان یقین کی تصنیف فن سوانح نگاری اور "دیگر مضامین" میں شامل ہے۔اس میں فن سوانح نگاری پر بحث کی گئی ہے۔اس کے علاوہ سوانح نگاری میں مواد اور اسلوب کی اہمیت کی وضاحت کی گئی ہے۔اس مضمون میں حالی و شبلی کی سوانح نگاری کے اسلوب پر بحث کی گئی ہے ،تاہم پورا مضمون پڑھنے کے بعد جو پہلا تاثر ملتا ہے وہ یہی ہے کہ مصنف نے زیادہ تر خیالات مندرجہ بالا سوانح نگاری کی کتب سے ہی حاصل کیے ہیں۔

سیرت نگاری اور سوانح نگاری کے حوالے سے مندرجہ بالا تمام تحقیقی کتب کا انداز تقریباً ایک جیسا ہے۔ زیادہ تر تحقیقی کتب اور تحقیقی مقالات میں اردو کتبِ سیرت وسوانح اور ان کے موضوعات کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔ بلاشبہ سیرت وسوانح نگاری کی تحقیق میں یہ کتب اور مقالات اہم مآخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تاہم ان تصانیف میں تنقید اور تجزیے کے روایتی اور عمومی طریق کار کا استعمال ملتا ہے اور کسی مخصوص نظری پیمانے یا اساس کی بنیاد پر متن کو پرکھنے کا رجحان نظر نہیں آتا۔ اسی لیے محقق نے سیرت وسوانح کی کتاب آقاﷺ کو سیرت، سوانح، تاریخ اور ادب کے جدید رجحان کے تحت دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ہینس رینڈرز، ڈی بن ہان (Hanss Renders,De Binne Han)، دیباچہ *Biographical Turns:Lives in History*،(لندن:راؤٹ لیج،۲۰۱۷ء)۔

۲۔ ابن المنظور الافریقی، لسان العرب (دار صاد)(بیروت،۱۹۹۰ء)،ص ۳۹۰۔

۳۔ وارث سرہندی،قاموس مترادفات(لاہور:اردو سائنس بورڈ،۱۹۸۶ء)،ص ۷۳۹۔

۴۔ ابوالحسن علی ندوی،"سیرت نگار کی ذمہ داریاں"مشمولہ نقوش رسول نمبر، جلد اول، شمارہ ۱۳۰(دسمبر ۱۹۸۲ء)، ص ۸۲۔

۵۔ محمد میاں صدیقی،"اردو زبان میں چند اہم کتب سیرت"مشمولہ سہ ماہی فکر و نظر جولائی تا دسمبر، جلد نمبر ۳۰، شمارہ نمبر ۲(س۔ن)، ص ۲۲۵۔

۶۔ https://www.merriam-webster.comتاریخ ملاحظہ ۲۱ نومبر ۲۰۲۱ء بوقت ۱۰:۰۰ بجے صبح۔

۷۔ انور محمود خالد، اردو نثر میں سیرت رسولؐ(لاہور:اقبال اکادمی،۱۹۸۹ء)،ص ۱۹۔

۸۔ لیئن ایڈل،(Leon Edel)،*Writing Lives : Principia Biographica* (لندن:ڈبلیو ڈبلیو نورٹن،۱۹۸۵ء)،ص ا۔

۹۔ سید شاہ علی، اردو میں سوانح نگاری(کراچی:انجمن پریس،۱۹۶۱ء)،ص ۳۱۔

۱۰۔ شبلی نعمانی،سیرۃ النبیؐ، جلد اول(لاہور: علم و عرفان پبلشرز، جولائی ۲۰۰۷ء)، ص ۱۰۔

۱۱۔ امیر اللہ خان یقین،فن سوانح نگاری اور دیگر مضامین(دہلی: طاہر بک ایجنسی،۱۹۷۳ء)،ص ۱۲۸۔

۱۲۔ حسن مثنیٰ ندوی،"شارع انسانیت"مشمولہ آئین جلد نمبر ۲۸، شمارہ نمبر ۱۱(نومبر ۱۹۹۹ء)، ص ۱۰۔

۱۳۔ سید عبداللہ،"فن سیرت نگاری پر ایک نظر"مشمولہ فکر و نظر شمارہ نمبر ۱۳۵ (۱۹۷۶ء)، ص ۷۔۱۵۔

۱۴۔ شبلی نعمانی،سیرۃ النبیؐ، جلد اول(لاہور: علم و عرفان پبلشرز، جولائی ۲۰۰۷ء)، ص ۱۰۔

۱۵۔ نعیم صدیقی،محسن انسانیت(لاہور:اسلامک پبلی کیشنز،۱۹۶۹ء)، ص ۱۴۔۵۹۔

۱۶۔ صلاح الدین ثانی،اصول سیرت نگاری(کراچی: مکتبہ یادگار شیخ الاسلام، اپریل ۲۰۰۳ء)، ص ۴۴۔

۱۷۔ https://www.britannica.com/dictionary،تاریخ ملاحظہ ۴ مئی ۲۰۲۱ء بوقت ۱۱:۰۰ بجے۔

۱۸۔ ایم نذیر احمد،فلسفہ تاریخ(لاہور:الفیصل ناشران، مارچ ۲۰۱۲ء)، ص ۱۷۔

۱۹۔ https://drkhalidiqbal.wordpress.com ،تاریخ ملاحظہ ۱۲ دسمبر ۲۰۲۱ء بوقت ۱۲:۰۰ بجے۔

۲۰۔ جارن ریوزن،(Jorn Rusen)، *History: Narration, Interpretation, Orientation*،(نیویارک: برگ ہان بکس،۲۰۰۵ء)، ص ۲۔

۲۱۔ https://ur.autograndad.com/808605/1تاریخ۔نگاری html.تاریخ ملاحظہ ۲ نومبر ۲۰۲۱ء

بوقت ۰۰:۲ بجے۔

۲۲۔ جارن ریوزن،(Jorn Rusen)، *History: Narration, Interpretation, Orientation*، ص ۷۷۔

۲۳۔ شبلی نعمانی،سیرت النبی ﷺ(لاہور: مکتبہ مدینہ،مارچ ۲۰۰۱ء)، ص ۲۸۔

۲۴۔ جارن ریوزن،(Jorn Rusen)، *History: Narration, Interpretation, Orientation*، ص ۸۲۔

۲۵۔ محمد حمیداللہ، پیغمبر اسلام ﷺ مترجمہ پروفیسر خالد پرویز(ملتان: بیکن بکس،۲۰۰۵ء)، ص ۲۱۔

۲۶۔ ایف ای پیٹرس(F.E.Peters)،"The Quest of Historical Muhammad PBUH"، مشمولہ *The Quest of Historical Muhammad PBUH*، ص 445۔

۲۷۔ انور محمود خالد،اردو نثر میں سیرت رسول ،ص ۱۹۔

۲۸۔ ندیم الواجدی، "سیرت نگاری کے بعض اہم پہلو" مشمولہ نقوش رسول نمبر، جلد نمبر ۱(س۔ن)، ص ۵۷۔

۲۹۔ احسن مناظر گیلانی،تدوین حدیث،(س۔ن) ص ۱۱۔

۳۰۔ شبلی نعمانی،الفاروق(کراچی: دارالاشاعت، ۱۹۹۲ء)، ص ۳۰۔

۳۱۔ ایضاً، ص ۳۰۔

۳۲۔ ایضاً، ص ۳۰،۳۳۔

۳۳۔ https://www.britannica.com/dictionary، تاریخ ملاحظہ ۱۰ جون ۲۰۲۰ء بوقت ۵ بجے۔

۳۴۔ http://www.innovativeresearchpublication.com/singaporc/paper %2078pdf , ،تاریخ ملاحظہ ۲۰ اگست ۲۰۲۰ء بوقت ۲ بجے۔

۳۵۔ عابد علی عابد،البدیع(لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء)، ص ۱۴۔

۳۶۔ https://www.humsub.com.pk/364747/abu-fahad-nadvi-6،تاریخ ملاحظہ نومبر ۲۰۲۱ء بوقت ۰۰:۱۱ بجے۔

۳۷۔ شبلی نعمانی،الفاروق ،ص ۳۵۔

۳۸۔ عابد علی عابد،اسلوب(لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء)، ص ۳۳۔

۳۹۔ مجنوں گورکھپوری،ادب اور زندگی(علی گڑھ: اردو گھر، ۱۹۸۴ء)، ص ۳۸۔

۴۰۔ لیئن ایڈل (Leon Edel)، *Biography :A Menifesto* (لندن: یونیورسٹی آف ہوائی پریس ۱۹۷۸ء)، ص ۱۔

۴۱۔ علامہ شبلی نعمانی(۱۹۱۴ء-۱۸۵۷ء) اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ سے اپنی علمی و تحقیقی زندگی کا آغاز کیا۔ آپ نے ۱۹۱۳ء میں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی۔ شبلی کا شمار اردو زبان کے عناصر خمسہ میں ہوتا ہے۔ انہوں نے شاعری، تاریخ، سوانح

نگاری، سیرت نگاری اور تنقید کے میدان میں اپنے تخلیقی جوہر دکھائے۔موازنہ انیس و دبیر اورشعر العجم میں ان کی تنقیدی بصیرت کھل کر سامنے آتی ہے۔

۴۲۔ مولانا سید ابوالحسن ندوی ۵ دسمبر ۱۹۱۳ء کو ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے اور ۲۶ جنوری ۱۹۹۵ء میں رائے بریلی میں وفات پائی۔ آپ نے نزہت الخواطر کے نام سے آٹھ جلدوں میں انسائیکلوپیڈیا تیار کی۔ آپ کو ۱۹۸۰ء میں شاہ فیصل ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ آپ عربی، اردو، ہندی، ترکی، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں پر عبور رکھتے تھے، ان زبانوں میں آپ کی کتب بھی موجود ہیں۔ ان کی تصنیف ماذا خسر عالم انحطاط مسلم کا انگریزی کے علاوہ بھی بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔

۴۳۔ ڈاکٹر سید عبداللہ (۱۹۸٦ء-۱۹۰٦ء) ضلع مانسہرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ معروف ادیب، نقاد، محقق اور عالم کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ جامع پنجاب میں لیکچرر کے فرائض سرانجام دیے۔ اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل بھی رہے۔ آپ نے جامع پنجاب میں پاکستان کی پہلی اردو کانفرنس منعقد کروائی۔ اپنے ادبی سفر کا آغاز تحقیقی مضامین سے کیا اور تاریخ اردو اور ادبی تنقید کے موضوع پر مختلف کتب تصنیف کیں۔ تنقید آپ کا میدانِ خاص تھا۔ آپ کی تنقیدی تصانیف میں نقدِ میر، ولی سے اقبال تک، وجہی سے عبدالحق تک، مباحث، اشاراتِ تنقید، اردو ادب ۱۸۵۷ء سے ۱۹۶۶ء، سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رُفقاء، فارسی زبان و ادب، اطرافِ غالب، مسائلِ اقبال اورمطالعہ اقبال کے چند نئے رُخ وغیرہ شامل ہیں۔ آپ کے تنقیدی سرمائے کی اردو ادب میں ایک خاص حیثیت ہے جسے کسی صورت میں بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

۴۴۔ ڈاکٹر حمید اللہ ۱۹ فروری ۱۹۰۸ء بروز بدھ کو ریاست حیدرآباد میں پیدا ہوئے اور ۷ دسمبر ۲۰۰۲ء میں وفات پائی۔ آپ معروف محدث، فقیہ، اور محقق ہونے کے ساتھ بین الاقوامی قانون کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ عہد حاضر میں سیرت نگاری کی نئی جہات متعارف کروانے میں ڈاکٹر حمید اللہ کو ایک خاص حیثیت حاصل ہے۔ آپ نے فرانسیسی زبان میں قرآن پاک کا ترجمہ کیا۔ پوری زندگی تاریخ و حدیث پر تحقیق میں صرف کی۔

۴۵۔ لیبر بلی ہیز لٹن، برطانوی نژاد امریکی مصنفہ ہیں، جو کہ ۱۹۴۵ء میں برطانیہ میں پیدا ہوئیں۔ آپ نے مذہب کے سیاسی و سماجی اثرات اور تاریخ کو اپنا موضوع خاص بنایا۔ اسلام اور عیسائیت کے موضوع پر بہت سی کتب تصنیف کیں۔

۴٦۔ جیمز لوری کلفرڈ (۱۹۷۸ء-۱۹۰۱ء: James Lowry Clifford) برطانیہ میں کولمبیا یونیورسٹی میں درس و تدریس کے شعبے سے منسلک رہے۔ آپ ایک معروف سوانح نگار ہیں۔ سموئیل جانسن (۱۷۰۹ء-۱۷۸۴ء Samuel Johnson,) کی سوانح عمری کے علاوہ جانسن پر معتبر تحقیقی کام کرنے کی بنا پر آپ کو Authority on Samuel Johnson بھی کہا جاتا ہے۔ آپ سوانح نگاری پر تحقیقی کام کے حوالے سے کافی معروف ہیں۔ فن سوانح نگاری کے حوالے سے انہوں نے ۱۹٦۲ء میں ایک کتاب *Biography as an Art* لکھی اور ۱۹۷۰ء میں *From Puzzles to Portraits: Problems of Literary Biographer* تصنیف کی۔

۴۷۔ مائیکل بینٹن (Micheal Benton) ۱۹۳۹ء میں پیدا ہوئے۔ یونیورسٹی آف ساؤتھ ایمپٹن کے ریٹائرڈ پروفیسر

ہیں۔ آپ بہت سی کتب کے مصنف ہیں۔ان کی موجودہ تحقیق کا محور ادبی بایو گرافی ہے۔ادبی بایو گرافی کے حوالے سے ان کی مذکورہ بالا تصنیف کے ۲۰۱۵ء۔ ۲۰۰۹ء تک ۲۲ ایڈیشنز شائع ہو چکے ہیں۔

۴۸۔ جارن ریوزن (۱۹۳۸ء، Jorn Rusen) جرمنی میں تاریخ اور تاریخی ثقافت کے ریٹائرڈ پروفیسر ہیں، ۱۹۹۷ء سے ۲۰۰۷ء تک وہ Institute for Advanced Study in Humanities at Science Centre of Northrhine-Weslfalia کے صدر رہے۔وہ اپنے تاریخ نویسی کے نظریات کے حوالے سے معاصر تاریخ دانوں میں ممتاز مقام کے حامل ہیں اور تاریخ نگاری کی تحقیق کے حوالے سے بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔

۴۹۔ ڈیوڈ کار (۱۹۴۰ء، David Carr) امریکہ کے مشہور محقق، فلسفی اور ایموری یونیورسٹی کے ریٹائرڈ پروفیسر ہیں۔ انیسویں اور بیسویں صدی کی یورپین فلاسفی، تاریخی فلسفہ اور ایڈمنڈ ہسل Edmund Hussel کے فلسفہ کے مختلف پہلوؤں کی کھوج ان کی تحقیق کے خاص میدان ہیں۔تاریخی فلسفہ اور تاریخ نگاری کی تحقیق کے حوالے سے بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔

۵۰۔ ڈیوڈ جولف (۱۹۳۹ء، David Jolliffe) یونیورسٹی آف آرکانسس (University of Arkansas) میں انگلش اور Curriculum and Instruction کے پروفیسر ہیں۔وہ ۱۳ کتابوں کے مصنف اور ایڈیٹر ہیں اور ۴۰ سے زیادہ مقالہ جات History and Theory اور Theory of Rhetoric کے موضوع پر لکھ چکے ہیں۔

۵۱۔ ڈی ایس مارگولیتھ (D.S Margoliouth)، *Muhammad and the rise of Islam* (نیو یارک ۱۹۲۹ء)، ص ۳۔

۵۲۔ محمد طفیل، اداریہ نقوش رسول نمبر (دسمبر ۱۹۸۳ء)، ص ۶۔

۵۳۔ سید عبداللہ، "فن سیرت نگاری پر ایک نظر" مشمولہ فکر و نظر، ص ۱۳۔

۵۴۔ ابوالحسن علی ندوی، "سیرت نگار کی ذمہ داریاں" مشمولہ نقوش، ۸۴۔

۵۵۔ الطاف فاطمہ، اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا (سندھ: اردو اکیڈمی، ۱۹۶۱ء)، ص ۲۷۔

باب دوم

اصولِ سیرت اور آقا ﷺ: تنقید و تجزیہ

باب دوم:

اصولِ سیرت اور آقا ﷺ: تنقید و تجزیہ

وقت کے ساتھ ساتھ جہاں مختلف کلاسیکی اسلامی علوم کی ترقی ہوئی وہاں سیرتی ادب میں بھی اضافہ ہوا جس نے فکری تحقیقات کے مختلف شعبوں کو تقویت بخشی۔ مثال کے طور پر سیرت نگاری نے قرآن، تفسیر، احادیث اور اسباب نزول وحی وغیرہ کے مطالعات میں اضافہ کیا۔ تقریباً چودہ سو سالوں سے سیرت رسول پاک ﷺ پر مختلف زبانوں میں مختلف انداز سے کتب لکھی جارہی ہیں اور آپ ؐ کی ذات پاک سے ہدایت و رہنمائی لی جارہی ہے۔ مختلف اوقات میں مختلف سیاسی و معاشی حالات، وہاں کے لوگوں کے تمدنی و معاشرتی اطوار اور اخلاقیات کے اثرات سیرت کے منہاج و رجحانات پر بھی پڑے۔ سیرت نگاری کے یہ بدلتے رجحانات انیسویں اور بیسویں صدی میں بہت سے نازک مراحل سے گزرے۔ انیسویں صدی میں مغرب کا جدید سائنسی انداز فکر، استعماریت کی بدولت دنیا بھر میں تیزی سے پھیلنا شروع ہوا۔ اس صورتحال میں مغربی فن و ثقافت اور تمدن و تہذیب کے مسلم دنیا پر بھی بہت گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ سلطنت عثمانیہ کے زوال اور سقوط بغداد سے لے کر دہلی کی تباہی تک، سیاسی، معاشرتی و اخلاقی انحطاط نے نہ چاہتے ہوئے بھی مسلمانوں کے دلوں میں مغرب کی اقتصادی و عسکری طاقت کے بارے میں تعریف و توصیف کا احساس پیدا کیا جس کی وجہ سے مسلم دنیا میں مغرب کے جدید سائنسی و فلسفیانہ نقطہ نظر کو بلا حیل و حجت تسلیم کر لیا گیا، چنانچہ مسلمانوں نے پوری اسلامی تہذیب کی سائنسی و منطقی انداز سے ترجمانی شروع کی۔ اس دور میں مستشرقین بھی آپ ﷺ کی حیات طیبہ پر لکھ رہے تھے، انہوں نے کچھ ایسے سوالات و اعتراضات اٹھائے جن کے جوابات دینا مسلمانوں کے لیے ناگزیر ہو گیا کیوں کہ اس دور کے مسلمان بھی دین کے بارے میں مختلف شکوک و شبہات کا شکار ہونے لگے تھے۔ اس اضطرابی حالت میں دعوتی و اصلاحی تحریکوں کا ایک باقاعدہ سلسلہ شروع ہوا اور سیرت نگاری میں نئے سائنسی و منطقی رجحانات و اسلوب کی بنیاد ڈالی گئی، تاکہ سیرت نبی اکرم ﷺ پر جو کچھ بھی لکھا جائے وہ قطعی مستند ہو اور غیر معتبر مواد کی وجہ سے پیدا ہونے والے اعتراضات کی بنیاد ہی ختم ہو سکے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر محمود احمد غازی لکھتے ہیں کہ:

> بیسویں صدی مسلمانوں میں تجدید اور احیا کی تحریکات کا دور ہے، بہت سی اسلامی اور دینی تحریکات مشرق، مغرب اور عرب و عجم میں سامنے آئیں، جن کی کوشش یہ تھی کہ اسلامی روایات کو زندہ کر کے مسلمانوں کا احیا کیا جائے۔ اسلامی معاشرہ اور ریاست کا احیا کیا جائے۔ قدیم اسلامی آئیڈیل کے مطابق مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تشکیل نو کی جائے۔ اس تجدیدی اور احیائی

ماحول میں سیرت نبی ﷺ پر ایک نئے انداز سے غور وخوض شروع ہوا۔ سیرت نبی ﷺ کے رول ماڈل ہونے کو نمایاں کیا گیا۔اس سے کام لے کر تجدیدی اور احیائی ادب نے سیرت میں ایک نئی معنویت پیدا کی۔[1]

اصول سیرت نگاری و منہج تحقیق:

منہج کے لغوی معنی " واضح راستہ، طریقہ اور روش " کے ہیں۔[2] اصطلاحی طور پر یہ ان قواعد و ضوابط کا مجموعہ ہوتا ہے جو مصنف کو ایک خاص سائنسی نقطہ نظر کی تشکیل کرنے اور ممکنہ نتیجے تک پہنچنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ مصنف کا مخصوص انداز ہوتا ہے جس میں وہ اپنے خیالات و احساسات بیان کرتا ہے۔ سیرت نگاری کے بھی مختلف مناہج اور اسالیب ہیں۔ مختلف اوقات میں مختلف مناہج و اسالیب اپنائے جاتے رہے ہیں۔ سیرت رسول اکرمؐ کسی عام شخص کی روداد حیات کا نام نہیں بلکہ آپ ﷺ کی ذات اقدس عالم انسانی کے لیے رہنمائی وہدایت کے ساتھ ساتھ مثالی نمونہ بھی ہے۔اس لیے سیرت نگاری کے دوران سیرت نگار کی طرف سے کسی بھی خامی اور کمزوری کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کی حیات مقدسہ پر کچھ بھی احاطہ تحریر میں لانے سے قبل ضروری ہے سیرت نگاری کے اسالیب اور اصول و ضوابط پہلے سے طے کر لیے جائیں۔ اصول و مصادر سیرت سے مراد ایسے اصول و ضوابط اور قوانین ہیں جو سیرت کو اچھی طرح سمجھنے اور پرکھنے میں کام آتے ہیں۔ کسی بھی سیرت نگار کے لیے سیرت نگاری سے پہلے اس کے متعین شدہ اصولوں اور واضح کردہ اسالیب سے واقفیت حاصل کرنا اشد ضروری ہے۔دور جدید میں سیرت نگار اپنی تصنیف کے آغاز میں اپنے اسلوب و منہج کی نشاندہی کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔[3] علامہ شبلی نعمانی نے سیرت النبی ﷺ کے مقدمے میں اپنے اسلوب کی وضاحت میں بیان کیا کہ واقعات سیرت کی جانچ پرکھ میں انہوں نے قرآن پاک کو سب سے مقدم رکھا ہے اور احادیث صحیحہ کو سیرت کی روایات کی نسبت زیادہ معتبر جانا ہے۔[4] کرم ضیا عمری اپنی تصنیف میں اپنے مقاصد کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ صرف اور صرف مستند اور صحیح ذرائع سے حاصل ہونے والی معلومات پر ہی اکتفا کریں گے۔[5] ابوالحسن ندوی اپنے اسلوب کی وضاحت میں بتاتے ہیں کہ وہ سیرت نگاری میں ابن ہشام اور زاد المعاد سے استفادہ کریں گے۔[6] سیرت نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے طرز تحریر، اسلوب نگارش اور اصول و طریق کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ قدما کے اسالیب و منہج کا تنقیدی تجزیہ کریں تاکہ اپنی تصنیف کو موجودہ دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر سکیں، چنانچہ سیرت رسول ﷺ کے تمام گوشوں کو اجاگر کرنے اور علوم سیرت میں نئی جہات متعارف کروانے کے لیے ضروری ہے کہ سیرت نگار جدید فن تحقیق سے آگاہ ہوں تاکہ سیرت نگاری کے عمل کو جدید خطوط پر استوار کیا جاسکے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید سیرت نگار مکمل ذمہ داری

سے اپنا فرض ادا کرتے ہوئے سیرت نبوی ﷺ کے مختلف پہلوؤں کو ہر طرح سے تحقیق کے ترازو میں تول کر صفحہ قرطاس پر منتقل کرتا ہے۔ اس سے نہ صرف سیرت طیبہ کے مطالعہ کی افادیت میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ اس موضوع پر بہت سے اذہان کے شکوک و شبہات کا ازالہ بھی ہو جاتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تمام تصانیف کو عصری ادب کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے تاکہ یہ دیکھا جائے کہ آیا ان تحریروں نے اپنے زمانے کی ضروریات پر غور کیا ہے یا نہیں؟ اس لیے سیرت نگار کے لیے ضروری ہے کہ اسے اس بات کا پورا احساس ہو کہ سیرت پاک میں پیش کیے گئے مواد کا قارئین کس طرح اپنی زندگیوں پر اطلاق کرتے ہیں اور سیرتی مواد کے مطالب اور مضمرات سے قارئین کس حد تک اپنے دینی و دنیوی معاملات کی تفہیم حاصل کر سکتے ہیں۔

قدیم سیرت نگاروں پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ انہوں نے زبانی روایات پر زیادہ انحصار کرتے ہوئے واقعات کی صداقت کو پرکھنے کی بجائے سنی سنائی باتوں پر زیادہ اعتبار کیا اور صرف اور صرف اپنا نام سیرت نگاروں کی "نورانی لڑی" میں شامل کرنے کے لیے تقلید کی روش اپنائی۔ اس اعتراض کو دور کرنے کے لیے معتبر سیرت نگاروں نے روایات کے رد و قبول کے حوالے سے کچھ اصول و ضوابط مقرر کیے، کیوں کہ اگر روایات کے رد و قبول کے اصول و ضوابط ملحوظ رہیں تو ماخذ کی صحت میں کسی قسم کا شبہ نہیں رہتا۔[7] اس بات پر زیادہ زور دیا گیا کہ سیرت نگاری میں مجتہدانہ اسلوب اپنایا جائے تاکہ سیرت پر جو کچھ بھی لکھا جائے وہ تحقیقی اعتبار سے مستند ہو، عصری اسلوب کے مطابق ہو اور آج کا انسان پیغمبر اسلام ﷺ کی مثالی حیات طیبہ کو قابل فہم سمجھے۔[8] اس سے نہ صرف صنف سیرت نگاری کا معیار بلند ہوا بلکہ سیرت نگاری کو مکمل فن کا درجہ بھی حاصل ہوا۔ سیرت کے مصادر و ضوابط کے موضوع پر مختلف علما کے مباحث ملتے ہیں مثلاً شبلی نعمانی نے اپنی تصنیف سیرت النبی ﷺ کے مقدمے میں ماخذ و مصادر سیرت اور اصول سیرت نگاری کا ذکر کیا ہے۔ عبد الرؤف دانا پوری نے اصح السیّر میں اصول سیرت نگاری بیان کیے ہیں۔ ڈاکٹر نثار احمد نے اپنے مقالے "نقوش سیرت" میں اور ڈاکٹر انور محمود خالد نے اردو نثر میں سیرت رسولؐ کے مقدمے میں مصادر و اسالیب سیرت پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ ڈاکٹر فاروق حماد نے مصادر سیرت النبویہ ﷺ میں سیرت کے اصول بیان کیے ہیں۔ زیادہ تر سیرت نگاروں نے سیرت نبوی ﷺ کے لیے دو اہم ماخذ قرآن و حدیث کو سب سے اہم گردانا ہے۔ کیوں کہ قرآن پاک میں آپ ﷺ کے اخلاق و کردار کی صحیح تصویر پیش کی گئی ہے اور کتب احادیث میں بھی آپ ﷺ کی ذات اقدس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ محدثین نے نبی اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ اور آپ ﷺ کے اعمال و افعال کی ترجمانی کے لیے جو اصول و ضوابط وضع کیے ان میں کسی قسم کی ترمیم یا اصلاح کی گنجائش نہیں ہے۔[9] ڈاکٹر حمید اللہ اس حوالے سے عربوں کی قدیم شاعری کو بھی اہم ماخذ سمجھتے ہیں۔

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی حیات و تعلیمات کے بارے میں دو بنیادی منبع مآخذ اور الحدیث
کے علاوہ آنحضور ﷺ کی زندگی کے بارے میں ارشادات و تفصیلات پر مشتمل اس دور کی
شاعری بھی معلومات کا قیمتی اور نادر ذریعہ ہے۔ جیسا کہ عربی کی ضرب المثل ہے کہ " شاعری
عربوں کی تاریخی دستاویزات کا محافظ خانہ ہے۔ [10]

زندہ علوم کو ترقی پذیر خیال کیا جاتا ہے کیوں کہ وہ وقت کے ساتھ ساتھ اپنی ارتقائی منازل طے کرتے ہیں اور مختلف اندرونی و بیرونی اثرات قبول کر کے مختلف اسالیب و رجحانات اختیار کرتے رہتے ہیں۔ علم سیرت نگاری مسلمانوں اور غیر مسلموں میں یکساں مقبول رہا ہے۔ یہ علم بھی زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے بہت متاثر ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں سیرت نگاری کا تقاضا ہے کہ صرف واقعات کے بیان پر ہی اکتفانہ کیا جائے۔ بیانِ واقعات و سوانح کا زمانہ گزر چکا کہ اس کا مقصد تکرارِ محض کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اب بیانیہ کو بھی تحلیل و تجزیہ کے عمل سے گزارنے کی ضرورت ہے اور یہی فن کا تقاضا بھی ہے۔ یہی تنقید و تجزیہ نئی معلومات کو پرانے ذخیرہ معلومات میں ضم کرنے میں معاون ہوتی ہے۔ اکیسویں صدی کے قاری کا علم ودانش بلند تر ہو چکا ہے۔ وہ شخصیت کی تعمیرِ نو اور عہد کی بازیافت چاہتا اور طلب کرتا ہے اور اگر وہ چاہے یا طلب نہ بھی کرے تو بھی فنی تقاضا ہے کہ مواد کو تحلیلی انداز اور تجزیاتی اسلوب میں پیش کیا جائے کیوں کہ اس صورت میں ذات و صفاتِ نبوی ﷺ اور کمالات و اکتساباتِ حضرت اقدس ﷺ کو ان کے صحیح تناظر و اسلامی پیش منظر میں پیش کیا جا سکتا ہے، اسی کے ذریعے رسولِ اکرم ﷺ کی ذات والا صفات کا علمی دفاع اور اسلام و دین کا مذہبی تحفظ بھی ممکن ہے۔ شخصی احوال کے ساتھ دینی اقدار اور تہذیبی معاملات کو یکجا کیا جا سکتا ہے۔ سماجی، اقتصادی، سیاسی اور دوسرے تمام انسانی امور و معاملات کو ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔ [11] دورِ حاضر میں انسانیت کی ترقی کے پیش نظر ہونے والی تبدیلیوں کے تقاضوں کے مطابق سیرت نگاری کے جدید اسلوب سے انکار ممکن نہیں، کیوں کہ آپ ﷺ کی حیات طیبہ کو عملی نمونہ بنانے میں ہی انسانیت کی فلاح مضمر ہے۔ ضروری ہے کہ آپ ﷺ کی ذات مبارکہ کو مذہبی حدود سے نکالا جائے اور سماجی، سائنسی، نفسیاتی، علمی اور ادبی حوالوں سے بھی دنیائے عالم میں روشناس کروایا جائے تاکہ جدید ذہن میں مذہبی اقدار سے بیزاری کی بجائے رغبت پیدا کی جا سکے اور اسلامی تعلیمات کو مزید دلائل کے ساتھ نسل نو تک منتقل کیا جا سکے، اس لیے سیرت نگاروں کے لیے لازم ہے کہ وہ عصری علوم سے کماحقہ واقفیت حاصل کریں تاکہ نئی نسل کی تربیت سیرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی روشنی میں کی جا سکے۔

اس باب میں آقا ﷺ کا تجزیہ سیرت کے اصول و قواعد کی روشنی میں کیا جارہا ہے۔ اس سے پہلے کہ محقق کے اخذ کردہ اصولِ سیرت نگاری کا تذکرہ کیا جائے، یہ ضروری ہے کہ معروف علما و محققین و ناقدین؛ مولانا شبلی

نعمانی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، ڈاکٹر حمید اللہ، ڈاکٹر سید عبد اللہ اور مستشرقین میں سے لیزلی ہیزلٹن کے وضع کردہ اصول سیرت نگاری سے کما حقہ واقفیت حاصل کر لی جائے۔

مولانا شبلی نعمانی کے اصول سیرت نگاری:

علامہ شبلی نعمانی کی مشہور سوانحی تصانف میں الفاروق، سوانح مولانا روم ، المامون، سیرت النعمان، الغزالی اورسیرت النبی ﷺ شامل ہیں۔ انہوں نے علمی، ادبی، تنقیدی، تاریخی، تعلیمی، فلسفیانہ اور مذہبی موضوعات پر مقالات لکھے جن کو مولانا سلیمان ندوی نے آٹھ جلدوں میں موضوع کے اعتبار سے مرتب کیا۔ مولانا کی تصنیف سیرت النبی ﷺ کی چھ ضخیم جلدیں ہیں۔ شبلی نے ابتدائی دو جلدیں لکھیں، باقی کی چار جلدیں ان کے شاگرد سید سلیمان ندوی نے ان کے انتقال کے بعد مکمل کیں۔ سیرت النبی ﷺ کے مقدمے میں مصادر و مناہج سیرت کے علاوہ اصول سیرت نگاری کے مباحث ملتے ہیں۔ مولانا شبلی نعمانی نے محدثین کے مسلمہ فن درایت کی بنیاد پر اصول سیرت مرتب کیے۔ ان سے پہلے کسی نے باقاعدہ طور پر سیرت نگاری کے فنی پہلوؤں کی طرف توجہ نہیں کی تھی، اس لیے محققین علامہ شبلی کی تصنف کو فنی لحاظ سے اردو سیرت نگاری کی پہلی کتاب گردانتے ہیں۔ علامہ شبلی نے اپنی تصنیف سیرت النبی ﷺ کے مقدمے میں سیرت نگاری کے جن اصول و قواعد کا ذکر کیا ہے وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ سب سے پہلے واقعہ کی تلاش قرآن مجید میں، پھر احادیث صحیحہ میں پھر عام احادیث میں کرنی چاہیے، اگر نہ ملے تو روایات سیرت کی طرف توجہ کی جائے۔

۲۔ کتب سیرت محتاج تنقیح ہیں اور ان کی روایات و اسناد کی تنقید لازم ہے۔

۳۔ سیرت کی روایتیں بااعتبار پایہ صحت، احادیث کی روایتوں سے فروتر ہیں۔ اس لیے بصورت اختلاف احادیث کی روایات کو ہمیشہ ترجیح دی جائے گی۔

۴۔ بصورت اختلاف روایات احادیث، ارباب فقہ و ہوش کی روایات کو دوسروں پر ترجیح ہو گی۔

۵۔ سیرت کے واقعات میں سلسلہ علت و معلول کی تلاش نہایت ضروری ہے۔

۶۔ نوعیت واقعہ کے لحاظ سے شہادت کا معیار قائم کرنا چاہیے۔

۷۔ روایت میں اصل واقعہ کس قدر ہے؟ اور راوی کی ذاتی رائے اور فہم کا کس قدر جز شامل ہے۔

۸۔ اسباب خارجی کا کس قدر اثر ہے؟

۹۔ جو روایت عام وجوہ عقلی، مشاہدہ عام، اصول مسلمہ اور قرائن حال کے خلاف ہو گی، لائق حجت نہ ہو گی۔

۱۰۔ اہم موضوع پر مختلف روایات کی تطبیق و جمع سے اس کی تسلی کر لینی چاہیے کہ راوی سے ادائے مفہوم میں تو غلطی نہیں ہوئی ہے۔

۱۱۔ روایات احادیث کو موضوع کی اہمیت اور قرائن حال کی مطابقت کے لحاظ سے قبول کر لینا چاہیے۔[12]

ابوالحسن علی ندوی کے جدید اصول سیرت نگاری:

سیرت کے موضوع پر آپ کی دو تصانیف ہیں، نبی رحمت ﷺ اور محسن عالم ﷺ۔ مولانا صاحب خود بیان کرتے ہیں کہ جب انہیں عربی زبان و ادب کا کچھ شوق پیدا ہوا تو ان کی ساری توجہ سیرت کے عربی مآخذ پر مرکوز ہو گئی۔ عربی کے مآخذ میں ابن ہشام کی کتاب السیرۃ النبویہ ﷺ اور امام ابن القیم کی زاد المعاد شامل ہیں۔ انہوں نے ان کتب کو روایتی انداز میں سرسری سا پڑھنے کی بجائے اپنے شب و روز ان ہی کتب کے ساتھ بسر کیے۔ ان کے بعد عربی اور انگریزی میں سیرت کی قدیم و جدید دستیاب کتب کا مطالعہ کیا۔ بقول مولانا صاحب، ان کتب سے منتشر خیالات کو ایسے جمع کیا جیسے چیونٹیوں کے منہ سے شکر کے دانے جمع کیے جائیں۔ مولانا صاحب نے آج کے سیرت نگار کے لیے یہ ضروری قرار دیا کہ اس کی تحریر صرف اور صرف تقلید اور عقیدہ پر ہی مبنی نہ ہو بلکہ اس کا بیرونی دنیا اور جدید ثقافت سے ہم آہنگ ہونا بھی از حد ضروری ہے کیوں کہ دور حاضر میں منطق کے صحیح اور قابل فہم اصولوں کی روشنی میں نبی اکرم ﷺ کے حالات زندگی غیر مسلموں کے سامنے پیش کرنا بھی سیرت نگاروں کی اولین ذمہ داری ہے۔ اس ضمن میں ان کا کہنا ہے کہ:

> یہ بات ہمیں کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ بہر حال اس نبی ﷺ کی سیرت ہے جس کو رحمت اللعالمین ﷺ بنا کر تمام انسانوں اور نوع انسانی کے تمام طبقوں کی طرف بھیجا گیا ہے، اس لیے اس طبقہ کے افراد کے لیے ممنوع یا مہر بند نہیں کیا جا سکتا جن کو حالات نے اس اسلامی و ایمانی ماحول میں نشو و نما حاصل کرنے کا موقع نہیں دیا اور تقدیر الٰہی کا فیصلہ ہوا کہ وہ غیر اسلامی ماحول میں ہی پیدا ہوں، وہیں ان کی نشو و نما ہے، پھر لطف خدا ان کی مساعدت کرے اور سیرت محمدی ﷺ کا کوئی معطر و جان نواز جھونکا اپنی دل آرائی اور مسیحائی کے ذریعہ ان کو اس جگہ سے اٹھا کر اسلام کے سایہ رحمت اور ایمان کی بارگاہ میں پہنچا دے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان غیر مسلموں کا حق سیرت پر ان مسلمانوں سے ہر گز کم نہیں جو پہلے ہی سے اسلام و ایمان کے سایہ رحمت میں ہیں۔[13]

ابوالحسن علی ندوی کے مرتب کردہ سیرت نگاری کے جدید قواعد و اسالیب درج ذیل ہیں۔

۱۔ سیرت کے لیے ضروری ہے کہ عصری و علمی اسلوب میں لکھی گئی ہو۔

۲۔ اس میں قدیم وجدید دونوں قسم کے مآخذ سے پورا استفادہ کیا گیا ہو۔

۳۔ سیرت کے اولین اور اصل مآخذ پر اس کی بنیاد ہو اور قرآن و حدیث سے اس میں انحراف نہ کیا گیا ہو۔

۴۔ انسائیکلوپیڈیا کی طرز پر نہ لکھی گئی ہو۔

۵۔ عقل وجذبات دونوں کی کارفرمائی ہو، عالمانہ بحث محبت و عشق کی کیفیت پر غالب نہ آجائے اور نہ ہی جذباتی و ایمانی عنصر عقل سلیم کے تقاضوں پر غالب آئے۔

۶۔ سیرت نگاری کے وقت نبوت محمدی ﷺ کے عہد اور ماحول کو نظر انداز نہ کرے۔

۷۔ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں عقل کے معیار اور تہذیب و تمدن کی سطح سے باخبر ہو۔

۸۔ سیرت نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ تاریخ و جغرافیہ اور تقابلی مطالعہ کے میدان میں جدید ترین مباحث و معلومات سے آگاہ ہو۔

۹۔ سیرت کے موضوع پر کتاب کی تصنیف میں کسی طرح کی دشواری، ابہام، معروضات قائم کرنے اور قیاس سے کام لینے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ آپ ﷺ کی سیرت سب سے مکمل ہے۔

۱۰۔ سیرت نگاری میں نئی نسل کے ذہن، ذوق، فہم اور اس کی نفسیات کی موجودہ سطح کا خیال رکھا گیا ہو۔

۱۱۔ نئے تقاضوں، ضرورتوں، موجودہ دور میں رائج طرز تحقیق اور طرز کلام کی پوری رعایت ہو۔

۱۲۔ ہر زمانے کے مروج اسلوب کا لحاظ رکھا جائے۔ [۱۴]

ڈاکٹر سید عبداللہ کے جدید اصول سیرت نگاری:

آپ نے سیرت نگاری پر باقاعدہ کوئی کتاب تصنیف نہیں کی لیکن سیرت نگاری کے حوالے اپنے ایک تنقیدی مضمون "فن سیرت نگاری پر ایک نظر" مشمولہ فکر و نظر میں انہوں نے سیرت نگاری اور سوانح نگاری کا موازنہ کرتے ہوئے جدید اصول سیرت نگاری کا تعین کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب سیرت نگاری اور سوانح عمری میں فرق واضح کرتے ہوئے فن سیرت نگاری پر بحث کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ:

> آنحضرت ﷺ کے سیرت نگاروں کا سلسلہ بڑا طویل ہے، قدیم بھی اور جدید بھی، لیکن مثالی سیرت نگاری کے نمونے کم ملتے ہیں۔ اس لیے کہ اس کے اصول وضوابط کے بارے میں خاصا غلط مبحث ہے۔ خصوصاً جدید تعلیم یافتہ طبقے کا تصور اس نوعیت کے بارے میں دھندلا ہے۔ میں نے اس لیے مناسب خیال کیا کہ دور جدید کے لہجے میں چند باتیں فن سیرت نگاری کے بارے میں عرض کروں۔ [۱۵]

اس حوالے سے آپ کے مرتب کردہ سیرت نگاری کے جدید قواعد واسالیب درج ذیل ہیں:

۱۔ تاریخ وسنین کے سیاق وسباق میں آپ ﷺ کے قول و فعل کی صحیح ترین روایت کا بیان ہو۔

۲۔ فن سیرت میں واقعات کے پرکھنے کے لیے حدیث کی روایت اور اس پر عقلی و تجربی درایت کا طریقہ استعمال کیا جائے۔

۳۔ اسرار نبوت ﷺ کی بنیاد اولین اور اصل مآخذ یعنی قرآن مجید پر ہو اور اس کی تعبیر میں قرآن وحدیث سے سر موانحراف نہ کیا جائے۔

۴۔ صداقت کی جستجو کے لیے ہر ممکن ذرائع کا استعمال کیا جائے اور قدیم و جدید دونوں مآخذ سے استفادہ کیا جائے۔

۵۔ جدید سوانح نگاری کی طرح سیرت نگاری میں ہو بہو تصویر کشی نہ ہو۔

۶۔ جدید سوانح نگاری کی طرح نبی اکرم ﷺ کو عام بشر سمجھ کر ان کی طرف کوئی کمزور بات منسوب نہ کی جائے۔

۷۔ بااصول سیرت نگاری میں مدح طرازی، مبالغہ آرائی اور ابہام و قیاس سے اجتناب کیا جائے۔

۸۔ سائنٹفک بایو گرافی میں صداقت اور خلوص کا خیال رکھا جائے۔

۹۔ سیرت کو ادبی قصہ یا ناول کی طرح نہیں ہونا چاہیے۔

۱۰۔ سیرت چونکہ برتر بایو گرافی ہے لہٰذا اس میں واقعات کے محرکات بھی برتر انسانیت کے پیمانے پر ناپے جائیں۔ ان کے نزدیک سیرت نگاری ایک ارفع واشرف تشکیلی عمل ہے اسے جدید تصور کی بایو گرافی سمجھنا غلط ہے، کیوں کہ اسی مغالطے کی وجہ سے نبی اکرم ﷺ کے بہت سے جدید سوانح نگاروں نے ٹھوکر کھائی ہے۔

۱۱۔ سیرت نگاری میں ظاہری قول و فعل کی بنیاد پر باطن کے محرکات کا سراغ لگانا جائز نہیں، سیرت میں ان عناصر کی تلاش بے محل اور بے جا ہے۔

۱۲۔ سیرت نگاری میں تخیل آرائی اور تصویر بافی کی کوئی گنجائش نہیں۔[۲۱]

ڈاکٹر حمید اللہ کے اصول سیرت نگاری:

آپ نے سیرت مصطفی ﷺ پر باقاعدہ کوئی کتاب نہیں لکھی بلکہ سیرت کے حوالے سے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی مقالہ جات اور مضامین لکھے، جو بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ فرانسیسی زبان میں ان کی ایک مربوط کتاب محمد رسول اللہ ﷺ ہے۔ اپنی تمام عمر سیرت کے موضوع پر تحقیق کرنے میں بسر کرنے پر آپ کو سیرت

نگاری کا "امام" اور "مجدد" کہا جاتا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی سے شائع ہونے والے اردو دائرہ معارف اسلامی میں بھی سیرت سے متعلقہ مختلف عنوانات سے آپ کے مقالات موجود ہیں۔

> عام سیرت نگار کتب حدیث، سیرت و مغازی کی روایات کی جانچ پڑتال، ان کی تطبیق اور ان کی صحت و ضعف پر داد تحقیق دیتے ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے ان مصادر کے ساتھ ان مآخذ سے بھی استفادہ کیا جو بظاہر غیر متعلقہ لگتے ہیں، جیسے قدیم جاہلی ادب، کتب انساب و سوانح اور سفر نامے وغیرہ۔ سیرت پر ان کا ابتدائی کام مقالات کی صورت میں ہے، جو عہد نبوی ﷺ کے مختلف پہلوؤں کی توضیح و تشریح پر مبنی ہے۔ ان کی حیثیت متعلقہ موضوع پر معلومات کی توضیح و تشریح اور ترتیب و تعبیر ہے۔ ہر مقالہ مستقل بالذات تصنیف کا درجہ رکھتا ہے۔ تحقیق کا یہ اسلوب مغرب کا معروف اسلوب ہے۔ مقالات کے موضوعات اور ان کی تعداد ہمیشہ محققین کے مقام و مرتبہ کا پتہ دیتے ہیں۔[۱۷]

ڈاکٹر صاحب سوانح نگار کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں کہ اس میں غیر معمولی خوبیاں موجود ہوں۔ اس حوالے سے ان کا کہنا ہے کہ:

> ایک عام آدمی مثلاً بادشاہ، شاعر، فلسفی، انجینئر، جج، متقی وغیرہ کی سوانح حیات کے مقابلے میں رب تعالیٰ جل شانہ کے کسی پیغمبر کی سوانح حیات میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ پیغمبر کی سوانح میں نہ صرف فانی باتیں ہوتی ہیں جو کہ دوسرے عام فانی انسانوں میں مشترک ہوتی ہیں بلکہ اس میں غیر معمولی حقائق بھی ہوتے ہیں، جیسا کہ رب تعالیٰ کی طرف سے وحی، الہام، معجزات اور دوسرے عوامل جن سے عام لوگ ناواقف اور ناآشنا ہوتے ہیں، اور پھر جب رب تعالیٰ جل شانہ کے پیغمبر میں ایک ہی وقت میں کئی خوبیاں ہوں تو سوانح نگار میں بھی غیر معمولی خوبیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔[۱۸]

آپ نے سیرت نگاروں کے لیے درج ذیل اصول لازمی قرار دیے ہیں۔

۱۔ سوانح نگار موضوع کو غیر جانبدارانہ اور واقعیت پسندانہ گہرائی اور گیرائی کے ساتھ سمجھنے کے لیے مخلصانہ ہمدردی اور اشتیاق رکھتا ہو۔

۲۔ وہ لازمی طور پر یہ جانتا ہو کہ متعلقہ ملک کی قدیم تاریخ کیا ہے، تاکہ وہ اپنے ہیرو کے کاموں اور کارناموں کی بھرپور تعریف و توصیف کر سکے۔

۳۔ وہ اس دور کی بین الاقوامی تاریخ بھی جانتا ہو تاکہ عالمی تاریخ میں اسے محمد ﷺ کی جدوجہد اور کوشش و کاوش کے پس منظر اور نتائج کا علم ہو سکے۔

۴۔ وہ سوشیالوجی (عمرانیات) کا ماہر ہو تا کہ اسے پتہ چل سکے کہ آپ ﷺ نے اپنے پیروکاروں کی تہذیب و تمدن کا معیار کس طرح بلند کیا۔

۵۔ وہ ادب سے واقفیت رکھتا ہو تا کہ اسے قرآن الحکیم کی غیر معمولی قدر و قیمت کا علم ہو سکے۔

۶۔ وہ عسکری سائنس جانتا ہو تا کہ اسے سپہ سالار حضرت محمد ﷺ کی فاتحانہ صلاحیتوں سے آگاہی ہو۔

۷۔ وہ نفسیات سے شناسا ہو تا کہ اسے مشرف بہ اسلام ہونے والوں میں قبول اسلام کی وجہ سے ذہنی و قلبی تبدیلی سے شناسائی ہو۔[۱۹]

لیزلی ہیزلٹن (Lasely Hezeltan) کے اصول سیرت نگاری:

نبی اکرم ﷺ کی ذات مبارکہ پر لکھنے والوں میں ایک بڑی تعداد ان مستشرقین کی بھی ہے جو غیر مسلم ہونے کے باوجود سیرت نبی کریم ﷺ اور اسلام کے موضوع سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ان میں سے کچھ تو ایسے ہیں جن کی تصانیف مذہبی تعصب کا نمونہ نظر آتی ہیں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان غیر مسلم محققین کی بھی کمی نہیں جنہوں نے اسلامی علوم کے مطالعہ میں انتہائی سنجیدگی کا مظاہرہ کیا اور اسلام کے بارے میں اپنے تئیں صحیح معلومات کو لوگوں تک پہنچایا۔

سنجیدہ مغربی محققین کی تصانیف اور ان کے اپنائے ہوئے اصول سیرت نگاری سے واقفیت حاصل کرنا اس لیے بھی ضروری ہے تا کہ ان کی نظر سے نبی پاک ﷺ کی زندگی کو جانچنے کا موقع مل سکے اور نبی ﷺ کے زمانے کے حالات و واقعات کو عقلی بنیادوں پر پرکھ کر، جدید تحقیقی و سائنسی انداز سے ترتیب دے کر دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکے۔

سیرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر لیز لی ہیزلٹن کی تصنیف *The First Muslim* کو نہ صرف مسلمانوں، بلکہ غیر مسلم طبقے میں بھی بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ Ted Talks کے فورم سے انہوں نے اپنے ایک لیکچر میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کی نبی کریم ﷺ کی سیرت پاک پر لکھنا کوئی آسان کام نہیں، ان کا کہنا ہے کہ:

> کسی کی داستان حیات لکھنا مشکل کام ہے۔ یہ ایک انجان منزل کا سفر ہے، جو آپ کسی اور کی زندگی میں کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ منزلیں جو آپ نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ رکھی ہوتیں، وہ منزلیں جہاں جا کر بھی آپ کو یقین نہیں آتا کہ آپ وہاں جا چکے ہیں۔ خصوصاً اس صورت میں جب لکھنے والا مجھ جیسا لادین یہودی ہو اور جس ہستی کی داستان حیات لکھی جا رہی ہو وہ محمد ﷺ کی ہو۔[۲۰]

ان کا خیال ہے کہ ان واقعات سیرت کی جانچ پرکھ کا کام زیادہ مشکل ہوتا ہے جن کے بارے میں مختلف روایات سامنے آتی ہیں، ان سب روایات کو بیان کرنا سیرت نگار کی تصنیف کی چاشنی کو ختم کر دیتا ہے اور جدید ذہن کے حامل قارئین ترقی یافتہ تاریخی شعور کے حامل ہونے کی وجہ بار بار دہرائی جانے والی روایات سے بیزاری کا شکار بھی ہو سکتے ہیں، اس لیے ان روایات میں سے درست کے انتخاب کا معاملہ سیرت نگار کی اپنی فہم و فراست اور نقطہ نظر کا محتاج ہوتا ہے، جس کے لیے اسے بے انتہا تنقیدی بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ نے باقاعدہ طور پر سیرت نگاری کے اصول وضع نہیں کیے۔ نہ ہی اپنی تصنیف میں ان کا تفصیلاً تذکرہ کیا ہے، لیکن مصنفہ نے خود جس انداز سے سیرت کی روایات کی چھان پھٹک کے دوران تحقیق و تنقید سے کام لیا، اپنی تصینف میں اس کا طریقہ کار واضح طور پر بیان کیا ہے۔ انہوں نے روایات سیرت طیبہ ﷺ کے سلسلے میں اصول درایت سے بھی کام لیا ہے۔ اپنی تصنیف کو دیانت داری کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے جن اصول و ضوابط کا خیال رکھا ہے، ہر سیرت نگار کے لیے وہ مشعل راہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ لیزلی ہیزلٹن اگرچہ غیر مسلم ہیں، لیکن تمام واقعات سیرت کا غیر جانبداری سے تجزیہ پیش کیا ہے اور ماہر نفسیات ہونے کے ناطے ہر واقعے کا تاریخی، معاشرتی، اور نفسیاتی طور پر تجزیہ کیا ہے۔

ذیل میں وہ اصول پیش کیے جا رہے ہیں جو کہ مصنفہ سیرت نگار کے لیے ضروری قرار دیتی ہیں۔

۱۔ سیرت نگار کا یہ چیلنج ہے کہ وہ حقیقی معلومات تک رسائی حاصل کرے، جو کہ بہت مشکل کام ہے، کیوں کہ زیادہ تر معلومات تراجم کی شکل میں ہیں، اور ظاہر ہے کہ ہر ترجمہ نگار کے اپنے نقطہ نظر کے مطابق ہیں۔

۲۔ سیرت نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ اصل تاریخ جو کہ در حقیقت رونما ہوئی، اور عقیدت مندانہ مواد کے مابین فرق کی وضاحت کرے۔

۳۔ مشرق وسطیٰ کی تاریخ، تقابلی مذاہب اور ادب سے استفادہ کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔

۴۔ معاشرتی علوم میں ہونے والی حالیہ علمی تحقیق سے واقفیت رکھتا ہو۔[۲۱]

اصول سیرت نگاری: نظری ڈھانچہ

مندرجہ بالا علما و محققین و ناقدین کے وضع کردہ اصول سیرت نگاری کو مد نظر رکھتے ہوئے محقق نے کچھ اصول سیرت نگاری اخذ کیے ہیں۔ ان اخذ کردہ اصول سیرت نگاری کی مختلف عنوانات کے تحت درجہ بندی کی گئی ہے تاکہ دوران تحقیق کتاب آقا ﷺ میں سیرت کے عناصر کا تجزیہ کرنے میں آسانی ہو جائے۔

محقق کے اخذ کردہ اصول سیرت نگاری درج ذیل ہیں:

مآخذ و مصادر:

۱۔ سب سے پہلے واقعہ کی تلاش قرآن مجید میں، پھر احادیث صحیحہ میں پھر عام احادیث میں کرنی چاہیے، اگر نہ ملے تو روایات سیرت کی طرف توجہ کی جائے، نیز اسرار نبوت ﷺ کی تعبیر میں بھی قرآن و حدیث سے سر مو انحراف نہ کیا جائے۔

۲۔ کتب سیرت محتاج تنقیح ہیں اور ان کی روایات واسناد کی تنقید لازم ہے۔

۳۔ فن سیرت میں واقعات کے پرکھنے کے لیے حدیث کی روایت اور اس پر عقلی و تجربی درایت کا طریقہ استعمال کیا جائے۔

۴۔ صداقت کی جستجو کے لیے ہر ممکن ذرائع کا استعمال کیا جائے اور قدیم و جدید دونوں مآخذ سے استفادہ کیا جائے۔

اسلوب بیان:

۱۔ سیرت کے لیے ضروری ہے کہ عصری و علمی اسلوب میں لکھی گئی ہو اور اس میں ہر زمانے کے مروج اسلوب کا لحاظ رکھا جائے۔۔

۲۔ سیرت نگار ادب سے واقفیت رکھتا ہوتا کہ اسے قرآن الحکیم کی غیر معمولی قدر و قیمت کا علم ہو سکے۔

تخیل آرائی/تصویر بافی:

۱۔ انسائیکلوپیڈیا کی طرز پہ نہ لکھی جائے نیز ملحوظ رہے کہ روایت میں اصل واقعہ کس قدر ہے؟ اور راوی کی ذاتی رائے اور فہم کا کس قدر جزو شامل ہےَ۔

۲۔ عقل و جذبات دونوں کی کار فرمائی ہو، عالمانہ بحث محبت و عشق کی کیفیت پر غالب نہ آجائے اور نہ ہی جذباتی و ایمانی عنصر عقل سلیم کے تقاضوں پر غالب آئے۔

۳۔ سیرت کے موضوع پر کتاب کی تصنیف میں کسی طرح کی دشواری، ابہام، معروضات قائم کرنے اور قیاس سے کام لینے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ آپ ﷺ کی سیرت سب سے مکمل ہے۔

۴۔ بااصول سیرت نگاری کو ادبی قصہ یا ناول کی طرح نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی جدید سوانح نگاری کی طرح سیرت نگاری میں ہو بہو تصویر کشی ہو۔

۵۔ جدید سوانح نگاری کی طرح نبی اکرم ﷺ کو عام بشر سمجھ کر ان کی طرف کوئی کمزور بات منسوب نہ کی جائے۔

۶۔ سیرت چونکہ برتر بایو گرافی ہے لٰہذا اس میں واقعات کے محرکات بھی برتر انسانیت کے پیمانے پر ناپے جائیں۔

عہد نبوی ﷺ کے ماحول سے واقفیت:

۱۔ سیرت نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ سیرت نگاری کے وقت نبوت محمدی ﷺ کے عہد اور ماحول کو نظر انداز نہ کرے۔

۲۔ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں عقل کے معیار اور تہذیب و تمدن کی سطح سے باخبر ہو۔

۳۔ معاشرتی علوم میں ہونے والی حالیہ علمی تحقیق سے واقفیت رکھتا ہو۔

۴۔ سیرت نگار سوشیالوجی (عمرانیات) کا ماہر ہو تاکہ اسے پتہ چل سکے کہ آپ ﷺ نے اپنے پیروکاروں کی تہذیب و تمدن کا معیار کس طرح بلند کیا۔

سیرت نگاری اور دیگر علوم میں تعلق کی اہمیت سے آگاہی:

۱۔ سیرت نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ تاریخ و جغرافیہ اور تقابلی مطالعہ کے میدان میں جدید ترین مباحث و معلومات سے آگاہ ہو۔

۲۔ وہ لازمی طور پر یہ جانتا ہو کہ متعلقہ ملک کی قدیم تاریخ کیا ہے، تاکہ وہ اپنے ہیرو کے کاموں اور کارناموں کی بھرپور تعریف و توصیف کر سکے۔

۳۔ وہ اس دور کی بین الاقوامی تاریخ بھی جانتا ہو، تاکہ عالمی تاریخ میں اسے محمد ﷺ کی جدوجہد اور کوشش و کاوش کے پس منظر اور نتائج کا علم ہو سکے۔

۴۔ وہ عسکری سائنس جانتا ہو تاکہ اسے سپہ سالار حضرت محمد ﷺ کی فاتحانہ صلاحیتوں سے آگاہی ہو۔

۵۔ وہ نفسیات سے شناسا ہو تاکہ اسے مشرف بہ اسلام ہونے والوں میں قبول اسلام کی وجہ سے ذہنی و قلبی تبدیلی سے شناسائی ہو۔

معاصر عہد سے ہم آہنگی:

۱۔ سیرت نگاری میں نئی نسل کے ذہن، ذوق، فہم اور اس کی نفسیات کی موجودہ سطح کا خیال رکھا گیا ہو۔

۲۔ نئے تقاضوں، ضرورتوں، موجودہ دور میں رائج طرز تحقیق اور طرز کلام کی پوری رعایت ہو۔

آقاﷺ پر اصولِ سیرت نگاری کااطلاق:

ذیل میں مندرجہ بالا اصولِ سیرت نگاری کا آقاﷺ کتاب پر اطلاق کیا جارہا ہے۔

مآخذ و مصادر:

مآخذ و مصادرِ سیرت پر جدید اردو سیرت نگاروں کی تحقیقات و نگارشات کے مطالعات سے پتا چلتا ہے کہ سیرت نگاری کے لیے سب سے مستند ماخذ قرآن مجید ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ محض قرآن پاک کی آیات کی مدد سے سیرت نگاری کی مربوط تصنیف ممکن نہیں۔اس حوالے سے ڈاکٹر ایس ایم زمان چشتی نقوشِ سیرت میں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ قرآن پاک میں بے شک ایسی بہت سی آیات موجود ہیں، جو حضورِ اکرم ﷺ کی حیاتِ مقدسہ کو نمایاں کرتی ہیں، لیکن کتبِ احادیث اور کتبِ سیّر کے بغیر آپ ﷺ کی سوانح پاک کی مکمل طور پر تاریخ وار ترجمانی تقریباً ناممکن ہے، "[۲۲]

لیکن کتب سیّر کے حوالے سے مولانا شبلی نعمانی ہماری توجہ حافظ ابنِ حجر کے استادِ محترم، حافظ زین الدین عراقی کے شعر کی طرف مبذول کرواتے ہیں۔

ولیعلم الطالب ان السیرا
تجمع ماصح و ما قدانکرا [۲۳]

اس شعر میں شاعر سیرت نگاری کے ضمن میں ایک نازک مرحلے کی طرف سیرت نگار کو متوجہ کرتے ہیں کہ سیرت نگاری میں تحقیق و تنقید سے کام لینا از حد ضروری ہے، کیوں کہ سیرت نگاری میں صحیح اور ضعیف، دونوں طرح کی روایتیں بیان کر دی جاتی ہیں۔ آقاﷺ کتاب میں بھی مصنف نے سیرت کے واقعات کی نوعیت کے حوالے سے قرآنی آیات کو پیش کیا ہے۔ بہت سے واقعات کی تاویل میں انہوں نے قرآنی آیات سے استفادہ کیا ہے، جن میں سے اکثر کا صرف اردو ترجمہ ہی دیا ہے۔ انجیل، زبور، تورات اور ہندوؤں کی مقدس کتب سے بھی حوالے اردو میں ہی درج کیے ہیں لیکن ان تراجم کے لیے انہوں نے کون سی کتب کا مطالعہ کیا، اس کا ذکر کہیں نہیں کرتے۔

احادیث کی اہم کتب میں سے زیادہ تر ابنِ کثیر اور ابن ہشام کے حوالے دیے ہیں، دیگر کتبِ احادیث کے حوالے بھی درج ہیں۔ مثلاً صحیح مسلم، صحیح بخاری، ترمذی، نسائی وغیرہ۔ اس حوالے سے اگر آقاﷺ کتاب کے انتساب پر نظر ڈالی جائے، تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس میں بھی مصنف نے قرآن پاک کا حوالہ دے کر گویا اپنے الفاظ کو معتبر کر دیا ہے۔ مصنف کے الفاظ ہیں:

قرآن مجید کے مطابق، دنیا کی برگزیدہ ترین مقدس خاتون، سیدہ مریم علیہ السلام کے بیٹے، عظیم
رسول اللہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام جنہوں نے میرے آقاﷺ عظیم ترین رسول آخر
حضرت محمدﷺ کے آنے کی بشارت دی۔[۲۴]

حیرت کی بات ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے اپنی تصنیف کی ابتدا کرنے کے بعد مصنف نے ابتدائی ابواب میں کہیں بھی کسی واقعہ کی تصدیق یا توثیق کے لیے کسی آیت تک کا حوالہ نہیں دیا۔ آیتِ قرآنی تو کجا، کتبِ احادیث یا سیرتی تصنیف کا حوالہ بھی نظر نہیں آتا، البتہ حضورِ اکرمﷺ کے ذکرِ پاک کا تذکرہ جب زبور، توریت، انجیل اور ہندوؤں کی مقدس کتب سے کیا تو ان کے حوالے دیے اور ان کتب کے صفحہ نمبر بھی درج کیے۔ لکھتے ہیں کہ موجودہ تورات کی ایک آیت ملاحظہ ہو:

"خداوند سینا سے آیا، ساعیر سے ان پہ آشکار ہوا اور وہ کوہ فاران سے جلوہ گر ہوا۔"[۲۵]

پھر تورات کی اسی آیت کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

کوہ سینا پہ تو اللہ کا کرم حضرت موسیٰ علیہ السلام پہ ہوا۔ ہم کلام ہوا۔ ساعیر فلسطین کا وہ مقام ہے، جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پہ رحمتِ خداوندی جلوہ گر ہوئی، جہاں ان کی ولادت ہوئی اور پھر ان دونوں جلیل القدر انبیاء علیہم السلام کے بعد "فاران" کی پہاڑیوں پر اللہ کی صفت احدت اور فردیت کا ظہور ہوا۔ فاران کہاں ہے؟ مکہ میں۔ جبلِ نور اسی کا حصہ ہے۔ غارِ حرا اسی میں ہے۔ یہ نہیں کہ یہ نام مکہ والوں نے بعد میں رکھ لیا۔ صدیوں سے یہی نام تھا، فاران۔[۲۶]

زبور کی آیت کے لیے ابنِ کثیر کا حوالہ دیا۔[۲۷] مقدس آسمانی کتب میں آقاﷺ کے ذکرِ پاک کی موجودگی کو سورۃ البقرہ کی آیت کی مدد سے ثابت کیا۔ لکھتے ہیں:

یوں ہی تو نہیں قرآن پاک میں خدا نے ارشاد فرمایا:

وہ لوگ جنہیں کتاب دی تھی، وہ اسے ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو، بے شک ان میں سے کچھ لوگ حق کو چھپاتے ہیں، حالانکہ وہ جانتے ہیں۔[۲۸]

ہندوؤں کی مقدس کتب میں بھی آقاﷺ کا ذکر تفصیل سے بیان کیا۔ لکھتے ہیں کہ:

آقاﷺ کے بارے میں ذکر ہندوؤں کے چاروں ویدوں میں ہے۔ ہندوؤں کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے وید، اتھر وید میں آپﷺ کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔۔۔ آقاﷺ کی صفات پہ ان کے چودہ منتر ہیں۔ جو اب بھی ہندو مہنت سب سے زیادہ پڑھتے ہیں۔[۲۹]

اپنی بات کی تصدیق کے لیے کہتے ہیں:

مقدس اتھر وید، کانڈ ۲۰، سوکت ۱۲۷، منترا تا ۱۶ ۔[۳۰]

ابو لہب کی نبی پاک ﷺ کی شان میں کی گئی گستاخی کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے سورہ لہب نازل فرمائی۔اس واقعے کے بیان کرنے کے بعد آیاتِ قرآنی سے اپنی بات کی توثیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

ابو لہب آقا ﷺ کے پڑوس میں رہتا تھا۔وقت بے وقت وہ آقا ﷺ کی شان میں گستاخیاں کرنے لگا۔آقا ﷺ نے ابو لہب کی دی ہوئی کسی گالی کا کوئی جواب نہ دیا، مگر آقا ﷺ کا رب، اپنے محبوب کی شان میں کی گئی کوئی گستاخی کیسے برداشت کرتا۔آسمان سے فرشتہ اترااور خدا نے ابو لہب کی بد تمیزی کے جواب میں کلام نازل کیا۔

"ٹوٹ جائیں ابو لہب کے ہاتھ اور وہ ہلاک ہو، نہ اس کا مال اس کے کام آیااور نہ وہ جو اس نے کمایا، وہ جلد بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہو گا۔اور اس کی جورو بھی جو ایندھن سر پہ اٹھائے پھرتی ہے۔اس کے گلے میں مونج کی رسی ہو گی۔"(قرآن، سورۃ لہب: ۵۔۱) [۳۱]

اس کے بعد کے واقعات میں ہمیں جابجا آیاتِ قرآنی اور احادیث کے حوالے نظر آتے ہیں، لیکن اکثر حوالوں میں آیت نمبر موجود نہیں۔ حضرت ابو زر غفاری کی آقا ﷺ سے عقیدت اور فرماں برداری بیان کرتے ہوئے سورۃ حمزہ کی آیت کا حوالہ تو دیتے ہیں مگر آیت نمبر نہیں بتاتے اور نہ ہی آقا ﷺ کے فرمان کی تصدیق کے لیے کسی حدیث یا سیرت کی تصنیف کا حوالہ دیتے ہیں۔لکھتے ہیں :

حرم کی دیوار سے ٹیک لگائے آقا ﷺ نے ایک بار قرآن پاک کی سورۃ حمزہ کی ایک آیت پڑھی :

"رب کعبہ کی قسم قیامت کے دن یہی لوگ بڑے خسارے میں ہوں گے۔"

سیدنا ابوذر سہم گئے۔ڈر گئے سوچا کہ کہیں یہ بات میرے بارے میں تو نہیں ۔عرض کی آقا ﷺ۔یہ بدنصیب کون ہیں ؟فرمایا:

"جو زیادہ دولت مند ہیں سوائے ان کے جو آگے، پیچھے، دائیں، بائیں سب طرف خرچ کرتے ہیں۔"

ساری عمر انہیں وہ آیت اور آقا ﷺ کی بتائی ہوئی تفسیر یاد رہی۔ ساری عمر ان کا اثاثہ چار بکریوں، ایک خچر، ایک اونٹ کے بالوں کے کمبل سے بنی خستہ جھگی اور ایک پیالے سے زیادہ نہ ہوا۔ [۳۲]

اس واقعہ کی توثیق اگرچہ قرآن پاک سے کی گئی، مگر آیت نمبر نہ بتا کر گویا معلومات کو ادھورا چھوڑ دیا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مصنف واقعے کی روانی پر بعض اوقات حوالوں کو قربان کر دیتے ہیں۔حبشہ کی طرف مسلمانوں کی ہجرت کے بعد نجاشی کے دربار میں ، نجاشی کی خواہش پر حضرت جعفر طیار کی طرف سے کی گئی سورۃ المریم کی تلاوت کا واقعہ بیان کرتے ہوئے اس سورہ کی ان تمام آیات کا تفصیلی ذکر کیا جو تلاوت کی گئی تھیں، لیکن

آیات کے نمبر یہاں بھی بیان نہیں کیے گئے۔ یہ پتا نہیں چلتا کہ آیت نمبر ا سے لے کر کس آیت تک تلاوت کی گئی۔ ضروری نہیں کہ مصنف کی تحریر کردہ سیرت کی کتاب کا صرف اہلِ علم یا حافظِ قرآن حضرات ہی مطالعہ کریں گے۔ سطحی علم رکھنے والا انسان یقیناً آیات کی تصدیق کے لیے مشکل سے دوچار ہوگا۔ حضرت ابو طالب کے آخری لمحات میں کلمہ طیبہ پڑھنے کا واقعہ بیان کرنے کے بعد ابنِ ہشام اور ابنِ کثیر کا نامکمل سا حوالہ دیا۔ لکھتے ہیں:

> سیدنا ابو طالب کے آخری کہے ہوئے بول سن کے سیدنا عباس آقاﷺ کی طرف مڑے، بولے،
> "بھتیجے آپ جس کلمے لا الہ الا اللہ کا کہہ رہے تھے، وہی ابو طالب نے آخری سانس میں کہا ہے"۔ (ابنِ ہشام اور ابنِ کثیر) [۳۳]

سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہ کی جدائی کے حوالے سے آقاﷺ کے دکھی ہونے کا ذکر کیا تو اس سلسلے میں احادیثِ کتب مثلاً بخاری، مسلم، ترمذی اور نسائی کا حوالہ دیا مگر ان کتب میں کہاں یہ روایات بیان ہوئی ہیں اس کی تفاصیل بیان کرنے سے اجتناب کیا۔ اسی طرح واقعہ معراج کے بیان میں اگرچہ قرآنی آیات کا حوالہ تو دیا [۳۴] مگر کتبِ احادیث یا سیرت کی کسی بھی روایت کا ذکر کرنا بھی مناسب نہ سمجھا۔ عبداللہ ابن ابی کی آقاﷺ سے دشمنی اور منافقت کے تذکرے میں لکھتے ہیں:

> آقاﷺ تو امن کے داعی تھے۔ قرآن کا واضح حکم تھا۔
> لا اکراہ فی الدین
> "دین میں کوئی جبر نہیں۔" [۳۵]

اس آیت، بلکہ آیت کے ٹکڑے کا حوالہ نہ دینا مصنف کے غیر محتاط رویے کی عکاسی کرتا ہے۔ سیرت نگاری اس طرح کے غیر محتاط رویے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ ان کا یہ انداز ان کے اپنے دعوے کے برعکس دکھائی دیتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سیرت کی اس تصنیف کے ذریعے وہ مغربی دنیا میں آقاﷺ کا پیغام پہنچانے چلے ہیں، [36] لیکن کوئی بھی نو مسلم یا غیر مسلم ان واقعات کو پڑھے گا تو وہ یقیناً ان آیات یا سورہ کے حوالہ جات کے معاملے میں تشنگی محسوس کرے گا۔

جہاں تک بات ہے کتبِ سیرت کی محتاجِ تنقیح ہونے کی اور ان روایات کی تنقید کی، تو ابدال بیلا نے بہت سی جگہوں پر روایاتِ سیرت کی تنقید و تنقیح کی۔ ان کا اپنا دعویٰ ہے کہ انہوں نے مختلف روایات میں سے کسی ایک مخصوص روایت کا انتخاب، اجتہاد کی بنیاد پر کیا۔ وہ اجتہاد کو "کامن سینس" سمجھتے ہیں (حالاں کہ اجتہاد محض کامن سینس کا نام نہیں)۔ ان کا کہنا ہے کہ "جب جاننے والا قرآن اور سنت/احادیث کا جاننے والا ہو اور اسے دل کی بات کہنی، سننی، اور سنانی آتی ہو" [۳۷]، تو وہ اپنی طرف سے مستند روایت کا انتخاب کر سکتا ہے۔ کتاب آقاﷺ میں مصنف

کی طرف سے کی گئی تنقیح و تنقید پر تفصیلی بحث تو باب چہارم میں کی جائے گی، البتہ مختصراً یہاں بھی کچھ مثالیں پیش کی جا رہی ہیں۔

حضرت بی بی سارہ علیہ السلام کے کہنے پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت بی بی ہاجرہ علیہ السلام کو مکہ کی بے آب و گیاہ وادی میں چھوڑا۔ اس روایت پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> سیدہ سارہ چوں کہ اس وقت تک بے اولاد تھیں، ان سے اپنے شوہر کی دوسری بیوی کا بیٹا نہ سہا گیا۔ دونوں ماں بیٹے کے دیس نکالے کا مطالبہ کر دیا۔ ماننے والے اس کہاوت کو مان بھی لیتے ہیں، مگر حیرت ہے انہیں یہ خیال نہیں آتا کہ یہ تو سوچیں کہ سیدہ سارہؑ کا مطالبہ ماننے کے لیے خدا کے دوست اور انتہائی برگزیدہ نبی سیدنا ابراہیمؑ اپنی بیوی ہاجرہؑ اور اسماعیلؑ کو فلسطین سے لے کر سوا مہینے تک چلتے چلتے کہاں جا کے رکتے ہیں؟ کہاں بیوی اور بچے کو چھوڑتے ہیں؟ وہ جگہ کس نے طے کی تھی؟ سیدہ سارہؑ نے؟ سیدہ ہاجرہؑ نے؟ سیدنا ابراہیمؑ نے؟ یا سیدنا ابراہیمؑ کے خدا نے؟ خدا کے حکم کے بنا، نہ وہ چلتے تھے نہ رکتے تھے۔ دیکھنا یہ ہے وہ جگہ کون سی ہے؟ وہاں کیا تھا اس وقت اور کیا ہونے والا تھا؟ بی بی ہاجرہ کو بھی وہ بے آب و گیاہ ویرانہ، ویرانہ ہی لگا تھا۔ دور دور تک نہ پانی، نہ پانی کا نشان۔ نہ کوئی پودا، نہ کوئی پیڑ۔ نہ کوئی انسان، نہ کوئی انسانوں کی بستی۔ ایسی جگہوں پر کون رکتا ہے، کون بچتا ہے۔ کون بستا ہے؟ مگر وہ بس گئیں۔ ٹھہر گئیں اور ہمیشہ کے لیے قائم کر دی گئیں۔ وہ بھی ایسے کہ ان کا چلنا پھرنا، دوڑنا، رکنا ہمیشہ کے لیے امر کر دیا گیا۔ [۳۸]

یہاں ایک عجیب تضاد بھی سامنے آتا ہے کہ ص ۲۹ پر تو مصنف نے اس روایت پر تنقیدی دلائل پیش کیے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ، حضرت سارہؑ کے کہنے پر نہیں، بلکہ اللہ کے حکم سے بی بی ہاجرہؑ کو ان کے نومولود کے ساتھ اس ویرانے میں چھوڑ گئے تھے، لیکن ص ۴۴ پر خود ہی اس روایت کے حق میں کہہ رہے ہیں کہ:

> حالات ایسے بنا دیے گئے کہ سیدہ سارہؑ نے خود سیدنا ابراہیمؑ سے مطالبہ کر دیا کہ ہاجرہ اور اس کے نومولود بیٹے کو دور لے جا کے چھوڑ آؤ۔ سیدنا ابراہیمؑ کو بھی شاید یہ تقاضا عجیب لگ ہو، مگر جس ایک رب کے لیے وہ یکسو ہو کے جی رہے تھے، اسی نے ان کے کان میں مسکرا کے ہاں کہہ دی ہو گی۔ سیدنا ابراہیمؑ، بی بی ہاجرہ اور اپنے شیر خوار بچے اسماعیلؑ کو سفر پر لے کے چل پڑے۔ سفر خدا کا سوچا ہوا تھا۔ اس سفر کی منزل بھی۔ [۳۹]

قبولِ عام روایت ہے کہ غزوہ احد میں مسلمانوں کو بظاہر شکست ہوئی، لیکن ابدال بیلا اس شکست کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس حوالے سے وہ کہتے ہیں کہ:

> تاریخ میں اس جنگ کو خواہ مخواہ مسلمانوں کی شکست کا تمغہ خود مسلمانوں نے دیا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ جب تاریخ کی پہلے پہل کی کتابیں ہجرت کے کوئی ساٹھ ستر سال بعد لکھی جا رہی تھیں تو ابو سفیان بن حرب کی اولاد حاکمِ وقت تھی۔ لکھنے والوں کو اپنا قلم ہی نہیں، اپنا سر قلم ہونے سے بھی بچانا پڑتا ہو گا۔ انہوں نے تھوڑا بہت رنگ اگر ابو سفیان بن حرب کو فاتح قرار دے کر بھر دیا تو کوئی حرج نہیں۔ آخر جان بچانا اور پیٹ بھرنا بھی تو ضروری ہے۔ [۴۰]

اور بھی بہت سے واقعات میں مصنف نے سیرت کی روایات پر تنقید کر کے اپنی رائے پیش کی ہے، بلکہ ایک جگہ تو باقاعدہ جدید سیرت نگاروں کو ردِ روایت کا اختیار دینے کا بھی مطالبہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

میری اہلِ خرد اور آقا ﷺ کی شخصیت کے حسنِ رحمۃ اللعالمینی اور پوری زندگی کے موجود ریکارڈ کو ذہن میں رکھ کے دوبارہ اس پہ غور کرنے کی درخواست ہے۔ جس اصول "کامن سنس" اور قرآن کی بنا پہ جناب بخاری نے اپنی شروع میں جمع کی ہوئی چھ لاکھ حدیثوں میں سے صرف 7397 پر اعتماد کیا، پھر ان کی بھی چھانٹی کر کے صرف ۲۶۰۲ احادیث کو صحیح قرار دیا، صرف اپنی عقل اور سوچ سمجھ کی بنیاد پہ، اس میں تھوڑا سا غور اب ہمیں بھی کرنے کی اجازت دی جائے۔ [۴۱]

سیرت نگاری کے لیے ضروری ہے کہ صداقت کی جستجو کے لیے ہر ممکن کوشش کی جائے اور قدیم اور جدید مآخذ سے اس سلسلے میں استفادہ کیا جائے۔ مصنف اپنے تئیں آقا ﷺ کتاب کی تصنیف کے حوالے سے صداقت کی جستجو میں "رف ورک" کا دعویٰ تو کرتے ہیں، لیکن ساتھ ہی اس "رف ورک" کو صیغہ راز میں رکھنے کا عندیہ بھی دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ:

وہ اپنا "رف ورک" بہر حال خفیہ تھا، خفیہ رہے گا۔ مقصد کسی مسلک کا پرچار نہیں، کسی بحث میں الجھنا نہیں، کسی کو برا کہنا نہیں۔ بس آقا ﷺ کی غلامی بانٹنی ہے۔ "وجوہات" سے آگاہ تھا، مگر ان کا جواب علمی استدلال سے بین السطور ہی رہا۔ [۴۲]

مصنف کو سیرت جیسے نازک موضوع کے حوالے سے حقائق/واقعات کی تنقید و تعبیر کے سلسلے میں اپنے "رف ورک" میں سے کم از کم کچھ کا تو حواشی میں ذکر ضرور کرنا چاہیے تھا، تاکہ ہر مذہب و مسلک سے تعلق رکھنے والا قاری مکمل طور پر ان کی تصنیف سے استفادہ کر سکتا۔ اسے کسی حوالے سے بھی تشنگی کا احساس نہ ہوتا۔

ہم اس بات کو فراموش نہیں کر سکتے کہ علم خواہ جو بھی ہو، حوالوں سے ہی آگے بڑھتا ہے۔ ان کی چھان پھٹک کے لیے ماخذات تک پہنچنا ضروری ہوتا ہے، لیکن آقا ﷺ کے متن سے یہ بات سے نمایاں ہوتی ہے، کہ مصنف نے مکمل طریقے سے روایات کے حوالے نہیں دیے، نہ ہی حواشی کا تکلف کیا۔ اکثر روایات کا آغاز بغیر حوالے کے اس انداز سے کرتے ہیں کہ "کہا جاتا ہے کہ بنو جرہم کے یہ کہے ہوئے دکھ بھرے بول عربی زبان کے پہلے پہلے کے اشعار ہیں، جو انہوں نے خدا کے گھر سے دور جاتے ہوئے روتے روتے کہے۔" [۴۳] کبھی کہانی کا انداز اپناتے ہوئے کہتے ہیں: "کہتے ہیں شق صدر کا واقعہ تین بار ہوا۔" [۴۴] کبھی واقعے کی شروعات ناول یا افسانے کی طرح کرتے ہیں جیسے: "وہ گرمیوں کے شروع شروع کے دن تھے۔" [۴۵]

سیرت نگاری جیسا اہم اور نازک موضوع، سیرت نگار سے مکمل ماخذات کا تقاضا کرتا ہے، لیکن آقاﷺ کتاب میں مصنف حوالے اور حواشی کا زیادہ اہتمام نہیں کرتے۔ جو حوالے ان کی تصنیف میں موجود ہیں ان کو بھی مکمل حوالہ نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ نہ تو مصنف نے یہ وضاحت کی ہے کہ انہوں نے احادیث کی کتب کے کون سے ایڈیشن کا مطالعہ کیا ہے اور نہ یہ واضح کیا ہے کہ اس تصنیف کے لیے عربی وفارسی کی اصل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے یا فلاں فلاں مترجم کے تراجم سے رہنمائی لی گئی ہے۔

اسلوبِ بیان:

کوئی بھی تصنیف خواہ علمی ہو یا ادبی، مصنف کے ذہن کا اپنے موضوع کے حوالے سے واضح ہونا بہت ضروری ہوتا ہے اور اگر بات سیرت نگاری کی ہو، تو ایسے میں سیرت نگار کی ذمہ داری دوچند ہو جاتی ہے۔اسے الفاظ کے چناؤ سے لے کر مواد کے انتخاب تک، ہر معاملے میں احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔اسی لیے جدید سیرت نگاری میں عصری اسلوب کے لوازمات کو ضروری خیال کیا جاتا ہے۔آج کل کے ترقی یافتہ اور تیز ترین دور میں جہاں مہینوں کی مسافت دنوں اور گھنٹوں میں طے ہو رہی ہے۔انسانوں سے زیادہ مشینیں کار آمد ہیں، لیکن اس کے باوجود جدید انسان کے پاس وقت نہ ہونے کے برابر ہے۔ایسے میں زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح، جہاں طویل داستانوں کی جگہ ناول اور پھر افسانوں نے لے لی اور جب بات مذہبی ادب کی جائے تو انسان کے پاس ضخیم کتب کا مطالعہ کرنے کا نہ حوصلہ ہے اور نہ وقت، جب تک اس میں مزید جاننے کی طلب نہ جاگے۔اسی مزید طلب کو بڑھانے اور جگانے کے لیے سیرت نگاری کو بھی جدید عصری اور ادبی اسلوب میں ڈھالا جا رہا ہے، تاکہ نوجوان نسل اپنی مذہبی روایات سے جڑی رہے۔آقاﷺ میں مصنف نے تاریخی حقائق کو زمانی ترتیب کے ساتھ بیان کیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ انھوں نے اپنی تصنیف میں اپنے علم کی خواہ مخواہ کہیں نمائش نہیں کی، اپنے مسلک کا پرچار نہیں کیا، نہ ہی مختلف مسالک کی کہیں بحث چھیڑی ہے۔جدید سوانح نگاری کے انداز کو اپنایا ہے اور کوئی واقعہ بار بار لکھ کے قاری کو کے مرتکز ذہن کو منتشر کرنے کی کوشش نہیں کی۔ پوری تصنیف میں انداز یہی رکھا ہے کہ پڑھنے والا جو بھی پڑھ رہا ہے وہ زمانی ترتیب سے تمام تفاصیل سے اس طرح آگاہی حاصل کرے کہ خود کو اسی منظر کا حصہ سمجھے، جیسے وہ سارا واقعہ خود دیکھ رہا ہو۔ کتاب آقاﷺ کے اسلوب میں اختصار وایجاز نمایاں ہیں۔ مصنف نے کسی بھی واقعہ میں لمبی چوڑی تفاصیل میں جانے سے گریز کیا۔بہت کم الفاظ میں اپنا مدعا بیان کیا۔آقاﷺ کی روح مقدس کو اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے تخلیق کیا۔عام طور پر اس روایت کے بیان میں خاصی تفصیل سے کام لیا جاتا ہے، لیکن مصنف کا انداز ملاحظہ ہو:

> پہلی روحِ مقدس، جو خدا نے تخلیق کی۔ جنہیں بنا کے ساری کائنات بنائی۔ آقا ﷺ جبرائیل علیہ السلام کا دیکھا ہوا وہ ستارہ ہیں جو بہتر ہزار سال بعد آسمان پہ طلوع ہوتا ہے اور جنہیں جبرائیل علیہ السلام نے ستر ہزار بار دیکھا تھا اور آقا ﷺ نے فرمایا تھا "وہ ستارہ میں ہوں۔ "[۴۶]

اسی طرح آقا ﷺ کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بارے میں لکھا تو لمبے چوڑے تمہیدی بیان کی بجائے مختصر انداز میں لکھا کہ:

> آقا ﷺ زمین اور آسمان کے در میں خدا کا آخری باضابطہ سرکاری رابطہ ہیں۔ آقا ﷺ کو ملا مشن مکمل ہوا۔ اب آقا ﷺ کو اپنے خدا سے ملنے کی جلدی اور خدا کو اپنے محبوب کے سواگت کا انتظار۔ آقا ﷺ کے پروانوں میں خوف اور دکھ کی بل چل۔ آقا ﷺ بیمار ہو گئے۔ صحابہ کملانے لگے۔ الوداعی آثار نمودار ہونے لگے۔[۴۷]

یہی اسلوب پوری تحریر میں نمایاں ہے، لیکن کسی کسی جگہ مصنف نے اس حد تک اختصار سے کام لیا کہ واقعہ پوری طرح واضح نہیں ہو پاتا۔ کم الفاظ میں پورے معانی کا ابلاغ ہو جائے، تو ہی اسے ایجاز کہا جاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس قدر کم الفاظ منتخب کیے جائیں کہ مدعا ہی پوری طرح سمجھ نہ آئے۔ غزوہ احد میں آقا ﷺ نے جب اپنے سب لوگوں کو جمع کر کے صورتِ حال سے آگاہ کیا، تو اس کا حوال مصنف نے نہایت نپے تلے الفاظ میں بیان کیا۔ لکھتے ہیں:

> آقا ﷺ نے جمعہ کے خطبے سے پہلے ایک مشاورتی ہائی کمان اجلاس طلب کیا۔ ساری صورتِ حال سامنے رکھی۔ قریش کی فوج کی تفصیل بتائی۔ ان کے ارادے بتانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اپنا ایک خواب بھی سنایا جو اسی رات آقا ﷺ نے دیکھا تھا۔ خواب تھا کہ آقا ﷺ ایک مینڈھے پر سوار ہیں۔ آقا ﷺ کے ہاتھ میں تلوار ہے، تلوار میں خراش آئی ہے، کچھ گائیاں ذبح ہوئی ہیں مگر آقا ﷺ کا ایک ہاتھ مظبوط زرہ کے اندر ہے۔ تعبیر بھی آقا ﷺ نے بتائی۔ جو بعد کے واقعات سے سچ نکلی۔[۴۸]

یہاں مصنف نے خواب کی تعبیر کا ذکر تو کیا ہے لیکن بیان نہیں کی۔ جس کی وجہ سے واقعے میں ایک قسم کا خلا محسوس ہوتا ہے۔ اسی طرح عبداللہ بن سلام نے قبول اسلام سے پہلے آقا ﷺ سے سوال کیے تھے۔ گمان تھا کہ آقا ﷺ جواب نہ دے پائیں گے۔ اس واقعہ کو مصنف نے اس طرح بیان کیا:

> عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ، آقا ﷺ کے قریب جا بیٹھے۔ ادب سے تین سوال کیے، جو ان کے خیال میں سوائے نبی کے کسی کے پاس ان کا جواب نہ ہو گا۔ آقا ﷺ نے تینوں کے جواب دے دیے۔ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ انہیں اپنی تلاش مکمل

ہوتی نظر آئی۔ برملا بولے۔لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔آ قاﷺ نے حصین بدل کے نام عبداللہ رکھا۔[49]

یہاں پہ مصنف کو سوالات کا ذکر کرنے کے بعد سوالات بیان کرنے چاہیے تھے، تاکہ واقعہ مکمل سمجھ آ جائے، لیکن سوالات کا بیان نہ کرنا تشنگی کا احساس دلاتا ہے۔

سیرت نگار کے لیے ادبی ذوق بہت ضروری ہے، تاکہ وہ اپنی تصنیف میں ادبیت قائم کر سکے۔اس حوالے سے ابدال بیلا کا کہنا ہے کہ آقاﷺ کی تصنیف سے پہلے انہوں نے جو تیس کتابیں لکھی ہیں، وہ شاید اللہ تعالیٰ نے ان کے قلم کو رواں کرنے کے لیے ہی لکھوائیں۔اپنی سیرت نگاری کے حوالے سے ابدال بیلا لکھتے ہیں کہ :

> سیرت لکھتے سے کئی مرحلے ایسے آئے، جنہوں نے جسم کی کھال ادھیڑ دی۔لہو منجمد ہونے لگا۔ سر پھٹنے لگا، جسم ریزہ ریزہ ہو گیا۔ وہ کیفیات کہاں کہاں آئیں، آپ پڑھنے والے محسوس کریں گے۔ قصور میرا ہے۔ میں ایک ادیب ہوں، ناول نگار ہوں، تیس سے زائد کتابیں لکھ چکا ہوں۔[50]

ذیل میں آقاﷺ کتاب سے چند مثالیں پیش کی جا رہی ہیں جن میں مصنف کا ادبی اظہار نمایاں ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالا گیا تو وہ اللہ کے حکم سے گلزار بن گئی۔ مصنف اس واقعے کو ادبی پیرائے میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

> آگ ہم انسانوں کی طرح نافرماں بردار تھوڑی ہے۔اسے تو وہ ہی حکم ماننا ہوتا ہے، جو اسے دیا جائے۔ فوراً حکم کی تعمیل ہوئی۔آگ پھول بن گئی۔ شعلے گلاب کی پنکھڑیاں بن گئے۔ سینکڑوں فٹ اونچے ابلتے آگ کے شعلے ایک لمحے کے بھی بیسویں حصے میں ایک دم سے سمٹ کے پھول کی پتیاں بن گئے۔لاکھوں من جلتی لکڑیوں کا ڈھیر، اگلی ساعت میں گلزار ہو گیا۔ پھول کھل گئے، خوشبو پھیل گئی۔ پھولوں کے خوش گوار ڈھیر میں حضرت ابراہیمؑ یوں آسودگی سے جھول رہے تھے، جیسے وہ ان کی اپنے محبوب سے ملنے کی گھڑی ہو اور گرداگرد پھولوں سے لدا مہکتا عروس محل ہو۔[51]

آ قاﷺ کے تبسم کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ "چاند کی پوری زندگی میں اس کی چاندنی نے ایسی اجلی براق مسکراتی مہکتی مسکراہٹ نہ دیکھی ہو گی۔"[52] ایک جگہ لکھتے ہیں:

> بوڑھے لوگ بھی پوری عمر گزار کے کنواں بن جاتے ہیں۔اندر سے گہرے، پانی سے بھرے ہوئے، مگر خاموش، کوئی پیے نہ پیے۔لاپروا، بے نیاز، وہ بوڑھا بھی بے نیازی سے بیٹھا تھا۔[53]

مصنف کی تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ یہ کوئی مذہبی کتاب نہیں، بلکہ ادبی کتاب ہے۔ مصنف کے ہاں جابجا

عربی اور فارسی اشعار کے اردو تراجم بھی نظر آتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ کی مدح میں حضرت ابو طالب کے قصائد تاریخ میں اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ان کی شاعری کو اردو ترجمے کے ساتھ لکھتے ہیں:

محمدؐ بن عبداللہ اکیلے نہیں ہیں
بنو ہاشم کا پورا قبیلہ
بنو عبد المطلب اور بنو مطلب آپ کی ڈھال ہے
ہم سب آقا ﷺ پہ قربان ہو جائیں گے
لیکن کسی گھمنڈی کو اجازت نہیں دیں گے
کہ وہ آقا ﷺ سے بدزبانی کرے
یا ان کے جسم معطر پہ کوئی خراش لائے
ہم ان کے آگے، ان کے پیچھے، ان کے ہر قدم پہ
اپنی جانیں دیں گے
سن لو
ہم ان کا بال بیکا بھی نہیں ہونے دیں گے
آقا ﷺ پوری انسانیت کی شان ہیں
بچپن سے صادق
اور الامین ہیں [۵۴]

حضور پاک ﷺ کے جد حضرت ہاشم کی وفات پہ ان کی بیٹی نے جو مرثیہ کہا۔اس کا بھی اردو ترجمہ ہی پیش کیا ہے۔اس مرثیے کی چند سطریں درج ذیل ہیں:

موت کا پیغام دینے والے بے رحم شخص نے
صبح سویرے ہی ایک ایسے نامور شخص کے بچھڑنے کی خبر دی
جو زمین پہ چلنے والے سارے لوگوں میں زیادہ عزت والا تھا
ایسے شخص کے جانے کی خبر دی
جو قوم کا سردار تھا
جس کا اخلاق کریمانہ تھا
اور جس کی سخاوت، تواضع اور حلم شریفانہ تھا
پر عزم، بہادر، قوی اور جوان
وہ نہ بوڑھا ہوا تھا
نہ کم ہمت آدمی تھا۔۔۔۔۔ [۵۵]

رسول پاک ﷺ کی مدینہ آمد کے موقع پر بچیوں کے عربی گیت کے چند اشعار ہی نقل کیے، جن کو عربی زبان میں بھی بیان کیا۔[۵۶] مسجد نبوی ؐ کی تعمیر کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ :

سب کامے مزدور بنے، اللہ کا گھر، رسول ﷺ کی مسجد بنا رہے تھے۔ خوش خرام، خوش اندام اور شاد کام سب کام کرتے خوشی اور انبساط سے مسکراتے ہوئے گنگنا رہے تھے۔

هذا الحمال لا حمال خيبر
هذا امر ربنا و اطهر
"یہ خیبر کی کھجور جیسا بوجھ نہیں
بلکہ اے رب تو جانتا ہے یہ پاکیزہ نیکی ہے"

آقا ﷺ بھی اینٹیں اٹھا کے لاتے سے یہی رجز پڑھتے، کبھی صحابہ گنگناتے اور آقا ﷺ ساتھ دیتے۔

اللهم لا عيش الا عيش الاخره
فاغفر الانصار والمهاجره
اے اللہ زندگی تو آخرت کی زندگی ہے"
پس تو مہاجرین اور انصار پر رحم فرما"

گنگناتے، مسکراتے، کام میں جتے پروانوں کا جوش وولولہ قابل دید تھا۔ اکثر وہ یک زبان ہو کے گاتے۔

لئن فعدنا والنبى يعمل
لذالک منا الحمل المضلل
"اگر ہم بیٹھے رہیں اور نبی کام کریں تو ہمارے لیے یہ گمراہی کا عمل ہو گا۔"[۵۷]

اسی طرح مسلمانوں کے خندق کھودنے کے ساتھ، گیت کی صورت میں پڑھے گئے عربی اشعار بھی اردو ترجمے کے ساتھ درج کیے۔[۵۸]

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہ کا مالِ تجارت حضور اکرم ﷺ بصرہ لے کر گئے۔ آپ ﷺ کی واپسی پر سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کا انتظار کر رہی تھیں، مصنف نے ادبی پیرائے میں آپ ﷺ کی واپسی کا منظر بیان کیا۔

مکہ کی پہاڑیوں کی اوٹ میں سورج غروب ہونے کے لیے ادب سے جھک رہا تھا اور سیدہ رضی اللہ عنہ کے گھر کی طرف کائنات کا دل اجالے کا محور و مرکز سید البشر ﷺ کا اونٹ ہولے ہولے قدم بڑھا رہا تھا، سیدہ رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر کی چھت سے دور ہی سے آقا ﷺ کو پہچان لیا، ڈوبتے سورج کی ترچھی دھوپ میں کوئی کرن آقا ﷺ کے چہرے پہ نہ پڑ رہی تھی۔ چہرہ پر نور پھر بھی طلوع ہوتے سورج کی طرح چمک رہا تھا۔ ان کے سر کے اوپر دھوپ کے رخ میں دو بڑے پرندے اپنے پر پھیلائے سایہ کیے ساتھ ساتھ اڑ رہے تھے۔[۵۹]

طائف سے واپسی پر آقا ﷺ اور ان کے غلام زخموں سے چور چور تھے۔ایک جگہ ان کے پڑاؤ کے منظر کو اس طرح بیان کیا:

> دن ڈھل گیا۔ سورج آقا ﷺ کے تھکے قدموں اور مندمل ہوتے زخموں کو چوم کے غروب ہو گیا۔ دھیرے دھیرے رات نے دن کی چادر اتار کے اندھیرے کی بکل ماری۔ آسمان پہ چمکتے تارے آقا ﷺ کے نور کی کرنیں لے کر ٹمٹمانے لگے۔ اندھیرا اتنا گہرا ہو گیا کہ کوئی چند قدم پہ بھی بیٹھا یا کھڑا ہوتا تو نظر نہ آتا۔[20]

مکہ سے ہجرت کے بعد جب قبا پہنچے اور آقا ﷺ کے دشمن دور رہ گئے تو اس واقعے کا اظہار آزاد نظم کی صورت میں کرتے ہیں، جو ان کے ادبی ذوق کا مظہر ہے:

پروانوں میں جنونِ سرفروشی ہو
اگر مٹنے، جلنے
اور عشق میں فنا ہونے کی توفیق مل جائے
تو معدوم، خستہ حال، کٹے پروانوں کی محفل میں بھی شمع کائنات ﷺ کا ورود ہو جاتا ہے
شمع کامل ﷺ اپنے پروانوں کی تکمیل کرنے خود پہنچتی ہے
کسی کو شک ہو تو
پروانے کے پر پہن کر
لگن اور عشق دریا میں کود کر
ماہِ کامل ﷺ کے نورِ بیکراں کے بحرِ بے کنار میں
ایک بار ڈوبے، تڑپے
اپنے موم جسم، آنکھ پتلی کی درز اندر
ایک محبت کا سیپ پالے
جس میں آقا ﷺ کی محبت سے اچھل کے نکلا ہوا کوئی آنسو ہو
اسے پالتا جائے
پھر بھی کسی محبت سے لبریز جان کنی کے لمحے میں وہ ایک بیش بہا انمول بریاب موتی
ایک آنسو بہا کے دیکھ لے
آقا ﷺ کی حضوری مل ہی جائے گی
وہ خوش بخت غلامی، جس پہ بادشاہی رشک کرتی ہے
وہ خوش ادا، بے میل، بانکپن، خوش آہنگ، پاکیزہ شان قلندری مل ہی جائے گی۔[21]

ان تمام اشعار سے مصنف نے اپنی تصنیف کو مزیّن تو کیا لیکن یہ نہیں بتایا کہ ان اشعار کے مآخذ کون سے ہیں۔ عربی اشعار کے اردو تراجم کے دوران قارئین یہ جاننے سے قاصر رہتے ہیں کہ کیا یہ تراجم مصنف نے خود کیے ہیں یا کہیں اور سے نقل کیے ہیں۔ مصنف کی طرف سے اس قسم کی کوئی وضاحت نہیں ملتی۔

تخیل آرائی:

سیرت نگاری کے لیے ضروری ہے کہ انسائیکلوپیڈیا کی طرز پر نہ لکھی گئی ہو، بلکہ اس صنف میں اپنی طرف سے واقعہ کی تصدیق یا توثیق کے لیے وضاحت کی گنجائش موجود ہوتی ہے، تاکہ مصنف کا نقطہ نظر واضح ہو سکے، کیوں کہ اگر ساری معلومات بغیر بحث یا رائے کے درج کر دی جائیں اور تمام ضروری و غیر ضروری مواد پیش کر دیا جائے، جو کہ قدیم سیرت نگاروں کا نمایاں اسلوب رہا ہے، تو اس صورت میں بہت سے اشکالات اور ابہام جنم لے سکتے ہیں۔ سیرت نگاری کی تحقیق کے دوران یہ دیکھا جانا ضروری ہے کہ مصنف کے بیان میں اصل حقائق اور مصنف کی طرف سے دی گئی ذاتی رائے کا تناسب کیا ہے؟ آقاﷺ کتاب میں مصنف نے جو بھی واقعہ بیان کیا ہے اس کے ساتھ واقعے کی تفہیم کے لیے اپنی ذاتی رائے ضرور دی ہے۔ کسی بھی واقعے سے پہلے یا بعد میں اس واقعے کے متعلق اپنی ذاتی رائے دینے کے بعد، اگر ضروری ہو تو بحث و تمحیص سے بھی کام لیا ہے۔ مثال کے طور پر حرم پاک کی حدود کے تعین کی تفصیلات بتاتے ہوئے کبھی قیاس سے کام لیتے ہیں تو کبھی ذاتی رائے پیش کر رہے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ ''خدا کے حرم کی حدود کا اب تعین ہونا تھا۔ حدود بھی سیدنا جبرائیلؑ کے ذریعے خدا نے طے کروائیں۔'' [۶۲]

اب قیاس کے انداز میں کہتے ہیں کہ ''جبرائیل امین، سیدنا ابراہیمؑ کو کعبہ کے گرداگرد لے کے پھرے یا کسی اونچے پہاڑ پہ کھڑے ہو کے چاروں طرف کی جگہیں دکھا دکھا کے نشان دہی کرائی ہو گی۔ بہر حال نشان دہی ہوئی۔'' [۶۳]

اب ذاتی رائے دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> شاید اس سے کسی کو اندازہ نہ ہوا ہو۔ مشرقی حد پہ منیٰ اور عرفات سے ہوتی ہوئی خانوادہ ابراہیمؑ کی کہانی تو بن گئی، باقی حدوں کی کیا کہانی ہے؟ وہ بہت بڑا کہانی کار ہے۔ ایسا کہ کوئی کام نہیں کرتا جس میں کوئی کہانی نہ ہو۔ کوئی راز نہ ہو، کوئی بشارت نہ ہو۔ خبر نہ ہو۔ [۶۴]

اس کے بعد مغربی و شمال مغربی اور جنوبی و شمالی حدود وغیرہ بتاتے چلے جاتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ کے اجداد میں عبد شمس اور ہاشم جڑواں بھائی تھے۔ عبد شمس کے بیٹے سے ہاشم کا عزت و وقار ہضم نہ ہوا تو وہ حسد میں مبتلا ہو گیا۔ لکھتے ہیں کہ ''بہر حال امیہ بن عبد شمس کا اپنے چچا ہاشم کی فوقیت کو تسلیم نہ کرنے سے خون ضرور سیاہ ہو گیا۔ اس

نے شور مچا دیا۔ میں نہیں مانتا ہاشم کو بڑا۔ کوئی بڑا آئے اور ہم میں فیصلہ کرے۔"[۶۵] اب اپنی طرف سے معلومات کی وضاحت میں کہتے ہیں کہ:

> عربوں میں اپنی انا کی تسکین کے لیے اس طرح سر عام دوسرے کو بڑا نہ ماننا اور خود کو منوانے کی آرزو کرنا کوئی نئی بات نہ تھی۔ اس طرح کے چیلنج میں ہار جیت کا فیصلہ لازمی ہوا کرتا تھا۔ یہ کبھی نہ ہوا تھا کہ کوئی خود دوسرے کی فوقیت کو چیلنج کرے اور کوئی فیصلہ نہ ہو۔[۶۶]

مصنف اکثر واقعات کے بیان سے پہلے استقرائی انداز اختیار کرتے ہیں۔ واقعے کے بیان سے پہلے اس کے سیاق وسباق یا پھر اس واقعہ کی وضاحت کرتے ہیں، تاکہ قاری کا ذہن واقعہ کی طرف متوجہ ہو جائے۔ مثلاً کعبہ کی تعمیرِ نو کے احوال سے پہلے لکھتے ہیں کہ:

> ہر بڑا کام ہونے سے پہلے وہ اللہ کا ارادہ بنتا ہے۔ پھر جیسے اس کام کو ہونا ہوتا ہے، وہ ہو جاتا ہے۔ اب اللہ کو پتہ تھا کہ آقا ﷺ کی عمر جب چالیس سال کے لگ بھگ ہو گی، فلاں مہینہ، فلاں تاریخ، فلاں دن ہو گا تو جبرائیلؑ کے ذریعے اللہ اپنا کلام آقا ﷺ پہ اتارے گا۔ پھر آقا ﷺ تمام بنی نوع انسان کو خدا کے گھر کو مرکز بنا کے حق، برابری، رواداری اور سماجی انصاف کی اعلیٰ قدروں کی طرف بلائیں گے۔ خدا کے گھر سے جاہلیت کی تمام علامتیں، تین سو اسی بت اٹھائے جائیں گے، کعبہ پھر سے صرف اللہ کا گھر بن جائے گا۔ اس کی رونق بڑھے گی۔ وہ کعبہ جو کائنات کا مرکزی دل ہے اللہ کے آخری رسول سید البشر آقا ﷺ کے ہاتھوں سے سجایا جائے گا۔ بس ارادہ اللہ نے کیا۔ مکہ کے قریش کعبہ کے صحن میں آبیٹھے۔[۶۷]

کبھی کبھی استخراجی انداز میں واقعے کے بعد کی تفصیلات بیان کرتے ہیں، جیسے حقائق کی وضاحت کر رہے ہوں۔ آقا ﷺ پر پہلی وحی نازل ہونے کے بعد آقا ﷺ کی کیفیت کی وضاحت کچھ اس طرح سے کرتے ہیں:

نو وارد کے کہے ہوئے عربی زبان میں یہ چند فقرے اپنے عظیم الشان حسن، وقار اور حیرت انگیز معنویت کے ساتھ آقا کی روحِ مقدس میں گھل گئے۔ آقا ﷺ کے لبوں پہ بھی یہی فقرے جاری تھے۔ ان پانچ جملوں کا ساختیاتی حسن، گہرے عمیق انکشاف سے آقا ﷺ محظوظ ہوئے ہوں گے۔ آقا ﷺ امی ہونے کے باوجود عربی زبان کی سلاست، روانی، وسیع معنویت اور حسن کلام کے سب رموز سے آگاہ تھے۔ انہوں نے عرب کی بہترین زبان صحرا کے بادہ نشینوں سے سیکھی تھی۔ وہ انسان کی انسانوں سے کی گئی تمام تر گفتگو کے انداز، پرتو، اسلوب اور رموز تخاطب سے آشنا تھے۔ وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ پانچ فقرے کسی انسانی ذہن میں نہ بنے ہوں گے۔ لگتا تھا انہیں کہلوانے والا انسان نہیں ہے۔ کوئی انسان سے عظیم تر ہستی، جس نے انسان کو تخلیق کیا، وہ عظیم الشان خالق آسمان سے زمینی مخلوقات کے لیے کسی اہم ترین سبق بھیجنے کے لیے آقا ﷺ کو چن بیٹھا ہے۔ ویرانے میں اونچے پہاڑ کی ایک کھوہ میں، بستی سے میلوں دور، تنہائی میں ایک انجانے اجنبی کا یوں اچانک آ جانا اور ایسے تابناک معنویت کے سمندر بھرے چمکتے جملوں کو کہہ کے آقا ﷺ کے دل پہ نقش کر دینا ایک انتہائی غیر معمولی انوکھا واقعہ تھا۔"[۶۸]

اس کے بعد پھر کعبہ کی تعمیر نو والا سارا واقعہ بیان کرتے ہیں۔ جس رات آقاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرتِ مدینہ کا فیصلہ کیا، اس رات کی منظر کشی مصنف اس انداز سے کر رہے ہیں:

> چاند اپنے جنم دن سے جس ماہِ کامل کی راہ تک رہا تھا، اپنی زندگی بھر کی بچار کھی چاندنی سے جس مہا چندرما کے مقدس چرنوں میں اپنی ساری چاندنی کی چاندی جن کی راہ کی دھول بنانا چاہتا تھا۔ وہ سمے آنے والا تھا۔ منیٰ اور مکے کے راستے میں عقبہ کی گھاٹی کے اطراف میں، صدیوں سے انتظار میں کھڑی چٹیل پتھریلی چٹانیں جس لمحے کی راہ تکتے تکتے خاک رنگ خاکستری ہو گئیں تھیں۔ وہ لمحہ آنے والا تھا۔ اسی گھاٹی کے نشیب میں پانچ سو کلو میٹر دور سے آئے بچھتر (۷۵) لوگوں کی مبہوت، متحیر ڈیڑھ سو آنکھوں میں انتظار، اضطراب، لگن اور عقیدت کے ہزار ہا ستارے آسمان سے اترے کھڑے ان روحوں کے بچے ادھیڑ رہے تھے۔ وہ انتظار ختم ہونے والا تھا۔ آقاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد آمد تھی اور آقاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آ گئے۔ [۶۹]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ آسمان پر اٹھائے جانے والے واقعے کے بیان کے بعد قیاس کرتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں کہتے ہیں کہ:

> شاید خدا نے سیدنا عیسیٰ ابن مریمؑ کو یہ بھی یاد دلا یا ہو کہ تم جس جلیل القدر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کے لیے جلدی رخصت چاہتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ان کے پیروں میں پہنے جوتوں کے تسمے کھولنا بھی تمہاری سب سے بڑی سعادت ہوگی، انہی کی رسالت کے دنوں میں تم ان کے ملک شام کی ایک مسجد کے مینار سے اتروگے اور پوری دنیا کے بھٹکے لوگوں کو انہی کے دین کی طرف بلاؤ گے۔ تم امتحانِ توہین کی برداشت میں پورے اترے۔ اب مقررہ وقت تک میرے آسمانوں میں میرے مہمان رہو۔ [۷۰]

آقاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سفر بصرہ کے حالات بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہ کے غلام میسرہ نے آکر جب ان کو بتائے تو بی بی اپنے چچازاد ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں۔ مصنف بیان کرتے ہیں:

> میسرہ کی باتیں سن کے بھاگی اپنے چچازاد عالم و دانا بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں۔ ممکن ہے انہوں نے ورقہ کی بہن ام قتیلہ سے بھی کوئی بات کی ہو، جو چھبیس سال پہلے آقاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والد عبداللہ کے ماتھے پہ الوہی نور دیکھ کے ان کی شادی کے دن، ان سے شادی کا مطالبہ کر بیٹھی تھیں، ام قتیلہ نے بھی سرمدی نور کا اپنے بھائی ورقہ بن نوفل ہی سے سنا ہوگا۔ [۷۱]

آقاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ پاک کے حکم کے بغیر کچھ بھی نہ کہتے تھے۔ جب آقاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت کے اس پہلو کا ذکر کیا تو ساتھ ہی دل میں آئی سوچ کو بھی بیان کرنا ضروری سمجھا۔ انداز ملاحظہ ہو:

رب کی باتیں بھی انہی لفظوں میں کہتے جیسے خدا نے ان سے کہی تھیں۔اپنی طرف سے تو وہ کچھ کہتے ہی نہ تھے۔جو ان سے خدا کہتا وہ کہتے۔خدا بھی اپنی ثنا سے بے نیاز ہے۔مگر کیا پتہ خدا کو آقاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لبوں سے اپنے لیے کی ہوئی وہ باتیں کتنی بھلی لگتی ہوں جنہیں خدا نے جبرائیلؑ کے ذریعے آقاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب پہ نازل کیا ہوا تھا۔کیے جاتا تھا۔[۲]

عام سوانح نگاری سے قطع نظر سیرت نگاری میں مصنف سے یہ تقاضا کیا جاتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عام انسان سمجھ کر ان سے کوئی کمزور بات منسوب نہ کی جائے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشریتِ کاملہ کی خصوصیات کسی بھی اور ذی مرتبت شخصیت کے حصے میں نہیں آئیں۔اس بات سے انکار نہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بشریت کے لبادے میں ہی دنیا میں بھیجے گئے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عام انسان ہر گز نہیں ہیں۔ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معصوم اور ہر خطا سے پاک ہیں۔آقاﷺ کتاب کے مصنف نے بھی اپنی پوری تصنیف میں یہ بات اپنے پیشِ نظر رکھی کہ وہ اللہ پاک کے محبوب ترین نبی، جو کہ تمام انبیا کے سردار ہیں، کی حیاتِ مقدسہ پر لکھنے کی جسارت کر رہے ہیں۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عام انسان کی بجائے نورِ مجسم سمجھ کر مصنف نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے "نور" ہونے کی روایت میں مصنف نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دنیا میں ظہور سے پہلے ان کے نور ہونے کے بارے میں لکھتے ہیں: "نورِ کل نے نورِ کائنات کو مجسم کر کے رکھ لیا ہو گا۔" اللہ تعالیٰ نے آقاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سب سے پہلے خلق فرمایا۔اس حوالے سے مصنف لکھتے ہیں کہ:

پہلا انسان، انسانی شکل میں "آدم" کے نام سے آیا، مگر معیارِ انسانی "فی احسن تقویم" کی روحِ اقدس ان سے کہیں پہلے بن چکی تھی۔پہلی تخلیق کی جانے والی روحِ مقدس میرے آقاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تھی۔[۳]

مصنف کے کسی انداز سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشری صفات کے بیان میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طاہر و معصوم ہونے کو نظر انداز کر رہے ہیں۔مسلمان علما اور نقاد سیرت نگار کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں کہ سیرت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو برتر بایو گرافی گردانا جائے۔اس ارفع و اشرف تشکیلی عمل میں واقعات کے محرکات بھی برتر انسانیت کے پیمانے پر ناپے جائیں۔یہ حقیقت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بشری تقاضے اپنی جگہ، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک انسان کے طور پر کسی سے بھی مقابلہ یا موازنہ کرنا ناممکن ہے۔جہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پسینہ مبارک کو صحابہ کرام رضی اللہ عطر کے طور پر استعمال کرتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسمِ اطہر کے بالوں کو تبرک کے طور پر محفوظ کر لیتے تھے، تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عام انسان سے مماثلت کی سوچ بھی فکر سے ماورا ہے۔مصنف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شانِ عبدیت کے بارے میں کہتے ہیں:

ساری کائنات کو جن کی غلامی کے لیے بنایا تھا، جو خود خدا کے غلام بندے اور آخری رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، اس آقاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آنے کا سمے ہو گیا۔انسانیت کے ہر پہلو کا بہترین نمونہ ان کی شخصیت میں

پنہاں کر کے، خدا نے انہیں سرِ عام دکھانے کا فیصلہ کر دیا۔ طے کر لیا کہ آنے والی تمام تر صدیوں میں برگزیدہ ترین نومولود کے کردار کی ہر ہر ادا کو نہ صرف دکھلانا ہے، منوانا ہے، بلکہ محفوظ بھی کرنا ہے۔[۴۴]

آقا ﷺ سے نسبت ہونے کی وجہ سے، غارِ حرا کے مقدس و معطر پتھروں کے ذکر میں مصنف کا انداز ملاحظہ ہو:

ان مقدس پتھروں کا لمس بہت متبرک ہے۔ وہ لمس وہی ہے، جو پندرہ سو سال پہلے آقا ﷺ کے مقدس جسم کو سر سے پیر تک چھو کے آج تک معطر ہوا ہوا ہے۔ اس پتھر کی درز سے گزرتے ہوئے عجیب احساس روح میں جاگتا ہے، کہ جن پتھروں نے آقا ﷺ کو چھوا تھا، وہ ہی آج ہمیں چھو رہے ہیں۔۔۔[۴۵]

طائف سے واپسی پر دو دشمنانِ رسولؐ عتبہ اور شیبہ کے عداس نامی غلام کو جب پتا چلا کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں، تو اس نے آپ ﷺ سے محبت و عقیدت میں ڈوب کر جو کچھ کہا، اسے مصنف نے اپنے الفاظ میں یوں بیان کیا:

محبت سے اس کا جسم آقا ﷺ کی طرف جھک گیا اور اس نے آقا ﷺ کے کندھوں اور سر کو بوسا دیا اور بولا، میں عیسیٰ ابنِ مریم کا ماننے والا ہوں، جنہوں نے ایک آخری نبی کے آنے کی بشارت دی تھی اور کہا تھا کہ ان کے جوتے کے تسمے کھولنا بھی ان کے لیے اعزاز ہوگا۔ اس نبی کے آنے کا یہی وقت ہے۔ آپؐ وہ ہی رسولِ برحق ہیں، آخری رسول ﷺ، آپؐ کے جوتوں میں پڑے زخمی پیروں کو سہلانا میرے لیے سعادت ہے۔ یہ کہہ کر عداس نے ایک بار پھر جھک کے آقا ﷺ کے پیروں پہ ادب سے ہاتھ لگایا اور ادب سے گچھی مچھی ہو کے آقا ﷺ کے زخموں پہ پڑی دھول کو ادب سے اپنی گیلی پلکوں سے صاف کیا اور عقیدت سے آقا ﷺ کے سر کو ایک بار پھر چوم لیا۔[۴۶]

واقعات کے انبار میں سے حسنِ انتخاب، ایک اچھے سیرت نگار کی خوبی ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس میں حضرت عیسیٰ کی خواہش کا ذکر کر کے گویا مصنف دیگر مذاہب والوں کو آپ ﷺ کی عظمت کا ثبوت دے رہے ہیں۔ کتاب آقا ﷺ میں ہم دیکھتے ہیں کہ مصنف نے جہاں آقا ﷺ کی عظمت بیان کی، وہیں آپ ﷺ کی ذاتِ پاک کو انسانیت کے لیے نمونہ ہونے کی بھی دلیل دی۔ سفرِ معراج کو مصنف، آقا ﷺ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام کہتے ہیں اور دوسروں کی طرف سے ظلم و ستم کا نشانہ بننے والوں کو حوصلہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ہر ناحق توہین برداشت کرنے کا انعام ہوتا ہے۔ توہین جتنی ناحق، شدید اور سرِ عام ہو گی، انعام کی مقدار، شدت اور اس کی دائمی حیثیت اسی نسبت سے ملے گی اور وہ انعام قائم رہے گا۔ نسل در نسل چلے گا۔ شرط ایک اور بھی ہے۔ توہین برداشت کرنے والے میں بدلہ لینے کی قوت اور

صلاحیت ہو، مگر وہ خدا کی خاطر اپنی طاقت استعمال نہ کرے۔۔۔۔۔۔۔انعام اس قدر بڑا ملتا ہے،
جتنا کوئی صبر واستقامت اور بغیر کسی منفی ردِ عمل اور کسی قسم کے بدلہ نہ لینے کے بعد خود کو اس کا
اہل ثابت کرے۔[۷۷]

مصنف واقعہ معراج کو آپ ﷺ کی شان اور عظمت کی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ آپ ﷺ کو پیکرِ بشریت میں فی احسن تقویم کے معیار پر رب تعالیٰ نے عظیم معجزہ دکھایا اور آقا ﷺ کو کائنات بھر پر دسترس عطا کر دی۔ مصنف اس حوالے سے لکھتے ہیں:

خدا نے آقا ﷺ کو کائنات بھر کی کنجیاں بخشی تھیں۔ اب انہیں ان چابیوں کے تالے بھی تو دکھانے تھے۔ جس جس جہان پہ ان کو دسترس دی، ان جہانوں کی سیر بھی کرانا تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی کسی کو چابیوں کا گچھا تو دے دے، ان چابیوں سے کھلنے والے تالے نہ دکھائے۔ ان تالوں کو کھول کے بیچ رکھے خزانوں سے بے خبر رکھے۔ خدا نے سب گزرے اور گزرنے والے زمانوں اور ان زمانوں کی ساری قوموں، ان کے سرداروں اور انبیا پہ آپ ﷺ کو شاہد بنانا تھا۔ گواہ ٹھہرانا تھا۔ کیسے کوئی گواہ، وہ گواہی دے سکتا ہے جب تک وہ سارے واقعے دیکھ نہ لے، سارے زمانے، ساری قومیں جان نہ لے اور ان قوموں کے سردار انبیا سے بہ نفس نفیس ملاقات نہ کرے۔ انہیں اپنا مبتدی بنا کر ان کی امامت نہ کر لے۔ پھر یہی نہیں، اس کائنات کی جو بھی آخری حد ہے، جہاں بھی ہے، وہ وہاں تک نہ ہو آئے۔ سدرۃ المنتہیٰ پہ مقدس بیری کا پودا ہے، نور کا وہ ماخذ ہے۔ جس نور سے نکھرا اس کا کلام بر حق ہے۔ جس نور سے نور بشر کی صورت میں اس کا لاڈلا رسول آخر ﷺ ہے۔ نور کی کرنیں ایک مرکز پہ مرتکز ہوں اور نور کل کی نور کلام کے ذریعے نورِ بشر سے بات نہ ہو؟ ان سب انعامات کے اہتمام کا لمحہ آ گیا۔''[۷۸]

سدرۃ المنتہیٰ کے مقام پر جب حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آگے جانے سے منع کر دیا تو آقا ﷺ کی عظمت کے بیان میں لکھتے ہیں:

سات آسمانوں کی آخری حد سے آگے کا مقدس ترین گوشہ، جسے صرف پاکیزہ روحیں ہی سوچ سکتی
ہیں، وہاں پذیرائی ملی۔ جہاں بڑے سے بڑے معتبر فرشتے کی بھی رسائی نہیں۔ جہاں تک کوئی نبی،
کوئی رسول پہلے کبھی نہ گیا، وہاں آقا ﷺ کو نوازا گیا۔[۷۹]

ہر آدمی جو اس دنیا میں رہ رہا ہے، وہ اس دنیا کو اپنی سمجھ بوجھ اور فہم سے دیکھتا ہے۔ یعنی دنیا کے بارے میں اس کا اپنا ادراک اس کے تخیل اور قیاس کا ہی مرہونِ منت ہے۔ لیکن یہ تغیر پذیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر سیرت نگار اپنے اپنے فہم کے مطابق تخیل کا اپنی تحریر میں اظہار کرتا ہے۔ اس کی تحریر سے اس کی اپنی شخصیت بھی جڑی ہوتی ہے۔ سیرت کے حوالے سے جو بھی واقعہ ہو، ہر سیرت نگار اس کے بیان میں اپنے تخیل اور آقا ﷺ کی ذاتِ اقدس سے محبت کے تقاضوں کو نبھاتا ہے۔ جس کا نبی ﷺ سے جو تعلق ہو، اس کے مطابق اپنے ذہن میں تصویریں دیکھتا ہے۔ کیوں کہ جس نے ان واقعات کو دیکھا تو اس کے لیے تو سب کچھ عین الیقین ہے۔ جس نے خود ان واقعات کو بیتتے

نہیں دیکھا، اس کے لیے صرف علم الیقین ہے۔ وہ اپنے تخیل، قیاس اور ادراک سے حق الیقین تک کا سفر طے کرتا ہے۔ یہ تو سچ ہے کہ کسی بھی سیرت نگار کے لیے اپنے قیاس اور تخیل کو ذہنی ادراک سے الگ کرنا ممکن نہیں، لیکن نبی کریم ﷺ کے اعمال وافعال کے بارے میں خیال بافی سے کام لینا یا قیاس میں اس حد تک آگے چلے جانا کہ غیب کی باتیں جاننے کا دعویٰ کرنا پڑے، یہ سب سنجیدہ سیرت نگار کو زیب نہیں دیتا۔

عہد نبوی ﷺ کے ماحول سے واقفیت:

آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس کو ہمارے لیے مثالی نمونہ بنا کر پیش کیا گیا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ آج کے دور کے سماجی معاملات اور معاشرتی امور میں سیرت نبوی ﷺ سے رہنمائی لی جائے۔ محمد عبداللہ بیسویں صدی میں سیرت نگاری کے اہم رجحانات کے حوالے سے معاشرت نبوی ﷺ کی اہمیت کے ضمن میں لکھتے ہیں:

> آپ ﷺ کی ذات سے والہانہ عقیدت و محبت کہ وجہ سے یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ رسولِ اکرم ﷺ کے عہد اور معاشرے کو دیکھا جائے، جس میں آپ مبعوث ہوئے۔ جس عہد کے بارے میں آپ ﷺ نے خود ارشاد فرمایا:
>
> خیر القرون قرنی ثم الذین یلو نھم ثم الذین یلونھم ۔
>
> اس معاشرے کی کیا خصوصیات تھیں؟ اللہ تعالیٰ نے آپ کے انتخاب کے لیے عرب خطہ کو اور اس سوسائٹی ہی کو کیوں منتخب کیا۔ پھر آپ نے ایک نئے فکر و نظریہ و عقیدہ کی بنیاد کس طرح رکھی؟ کس طرح اس معاشرے میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ تربیتِ انسانی کے عوامل و محرکات کیا تھے؟ آپ نے جو معاہدے کیے، ان کا معاشرتی پسِ منظر کیا تھا؟ رسم و رواج کس طرح کے تھے؟ باہمی تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟ اسی معاشرے میں وحدت اور یک جہتی کس طرح پیدا ہوئی کہ انہوں نے بڑی بڑی طاقتوں کو زیرِ نگیں کیا۔[۸۰]

ابدال بیلا نے اپنی تصنیف میں نہ صرف قبل طلوعِ اسلام کے معاشرے کی عکاسی کی ہے، بلکہ حضور اکرم ﷺ کے زمانے کے معاشرتی نظام پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ عہد نبویؐ میں مسلم معاشرے کی تشکیل اور اس کے امتیازی اصولوں سے متعارف کرواتے ہیں۔ مکہ اور مدینہ کے لوگوں کے مزاج اور طرزِ بود و باش کے فرق پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

بنیادی طور پر اہل مکہ اور مدینہ کے لوگوں میں مزاج کے علاوہ بود و باش کا بہت فرق تھا۔ مکہ والے تجارت پیشہ لوگ تھے۔ صحراؤں میں پھرنے والے۔ راستوں سے آگاہ۔ صحراؤں کی سلوٹوں کے بھیدی، پہاڑی دروں اور چوٹیوں کے رازداں۔ گفتگو کے متوالے، بازار کی اونچ نیچ سے واقف۔ انہیں سودا خریدنا اور بیچنا آتا تھا۔ خود ہاتھ سے کوئی کام کرنے کے زیادہ ماہر نہ تھے۔ نہ کسان، نہ ہنرمند، پڑھے لکھے بھی واجبی، گھروں میں بھی ان کے مرد کا راج۔ عورتوں کو وہ زیادہ توقیر نہ دیتے تھے۔ فیصلے خود کرتے تھے۔ گوشت خور زیادہ تھے،

سبزیاں اور پھل مکہ میں ہوتے ہی کم تھے۔ مدینہ کے باسی محنتی تھے زیادہ تر کھیتی باڑی کرنے والے کسان۔ ہنر مند، کھڈی پہ کپڑا بناتے، جوتے بناتے۔ تلواریں، زرہیں، ڈھالیں، کھیتی باڑی کے اوزار۔ سونے، چاندی، موتیوں کے زیور، ہار، پازیبیں۔ موسیقی کے آلات، دف، بانسری، جھانجر اور ڈھول۔ ان میں نفاست اور قرینہ زیادہ تھا۔ وہ زیادہ مہذب تھے۔[81]

مصنف نے عہدِ نبوی ﷺ کے کھانے، دعوتیں، مکانات اور تہوار وغیرہ کی عکاسی بھی کی ہے۔ مکہ کے قبائل کا حال، ان میں ذات پات کے نظام کو بھی تفصیلاً بیان کیا ہے۔ اس معاشرے میں غلاموں کی حیثیت ایک جانور سے بھی بدتر تھی۔ مصنف لکھتے ہیں:

> غلاموں کی قیمت ان کی شکل و صورت، عمر اور صحت کے لحاظ سے ڈیڑھ سو سے چھ سو درہم تک ہوا کرتی تھی، غلاموں کی حیثیت انسانوں سے کہیں کم تر، جانوروں کی طرح تھی۔ اچھا اونٹ ایک اوسط غلام سے مہنگا تھا۔ وہاں گھوڑے اور خچر اونٹوں سے کئی گنا زیادہ مہنگے ہوا کرتے تھے۔ گدھے بھی موجود تھے مگر وہ بھی اونٹوں اور غلاموں سے زیادہ قیمت پہ ملتے۔[82]

اس دور میں سردار غلاموں سے جو سلوک کرتے، اس کی عکاسی مصنف نے امیہ بن خلف کی زبان سے ادا ہونے والے جملوں سے کی۔ امیہ بن خلف نے اپنے غلام بلال حبشی کو عمار یاسر کو ہنٹر مارنے کا حکم دیا۔ بلال نے ہنٹر نہ مارا تو سردار غضب ناک ہو کر کہنے لگا:

> تمہیں دو نسلوں سے میں نے خریدا ہے۔ تمہارا باپ رباح بھی میرا غلام تھا۔ تمہاری ماں عمامہ بھی میری کنیز تھی۔ تم کالے حبشیوں کو چمڑا رنگنے کا کام سکھایا۔ پیٹ بھر کی روٹی دی۔ پہننے کو لونگی دی۔ جانتے ہو نہ اپنی قیمت۔ ابھی بازار میں تمہیں ان ابھری، پھڑکتی پسلیوں، سوکھی ٹانگوں اور کالے بھدے رنگ روپ کے ساتھ لے جا کے کھڑا کر دوں تو ڈیڑھ سو درہم بھی نہ ملیں تمہارے۔ ایک بھیڑ سے بھی کم قیمت ہے تمہاری اور اس بدراہ کی بھی۔[83]

آقا ﷺ نے ذات پات کے شکار، اخلاقی اقدار سے کوسوں دور اس جاہل معاشرے کو مساوات کا جو درس دیا، اس کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں:

> آقا ﷺ کا یہی پیغام مکے کے مسکین، بے بضاعت، کمزور، غلاموں اور سہمے ہوئے حلیف ہنر مندوں کے لیے ایک زبردست کشش رکھتا تھا، وہ سب لوگ جنہیں زندگی کے اس جنم میں آسانی نہ ملی، انصاف نہ ملا، کشادگی نہ ملی، صحت نہ ملی، حسن نہ ملا، عزت نہ ملی، ان سب کے لیے آئندہ کی زندگی کے تصور میں ایک گوشہ عافیت تھی۔ انہیں اچانک احساس ہونے لگا کہ ان کے صالح اعمال، نیک نیتی، بھلائی، انسان دوستی، برداشت اور صبر کا کبھی تو انعام ملے گا۔ بعد کے جس حساب کتاب سے قریش کے ظالم امرا منکر تھے، غلاموں اور قریش کے ہنر مند حلیفوں کے لیے اسی پیغام میں ایک عالی شان وعدہ تھا۔[84]

مصنف نے نہ صرف اس عہد میں اخلاقی و سماجی اور سیاسی حالت اور غریب طبقے کی بے چینی اور اضطراب کو بیان کیا ہے، بلکہ اس معاشرے پر نبی کریم ﷺ کے آفاقی پیغام کے مثبت اثرات کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ مواخات مدینہ کا واقعہ بیان کیا تو تو دلائل دیے کہ مکہ کی نسبت مدینے کے لوگ زیادہ مہذب تھے، مگر ان کی شرافت کی بنا پر ان کا استحصال کیا جاتا تھا۔ وضاحت کی کہ مواخات میں ہونے والا بھائی چارہ کیسے ایک مثبت معاشرے کی بنیاد بنا۔ لکھتے ہیں:

> مہذب اور ہنر مندوں میں جب شرافت بھی ہو تو ان کا استحصال ہوتا ہے۔ مدینے والوں کا بھی ہوتا تھا۔ منڈی لگتی تو دوسرے شہروں سے آئے تجارتی قافلے اونے پونے داموں سے مدینے کی بہترین صنعت، پھل اور پھول خرید کے خوب نفع پہ کہیں اور جگہ جا کے بیچ دیتے۔ مکہ کے تاجر جب مدینہ کے انصار کے بھائی بن گئے تو انہوں نے مدینے کا یہ استحصال روک دیا۔ مدینے والوں کو منافع پہ صحیح جگہ اپنا مال بیچنے کی تربیت کی۔ خود بھی آگے بڑھے۔ یوں دونوں کے لیے یہ بھائی چارہ بہت مفید رہا۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ کوئی کسی کا زیر دست نہ رہا۔ نہ کوئی بھکاری بنا۔ نہ کوئی بے گھر رہا۔ ہر ایک پہ اتنا بوجھ ڈالا گیا جو وہ برداشت کر لے۔ مدینہ ایک قوم بن گیا۔ انسان دوستی اور مہمان نوازی کی انمول مثالیں قائم ہو گئیں۔ [۸۵]

دوسری اقوام/قبائل سے کیے گئے معاہدوں و ران کے اثرات پر دلائل سے بحث کی۔ میثاقِ مدینہ کے بارے میں تفصیلات بیان کرنے کے بعد اس معاہدے کا مختصراً جائزہ پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> پوری ۱۴ شقیں، تمام امور کے متعلق ہیں۔ زمانہ امن اور جنگ، دونوں حالتوں میں سب فریقوں کے عدل، مساوات پہ مبنی حقوق و فرائض کا احاطہ کرتی ہیں۔ اس عہد نامہ میں آقا ﷺ نے اپنی ذاتِ مبارکہ کو کوئی فریق نہیں بنایا، بلکہ ایک سرپرستِ اعلیٰ کی حیثیت دی۔ ایک مرکزی شخصیت تسلیم کرایا، جو نزاع اور جھگڑے کی صورت میں آخری فیصلہ کرنے کا حق دار ہو، جس کے بعد کہیں کوئی اپیل نہ ہو۔ دنیا کی تاریخ میں یہ کسی بھی ریاست کے بنیادی حقوق کی پہلی تحریری دستاویز ہے۔ [۸۶]

سارے واقعے کے تجزیے کے بعد اپنی رائے قائم کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "آقا ﷺ نے انسانی تاریخ سے منوالیا کہ دنیا کے سب سے بڑے قانون دان بھی وہ ہی ہیں۔ اگر تاریخ کے حافظے میں کوئی ہے تو بولے۔"[۸۷]

حضور پاک ﷺ کی عائلی زندگی مثلاً آپ ﷺ بے مثال باپ اور شوہر ہیں، غلاموں سے آپ ﷺ کے حسنِ سلوک اور اصحاب سے تعلقات کی بھی تصویر کشی کی کوشش کی ہے۔ سیرت نگاری میں معاشرتِ نبوی

ﷺ کے اخلاقی پہلو کے حوالے سے ابدال بیلا حضور اکرم ﷺ کے اخلاقِ حمیدہ حضرت بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہ کی زبانی کہلوا رہے ہیں:

سیدہ خدیجہ نے محبت کی انتہا اور عقیدت سے مسرور ہو کے سر جھکائے آقا ﷺ کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے اور کہنے لگیں۔ آپ قرابت داروں سے صلہ رحمی کرتے ہیں۔ ہر مہمان کی خوش دلی سے تواضع کرتے ہیں۔ غریبوں کے مددگار، مسکینوں کے مولی، یتیموں کا خیال رکھنے والے، دوسروں کا بوجھ اٹھانے والے، کمزوروں کی دادرسی آپ کرتے ہیں، مسکرا کے ہر ایک کو تکتے ہیں، لین دین میں کھرے، ہر معاملے میں ایمان دار، صادق اور سچے، کبھی جھوٹ نہ بولا، جو وعدہ کیا پورا کیا، امین، دیانت دار، جو کسی نے اپنی امانت آپ کے پاس رکھی، سنبھالی، کبھی خیانت نہ کی، خدا کے کلام کو محفوظ کرنے اور سب تک پہنچانے کے لیے الامین ہی ضروری ہے، آپ صرف وہ کہتے ہیں جو آپ سے آپ کا رب کہتا ہے، مہربان اور شفیق، ترش رو کبھی نہ ہوئے، میٹھی مہربان زبان سے کہا جو کہا، سختی کسی پہ نہ کی۔۔۔۔۔۔۔۔ ہر غم دل و دماغ سے نکال دیں، آپ سرخرو ہوں گے، آپ کو مبارک ہو آپ کو خدا نے چن لیا، اس مقصد کے لیے جس میں آپ کے بعد کوئی نہ چنا جائے گا، یہ عظیم الشان مقصد پورا ہو گا اعلیٰ ترین صورت میں۔ [۵۸]

سیرت نگاری اور دیگر علوم میں تعلق کی اہمیت سے آگاہی:

دورِ حاضر میں سماجی سائنس کے تیزی سے پھیلتے ہوئے اثرات نے جدید سیرت نگاروں کی توجہ بھی دینی علوم کے ساتھ ساتھ دیگر علوم مثلاً تاریخ، جغرافیہ، عسکری سائنس اور نفسیات وغیرہ کی طرف مبذول کروائی۔ آج کل سیرت نگار سے بھی یہ تقاضا کیا جاتا ہے کہ وہ سیرتی مواد کا مطالعہ ان علوم کے تناظر میں کرے۔

سیرت نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ متعلقہ ملک کی قدیم تاریخ کے بارے میں اچھی طرح آگاہ ہو۔ آقا ﷺ کے مصنف کا انداز یہ ظاہر کرتا ہے کہ انہوں نے عرب کی قدیم تاریخ کا مطالعہ کیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے دور سے اپنی تصنیف کا آغاز کرنے کے بعد وہ پہلے تو یہ بتاتے ہیں کہ مکہ جو بے آب و گیاہ صحرا تھا، آباد کیسے ہوا۔

حضورِ اکرم ﷺ کے جد قصی نے مکہ کی شہری ترقی کے لیے جو اصلاحات نافذ کیں۔ اس شہری ریاست کو چلانے کے لیے اس نے جو سات طرح کے مناصب رائج کیے۔ مصنف نے ان مناصب کا تفصیلی تعارف کروایا۔

عرب کے میلوں کا ذکر کیا تو مہینوں اور تاریخوں کے ساتھ جغرافیائی حدود اربعہ بھی بتایا۔ لکھتے ہیں:

> ذی قعد کی پہلی تاریخ سے بیس تاریخ تک، بیس دنوں کے لیے عرب کے صحرا میں ایک سب سے بڑی منڈی لگتی تھی۔ جس جگہ منڈی لگتی وہ جگہ مکے سے ۹۴ کلو میٹر شمال مشرق اور طائف سے ۴۰ کلو میٹر شمال میں ایک برساتی نالے کے کنارے تھی۔ اس برساتی نالے کو نخلہ بھی کہتے تھے اور سیل الکبیر بھی، یہ ہوازن قبائل کا علاقہ تھا۔ جس جگہ وہ منڈی اور اس کا بازار لگتا اسے "عکاظ" کہا جاتا تھا۔ یوں عکاظ کا سالانہ میلا سب منڈیوں اور میلوں میں سے سب سے بڑا ہوتا تھا۔ [۵۹]

جب نبی اکرم ﷺ کے شجرہ نسب کو بیان کیا تو اس سے پہلے لکھتے ہیں:

حضرت آدمؑ سے حضرت اسماعیلؑ تک آئے لوگوں کے نام تاریخ میں قابلِ تسلیم حد تک درج نہیں۔ قیاس آرائیاں ہیں۔ قلم کی ایجاد بھی حضرت نوحؑ کے دادا حضرت ادریسؑ نے کی تھی، جنہیں خدا نے قلم سے لکھنا سکھایا۔ بہر حال سیدنا اسماعیلؑ کی چالیسویں پشت سے "عدنان" ہوئے۔ جن کے بعد کی تمام نسلوں کے احوال تاریخ میں تفصیل سے لکھے ہوئے ہیں۔ انہی "عدنان" کی بیسویں پشت سے آقاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت ہوئی۔ [۹۰]

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں مکہ کے لوگ چوں کہ شیر خوار بچے صحت افزا مقام پر بھیج دیتے تھے، اس کی توجیہ میں مصنف کہتے ہیں:

شہر میں اِدھر اُدھر سے آئے ان گنت لوگوں کی وجہ سے نئی نئی بیماریاں بھی ادھر آجاتیں۔ جراثیم اور وائرس کہنے کو بہت بعد میں دریافت ہوئے مگر مکہ کے لوگوں کو اس حقیقت کا احساس تھا۔ وہ اس حقیقت سے بھی آشنا تھے کہ شیر خوار بچوں میں قوتِ مدافعت بڑوں کی نسبت کم ہوتی ہے۔ چھوٹے بچوں کو متعدی بیماریوں سے بچانے کے لیے ان کا تجربہ انہیں بتاتا تھا کہ بچے کو زندگی کے پہلے چند سال ایسی پراگندہ فضا سے دور پاکیزہ صاف ماحول میں پالا جائے۔ [۹۱]

قریشِ مکہ کے قبائل کے رہن سہن کے انداز کے بارے میں بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

قریش کے مکہ میں بسنے والے دس قبائل اپنی اپنی جگہ مکمل خود مختار ریاستوں کی طرح رہتے تھے۔ ہر قبیلے کے اندر اس کا اپنا قانون تھا۔ قبیلے کا سردار مطلق العنان بادشاہ کی طرح اپنے قبیلے کا نظام چلاتا تھا۔ قبائل کے آپس کے تعلقات ایک دوسرے کے احترام، برداشت اور باہمی بھائی چارے کے تھے مگر کوئی قبیلہ کسی دوسرے قبیلے کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کرنے سے گریز کرتا تھا۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے قبیلے کے کسی فرد کو کوئی گزند پہنچاتا تو دوسرا پورا قبیلہ اس تکلیف دینے والے قبیلے سے اس کا بدلہ لیتا۔ یہ طے شدہ قانون تھا۔ [۹۲]

آقاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں مکہ کے لوگوں کی معیشت کے بارے میں بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

ساڑھے تین ہزار فٹ اونچا وہ پہاڑی علاقہ پھلوں کے باغات اور فصلوں کی وجہ سے مشہور تھا۔ مکہ کے قبائل ہی کی وادی طائف میں بھی زرعی زمین تھی اور ساٹھ میل دور اس شہر میں مکہ کے نامور رئیس قبیلوں کا عام آنا جانا تھا۔ کھجور کے باغات کے لیے یثرب اور خیبر کی زمین مشہور تھی۔ مکہ میں بارشیں نہ ہونے کی وجہ سے ہریالی نہیں ہوتی تھی۔ وہ ایک بہت بڑی تجارتی منڈی تھی جہاں خانہ کعبہ اور اس میں موجود تین سو اسی بتوں کی وجہ سے پورے عرب کے لوگ باقاعدگی سے مذہبی رسوم کی ادائیگی کی وجہ سے ادھر آتے تھے۔ لوگوں کے آنے جانے سے ہی اس شہر کی تجارت تھی۔ اسی سے ان کی معیشت کا پہیہ چلتا تھا۔ [۹۳]

مصنف نے آقاﷺ میں مختلف علاقوں کی ان کے حدود اربعہ کے ساتھ وضاحت کی ہے۔ نبی کریم ﷺ کی داستانِ حیاتِ پاک کو عرب کے جغرافیے اور محلِ وقوع کے تناظر میں بیان کیا ہے۔انھوں نے واقعاتِ سیرت کے بیان سے پہلے ان علاقوں کے جغرافیائی حالات بتائے ہیں۔ مختلف راستوں کی وضاحت اس انداز سے کی ہے کہ نہ دیکھنے کے باوجود ان کی تصویر گویا نگاہوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ مدینے کے جغرافیائی خطے کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> مکہ کے روسا کی معاشی زندگی کی شہ رگ یثرب تھا۔ وہ تجارت پیشہ لوگ تھے۔ایک طرف سے اونٹوں پہ لاد کے سامان لاتے، دوسری طرف جا بیچتے۔۔۔۔ راہ میں یثرب تھا۔ شام سے یمن کی طرف آتے، تو پھر وہی راہ۔ مکہ سے فلسطین، مصر، روم، ترکی، جس طرف بھی قافلہ جاتا، بحیرہ احمر کے ساحلوں کے ساتھ ساتھ ہو کے جانا پڑتا۔ وہی راہ یثرب کے ہاتھوں میں تھی۔ [۹۴]

واقعہ معراج سے پہلے مکہ اور فلسطین کے مابین فاصلے کی نشان دہی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> مکہ سے فلسطین میں موجود بیت المقدس کا فاصلہ ۱۳۰۰ کلو میٹر ہے، شہر ۳۱ درجے ۴۵ دقیقے طول بلد مشرقی بلد شمالی اور ۳۵ درجے ۱۳ دقیقے طول بلد مشرقی پر واقع ہے۔ بیت الحم اور الخلیل اس کے جنوب میں ہیں۔ اور رام اللہ شمال میں، بیت المقدس پہاڑیوں پہ آباد ہے۔ اسی "پاک کرنے والے گھر" کو رومیوں نے پہلی صدی ق م میں "ایلیا" کا نام دیا تھا۔ [۹۵]

ہجرت کے دوران عبداللہ بن اریقط نے مدینہ کی طرف رہنمائی کی تھی۔ وہ جن راستوں سے آپ ﷺ کو مدینہ لے کر گئے، مصنف ان راستوں کی تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> پہلے وہ جبلِ ثور سے مکہ سے جدہ کی طرف ساحل سمندر کی طرف گیا۔ پھر ساحل سے ذرا پہلے اس نے موڑ دائیں طرف شمال کو لیا۔ پھر راہ میں مدینہ جاتی شاہراہ کو کاٹ کے اس راستے کے شمال میں دور تک چلا گیا۔ پھر آگے "امج" کے مقام سے مدینہ جانے والے راستے کو کاٹ کے پھر ساحلی پٹی کے قریب ہو گیا۔ یوں وہ انگریزی لفظ "ایس" کے اوپر "ایس" بناتا ہوا، مدینے کے روایتی راستے سے بہت دور اطمینان سے اس مقدس فاصلے کو لے جاتا رہا۔ پھر باقی کا راستہ بھی اس نے ساحلی سمت پہ رکھا۔ [۹۶]

غزوہ بدر سے پہلے بدر کے مقام کی حدود بتائیں کہ بدر مدینہ کے اطراف میں کہاں واقع ہے۔ مصنف بتاتے ہیں:

> بدر ایک ساڑھے چار اور ساڑھے پانچ کلو میٹر کا بیضوی ریتلا میدان تھا۔ جس کی ریت دونوں کناروں پہ جمع ہو کے ٹیلے بناتی تھی۔۔۔۔۔ بدر کے اسی ریگزار میدان کے دونوں طرف اونچے

پہاڑ ہیں۔ان پہاڑوں کے بیچ صحرائی میدان کے ساتھ ایک بڑا اونچا بنجر خشک چٹانی پہاڑ ہے، جو جبلِ اسفل کہلاتا ہے، اس پہاڑ پہ چڑھو تو جنوب مغرب میں دس میل دور پھیلا ہوا سمندر، بحیرہ قلزم کا نیلا پانی صاف نظر آتا ہے۔[۹۷]

واقعات کے بیان میں جہاں مناسب سمجھتے ہیں، ان علاقوں کے بارے میں قاری کی معلومات میں اضافہ بھی کرتے چلے جاتے ہیں۔ کوہِ صیہون کے بارے میں بتاتے ہیں کہ اسی کے نام پر یہودیوں نے اپنی تخریب کار عالمی تحریک کا نام صیہونیت رکھا۔[۹۸]

سیرت نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ عسکری سائنس جانتا ہو، تاکہ بحیثیت سپہ سالار حضور پاک ﷺ کی فاتحانہ صلاحیتوں سے آگاہی حاصل کرے۔ ہم نے آج تک آپ ﷺ کو رحمت اللعالمینؐ کے روپ میں زیادہ سنا، سوچا اور پڑھا ہے، کیوں کہ ہمارے اکثر سیرت نگاروں نے محبت اور عقیدت کی چاشنی کے ساتھ آپ ﷺ کی ذاتِ پاک کی ترجمانی کی، لیکن آپ ﷺ کی عسکری طاقت و بصیرت سے آگاہی بھی مردِ مومن کے لیے اسی طرح ضروری ہے جیسے آپ ﷺ سے محبت ایمان کی شرطِ اوّل ہے۔ابدال بیلا چوں کہ خود بھی پاکستانی فوج سے منسلک رہے، اس لیے آپ ﷺ کی ان کامیابیوں کا تجزیہ کرتے ہیں، جو آپ ﷺ نے بحیثیت سپہ سالار اور جرنیل کے حاصل کیں۔اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

تیس سال میں نے پاکستان آرمی، پاکستان نیوی اور سعودی آرمی میں مختلف عہدوں پہ رہ کے مختلف درجات پہ کمانڈ کی ہے۔ ہماری جدید عہد کی ماڈرن افواج نے اپنی تربیت انگریزوں سے سیکھی اور اسے آگے بڑھایا۔ انگریز نے دو عالمی جنگوں کے علاوہ یورپ کے اندر صدیوں تک آپس میں جنگ کرتے کرتے، پھر دنیا کے بڑے حصے کو محکوم بناتے سے ہزارہا جنگیں لڑیں۔ صرف دوسری عالمگیر جنگ میں ساڑھے چار کروڑ لوگ مرے۔ ہزاروں شہر، لاکھوں بستیاں مٹ گئیں۔ مگر ان سب کی تربیت کا اگر نچوڑ دیکھا جائے تو اس کے بنیادی اصول بغیر تشدد اور بے رحمی کے وہی نظر آتے ہیں، جو پندرہ سو سال پہلے آقا ﷺ نے ایک عالمی سطح کے بہترین تاجدار جرنیل کے طور پر طے کیے تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اتنے پیچیدہ حالات، کم وسائل اور ایسی جگہ پہ اتنے کم وقت میں جو کامیابیاں آقا ﷺ نے حاصل کیں وہ دنیا کا کوئی سپہ سالار حاصل نہ کر سکا۔[۹۹]

مصنف نے آقا ﷺ کتاب میں مختلف غزوات کے ذکر میں آپ ﷺ کی دفاعی حکمتِ عملیوں کا بھی تجزیہ کیا ہے۔ غزوہ خندق میں آپ ﷺ کی حکمتِ عملی کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں کہ:

آقا ﷺ نے اس زمانے میں ایسی جدید سرعت رفتار جارحانہ دفاعی فوج کی تشکیل کی، جو اکیسویں صدی میں امریکہ اور نیٹو نے اپنائی اور اسے ریپڈ ڈیپلائمنٹ فورس کا نام دیا ہے۔ مرکزی کمان آقا ﷺ نے اپنے ہاتھ رکھی۔ کمانڈ پوسٹ کھدائی کے وقت تو فارورڈ کھودی جانے والی خندق کے ساتھ تھی۔ بعد میں اسے عقب میں مرکزی جگہ سلع پہاڑی کی گود میں اونچی جگہ پہ بنایا، جہاں

آج کل مسجد فتح بنی ہوئی ہے۔ اس مقام سے جنگ کا سارا منظر نامہ سامنے دھرا نظر آتا۔ جدھر کمک کی ضرورت ہوتی ادھر اپنے تیر انداز دوڑا دیے جاتے۔ یہ ساری جنگ دشمن کے پہنچنے سے پہلے لڑی گئی۔[100]

یوں تو سیرتِ نبوی ﷺ کی تمام تصانیف میں آقا ﷺ کی طرف سے اپنائی گئی حکمتِ عملیوں کا ذکر ہوتا ہے۔ لیکن آقا ﷺ میں ابدال بیلا کی طرف سے آپ ﷺ کی ہر حکمتِ عملی پر تبصرہ بھی ملتا ہے۔ مصنف نے آقا ﷺ کی جنگی بصیرت کا ایک اور پہلو سامنے رکھتے ہوئے بتایا کہ دراصل آقا ﷺ آنے والے زمانوں کے لیے فوجی قیادت کے اصول طے کر رہے تھے۔ مصنف لکھتے ہیں:

اب آقا ﷺ نے اپنے خاص زعما کا اجلاس بلایا اور فرمایا، "پوری صورتِ حال تم جان چکے ہو۔ ہمارا واسطہ ایک لشکرِ جرار کے ساتھ ہے۔ مجھے مشوہ دو۔ پروانے تو شمع پہ نثار ہونے کا بہانہ ڈھونڈتے ہیں۔ مشورہ کیا دیتے۔ مگر آقا ﷺ نے ایک اصول طے کرنا تھا۔ حکم لاگو نہیں کرانا تھا، مشاورت سے طے کروانا سکھانا تھا۔[101]

آقا ﷺ بہترین سپہ سالار اور جرنیل ہونے کے ساتھ ساتھ رحمت اللعالمین بھی تھے۔ آپ ﷺ کے کردارِ عظیم کے اس پہلو کے ذکر میں لکھتے ہیں:

قطاروں کی صف بندی کرواتے ہوئے آقا ﷺ خود لوگوں کو ایک سیدھی لکیر میں کھڑا کر رہے تھے۔ کچھ کو ہاتھ سے ہلاتے، کچھ کو ہاتھ میں پکڑی سوٹی سے اشارہ کر کے۔ ایک ساتھی کو پیچھے کرتے ہوئے آقا ﷺ کے ہاتھ میں پکڑی سوٹی اس کے پیٹ کو چھو گئی۔ وہ بولا، یارسول اللہ ﷺ آپ نے مجھے سوٹی سے دکھ پہنچایا۔ آپ سے بڑھ کے صاحبِ عدل کون ہے۔ مجھے اس کا قصاص چاہیے۔ میں نے بھی اس طرح آپؐ کے پیٹ پہ چوب کرنی ہے۔ اللہ اللہ۔ حالتِ جنگ۔ سپہ سالارِ اعظم رسول خدا ﷺ سے یہ تقاضا۔ دنیا کی کوئی بھی فوج ہوتی، کوئی جرنیل ہوتا، تو اسے اسی وقت قتل کر دیتا۔ مگر وہ رحمت اللعالمین ﷺ تھے۔ خدا نے یہ ثابت کروانا تھا۔ آقا ﷺ نے ہاتھ اٹھا کے اپنا خالی پچکا ہوا پیٹ اس کی دسترس میں دے دیا۔ سوٹی اس کے ہاتھ میں پکڑا دی۔ وہ سواد بن غزیہ رضی اللہ تھا۔ بولا، "آقا ﷺ میرا پیٹ ننگا ہے، آپؐ بھی اپنی عبا ہٹائیے۔" آقا ﷺ نے اپنے شکم مبارک سے کپڑا ہٹا دیا۔ پھر سواد بن غزیہ رضی اللہ ایک بکری کے ذبح ہوئے بچے کی طرح بلکتا ہوا جھکا اور آقا ﷺ کے جسم اقدس پہ اپنے لب رکھ کے رونے لگا۔ چومنے لگا۔ اس کا بند بند کانپ رہا تھا آقا ﷺ نے پوچھا۔ "سواد تم نے ایسے کیوں کیا؟" سواد بولا، آقا ﷺ شہادت کی تمنا لے کر آیا ہوں۔ سوچا پھر شاید کبھی آپ کے جسم مبارک کو چوم نہ سکوں۔ میری اس گستاخی کو معاف کر دیجیے گا۔ میں صرف ایک غلام ہوں آپ کا، جو آپؐ کے جسم کے ایک بوسے کی خاطر ہزار بار اپنی جان قربان کر سکتا ہے۔ آقا ﷺ نے برکت کی دعا دی۔[102]

سیرت نگار کے لیے نفسیات سے شناسائی بہت ضروری ہے، تاکہ واقعات کے محرکات اور ان کے اسباب و علل پر بحث کرتے ہوئے اپنے تجزیے کو درست سمت دے سکے۔ آقا ﷺ کے زمانے میں اسلام قبول کرنے والوں کی قلبی کیفیات سے نہ صرف خود آگاہ ہو، بلکہ قارئین پر صحیح انداز سے آشکار بھی کر سکے۔ آقا ﷺ کے مصنف نے بھی

اپنی تصنیف میں جابجانفسیاتی تجزیے کی مدد سے مختلف کرداروں کے باطنی محرکات تک رسائی کی کوشش کی ہے۔ جب کوئی انسان اپنے ضمیر کے خلاف کوئی بات یا عمل کرے تو اس کا ضمیر اسے چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ مصنف خالد بن ولید کے اسلام لانے سے قبل، خارجی محرکات کے زیرِاثر، ان کی اندرونی کش مکش کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> سوچتا تو عرصے سے رہا تھا پہلے بھی جب وہ کسی معرکے میں مسلمانوں سے لڑ کر آتا تو اسے دل پہ بوجھ محسوس ہوتا۔ لگتا وہ ایک لاحاصل اور بے سود سمت میں خود کو ضائع کر رہا ہے۔ حدیبیہ کے موقع پہ خالد کو خیال آیا کہ مسلمانوں پہ نماز کی حالت میں گھڑسوار دستے سے حملہ آور ہو، خالد اپنے ارادے کے باوجود یہ نہ کر سکا۔ اسے محسوس ہوا کہ جیسے اس کے ارادے سے آقا ﷺ باخبر ہو چکے ہیں۔۔۔۔ خالد بن ولید پہ اپنی خالہ سیدہ میمونہ کے فیصلے سے بھی بہت اثر پڑا۔ اس نے سوچا کہ ایک عورت اس سے بہتر اور جلدی خیر کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ پھر وہ تو مکہ کا مانا ہوا سب سے کامیاب رسالے کا سالار تھا۔ جنگ کے میدان میں اس کا ذہن عقاب کی آنکھ بن کے سرعت اور نشانے پہ ایسے شاندار فیصلے کرتا کہ کسی جنگ میں اسے کبھی ہار نہ ہوئی۔ اب پہلی بار زمانہ امن میں، خالد بن ولید نے جنگی حکمتِ عملی جیسا جی دار فیصلہ کر لیا تھا۔ [۱۰۳]

انسان کی نفسیات ہے کہ اسے زندگی میں جتنی بھی خوشیاں یا راحتیں نصیب ہو جائیں، لیکن وہ اپنے اوپر بیتے جانے والی تکلیف اور دکھ کو نہیں بھلا پاتا۔ وہ جب کسی دکھ یا غم میں مبتلا ہوتا ہے تو اسے گزشتہ زندگی میں خود پر بیتے غم کے واقعات بھی یاد آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ مصنف نے انسان کی اسی کیفیت کا اطلاق آپ ﷺ کے دادا حضرت عبدالمطلب کی نفسیات پر کیا ہے۔ اپنے کم سن پوتے کی زبانی اس کی والدہ کے انتقال کی خبر سن کر ان کی نفسیاتی کیفیت کی ترجمانی مصنف نے اپنے تخیل کی مدد سے یوں کی ہے:

> سیدنا عبدالمطلب نے کتنی دیر اپنے کم سن لاڈلے پوتے کو گلے لگا کر آنسو بہائے ہوں گے، یہ رسولِ خدا ﷺ جانتے ہوں گے۔ دادا نے کیسے تڑپ تڑپ کے ننھے رسول خدا ﷺ اور ان کی آیا برکہ سے اپنی بیوہ بہو کی زندگی کے آخری دنوں کی داستان سنی ہو گی۔ سیدنا عبدالمطلب کو اس لمحے اپنے سب سے پیارے، سب سے سوہنے بیٹے سیدنا عبداللہ کی موت بھی یاد آئی ہو گی۔ وہ جس کے لیے انہوں نے سو اونٹ قربان کیے تھے۔ وہ جو رسولِ خدا ﷺ کی پیدائش سے دو ماہ پہلے ہی ان سے دور یثرب میں فوت ہو گئے تھے۔ ان کا غم کتنا شدید ہو گا۔ گزرا غم پھر سے تازہ ہو گیا ہو گا۔ [۱۰۴]

مصنف کبھی کبھی آقا ﷺ کی نفسیاتی کیفیت کی ترجمانی میں بھی اپنی ذاتی رائے اور تخیل کا سہارا لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آقا ﷺ نے اپنے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ کے قاتل وحشی کو بھی معاف فرما دیا تھا، لیکن اسے کہا تھا،

کہ "میرے سامنے نہ آنا۔" آقاﷺ کے اس فیصلے کی نفسیاتی توجیہ دیتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں کہ:

> مقصد اس سے نفرت کا اظہار نہ تھا۔ ذہن میں یہ تھا کہ اسے دیکھ کے اپنا محبوب دوست چچا یاد آئے گا اور اپنی اندر کی "انا" کی اس سوچ سے کوئی حس پھولے گی کہ دیکھو، اتنے بڑے جرم پہ بھی میں نے اسے معاف کر دیا۔ یہ انتہائے عجز کی بھی انتہا ہے۔ [۱۰۵]

جب حضرت عبد المطلب کا آخری وقت آیا تو مصنف نے اسی نفسیاتی کیفیت کا اطلاق آپﷺ کی ذاتِ اقدس پر بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ان کے ذہن میں شاید پھر یثرب میں بنی اپنے والد محترم کی قبر اور ابوا میں راستے میں بنائی اپنی ماں کی قبر کے مناظر ابھرے ہوں۔ ایک بار پھر وہ موت کے ہاتھوں اپنی پیاری ہستی کے کھو جانے کے غم سے لرزے ہوں۔ [۱۰۶]

سیرت نگاری جیسے نازک موضوع میں علمِ نفسیات کے اطلاق کے حوالے سے یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ نفسیات در حقیقت ذہنی سر گرمیوں کا علم ہے۔ وہ واقعات جو ۵۷۱ء میں رونما ہوئے، ان کے بارے میں جان کاری پندرہ سو سال بعد کرنی ہے۔ ماضی کے بارے میں گفتگو چوں کہ نتائج کو دیکھ کر ہوتی ہے، اس لیے اس حوالے سے مفروضات تو قائم کیے جا سکتے ہیں لیکن انہیں مکمل حقیقت نہیں کہا سکتا۔ یہ مفروضات تبھی وجود میں آتے ہیں، جب تجربہ اس زمانے کے انسانی افعال و کردار سے جڑا ہوا ہو۔ چیزیں سیاق و سباق کے بغیر اپنی حقیقت کی طرف نہیں جا سکتیں۔ اس لیے آج کے مصنفین ماضی کے کرداروں کی ذہنی سر گرمیوں کی تہہ تک اس لیے مکمل طور پر نہیں پہنچ سکتے، کیوں کہ ان کے پاس ماضی کے واقعات کا مکمل سیاق و سباق نہیں ہوتا۔ جہاں تک نفسیاتی تجزیے کا تعلق ہے، تو ماضی کے دیگر کرداروں کی نفسیات کا جائزہ تو عام انسانی افعال کے تناظر میں لیا جا سکتا ہے، لیکن نبی پاکﷺ کی ذاتِ اقدس کے بارے میں چوں کہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ آپﷺ نہ تو اپنی مرضی سے کچھ بولتے تھے اور نہ ہی کچھ کرتے تھے، اس لیے آپﷺ کے افعال کے باطنی محرکات کا تجزیہ عام نفسیاتی اصولوں کی روشنی میں نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی اسے درست قرار دیا جا سکتا ہے۔

معاصر عہد سے سے ہم آہنگی:

جدید تصورِ علمیات کی روشنی میں سماجی علوم کے بڑھتے ہوئے اثرات نے روایتی انداز کے طرزِ تحقیق کو بالکل بدل کے رکھ دیا ہے۔ عصر حاضر میں تحقیق کے نئے اسلوب کے تحت سیرت نگاری کے موضوعات میں بھی جدت کا تقاضا کیا جانے لگا ہے۔ بہت سے ایسے موضوعات، جن پر پہلے سیرت نگار کھل کے نہیں لکھتے تھے، آج کے اس دور میں ان موضوعات پر نوجوان نسل کی طرف سے دلائل کا تقاضا کیا جانے لگا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ سیرت نگاری

میں نسل نو کے ذہن، اس کے ذوق اور سمجھ بوجھ کی موجودہ سطح کا خیال رکھا گیا ہو۔ اس حوالے سے آقا ﷺ کتاب کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مصنف نے اپنی تصنیف میں مندرجہ بالا لوازمات کا خیال رکھنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے سیرتِ طیبہ کے واقعات کے سیاق و سباق اور تفہیم کو جامع انداز میں قاری کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اپنی تصنیف میں عالم گیر کشش پیدا کرنے کے لیے مصنف نے ہر وہ حربہ استعمال کیا ہے، جو وہ کر سکتے تھے۔ ان کی اس تصنیف، جو کہ سوانح رسولِ مقبول ﷺ ہے، کا انداز سادہ اور عام فہم ہے۔ قاری خواہ کسی بھی عمر کا ہو، اس سے لطف اٹھا سکتا ہے۔ نئی نسل کے ذوق کے مطابق سادہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ انہیں واقعاتِ سیرت سے آشنا کرنے کے لیے مشکل اور دقیق زبان سے اجتناب کیا ہے، لیکن بیان میں لطافت پیدا کرنے کے لیے تشبیہ، استعارے اور محاورے کا استعمال کیا ہے اور وہ انگریزی الفاظ جو اردو میں مستعمل ہیں، اس طرح استعمال کیے ہیں کہ پڑھنے کے دوران روانی میں خلل نہیں پڑتا، بلکہ مطلب کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ مثلاً:

معطم بن عدی کے قبیلے کے لوگوں نے ننگی تلواروں کی چھاؤں میں آقا ﷺ کو گارڈ آف آنر زدی۔[۱۰۷]

ریت کی کھائی میں آتے اور جاتے ہوئے اونچے درخت کی تمام گہری جڑوں کے فنگر پرنٹس محفوظ ہو گئے۔[۱۰۸]

مکہ کے رئیس زادوں کو جزیرہ نما عرب میں اپنی بٹھائی دھاک، دہشت اور جسے آج کل "رِٹ آف اتھارٹی" کہتے ہیں، وہ ڈگمگاتی نظر آ رہی تھی۔[۱۰۹]

اسلامی فوج کے سالاروں نے سفید جھنڈا اٹھایا، فلیگ ٹیگ کے ساتھ سید نا رضی اللہ کا جنازہ کندھوں پہ رکھا قسطنطنیہ کے مضبوط ترین قلعے کی دیوار کی طرف چل پڑے۔[۱۱۰]

اس صورتِ حال کا کاؤنٹر اٹیک کے بعد کا پلان پہلے شاید اس لیے نہ بنایا گیا کہ توقع ہی نہیں تھی کہ کہ آقا ﷺ کے حکم کی حکم عدولی ہو۔[۱۱۱]

ان کے علاوہ بھی بہت سی مثالیں ہیں جہاں مصنف نے اپنی بات کی آسان تفہیم کے لیے انگریزی الفاظ کا استعمال کیا۔ ان الفاظ کے استعمال سے جملے کی سادگی پر کوئی حرف نہیں آتا نہ ہی اردو متن میں یہ الفاظ اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔

آج کل کے دور میں جہاں ہر کوئی اپنے مذہب، مسلک اور فرقے کو سچا ثابت کرنے پر تلا ہے۔ بلاشبہ اس مقصد کے لیے سب سے بڑا ہتھیار مذہبی کتب ہی ہیں، لیکن ابدال بیلا دعویٰ کرتے ہیں کہ "یہ کتاب توڑنے والی نہیں۔ لوگوں کو آقا ﷺ کی محبت کے صدقے جوڑنے والی کتاب ہے۔"[۱۱۲] زبور، توریت، انجیل اور ہندوؤں کی مقدس کتب میں آقا ﷺ کے آنے کی شہادتیں تحریر کیں تو آخر میں کہتے ہیں کہ:

اس لیے تو قرآن ہمیں حکم دیتا ہے کہ پہلے سب صحیفوں اور کتابوں پہ ایمان لاؤ۔ جن کتابوں پہ ایمان لانا ہے ان کی ایک چھوٹی سی نشانی یہ ہے کہ ان میں میرے آقاﷺ کی مدح اور پیشن گوئیاں ہیں، جو اللہ نے ان کتابوں سے مٹنے نہیں دیں۔ یہ خدا کی محبت کا تقاضا ہے، جس نے حکم دیا: "خدا اور اس کے فرشتے پیغمبر پہ درود بھیجتے ہیں، مومنو! تم بھی پیغمبر پر درود اور سلام بھیجا کرو۔" (القران، سورۃ الاحزاب، آیت ۵۲)

یہ درود پاک، مدح رسولﷺ، یہ آقاﷺ کی شان میں قصیدے، اللہ نے اپنے ہر نبی کے منہ سے کہلوائے، اپنی ہر مقدس کتاب اور آبرو مند صحیفے میں لکھ کے بھیجے، لکھوائے اور محفوظ کیے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ جہاں اللہ کی حمد و ثنا کہتا ہے، وہیں وہ آقاﷺ پہ درود و سلام بھی بھیجتا ہے۔ کسی کو سننے والے ایسے کان ملے ہوں تو وہ یہ سنے اور خدا کی قسم شک نہ کرے۔ [۱۳]

یوں محسوس ہوتا ہے گویا غیر مسلموں کو جتلا رہے ہوں کہ تم چاہے ہماری کتاب اور رسولﷺ کو مانو یا نہ مانو، ہمیں قرآن پاک کے ذریعے بتادیا گیا ہے کہ تمہاری مقدس کتب میں ہمارے آقاﷺ کی مدح اور انؐ کے آنے کی پیشن گوئیاں موجود ہیں۔

دورِ حاضر کے قاری کو عہدِ نبویﷺ سے آشنا کرنے کے لیے مصنف نے جابجا نبی اکرمﷺ کے عہد کا موجودہ دور سے موازنہ کیا ہے، تاکہ قاری اپنے مسائل کے حل کے لیے آپﷺ کے سماج سے رابطہ کرے۔ مصنف کا یہ انداز ان کے اس رویے کی غمازی کرتا ہے کہ بے شک انسانیت کی فلاح اسوہ رسولﷺ کی پیروی میں ہی ممکن ہے۔ اگر کوئی حکمران اپنے خطے کو ریاستِ مدینہ کی طرح بنانا چاہے، (جیسا کہ ریاستِ پاکستان کے حوالے سے یہ خواب دیکھا جارہا ہے کہ اسے ریاستِ مدینہ کی طرح بنایا جائے گا) تو مصنف ریاستِ مدینہ کے قوانین کی روشنی میں وہ سنہرے اور رہنما اصول بتاتے ہیں، جو کسی بھی جدید ریاست کے آئین کی وضاحت کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

کوئی گھر ہو، کوئی بستی ہو، گاؤں ہو، ریاست ہو یا مملکت، اسے خوش اسلوبی، عدل، مساوات اور خیر سگالی سے چلانے کے لیے چند بنیادی اصولوں کو اپنانا پڑتا ہے، کچھ نہ کچھ طے کرنا پڑتا ہے کہ جب کبھی کوئی غیر معمولی صورتِ حال آئے، کوئی فیصلہ کرنے کی گھڑی ہو تو کس کا فیصلہ آخری ہوگا؟ لوگوں کا آپسی تعلق کیا ہوگا؟ اس کی بنیاد کیا ہوگی؟ کس کے کس پہ کیا حقوق ہوں گے؟ فرائض کیا ادا کرنے ہوں گے سب نے؟ امن اور آشتی کے لیے کیا کیا کرنا پڑے گا؟ جرم ہوگا تو سزا کیا ہوگی؟ کون فیصلہ دے گا؟ طریقہ کار کیا ہوگا؟ اپنے اپنے رسم ورواج، پسند، مذہب اور دینی امور کو کیسے آزادی سے بغیر کسی خوف کے سرانجام دینا ہوگا؟ لڑائی اور صلح کا منظر نامہ کیا ہوگا؟ حلیفوں سے تعلق اور دشمنوں سے دشمنی کا کیا مول ہوگا؟ پوری بستی اور پوری ریاست کے دفاع کا خرچہ کس

قدر با ہمی ہو گا؟ ریاستِ مدینہ کے لوگ کیا ایک قوم تصور کیے جائیں گے ؟ یہ تھے وہ بنیادی سوال، جو ہزاروں سال بعد بھی کسی جدید ریاست کے آئین کے خد و خال آج بھی مرتب کرتے ہیں۔[۱۱۴]

یہ حقیقت ہے کہ مغربی استعماریت کے ابتدائی دور سے لے کر عہدِ حاضر تک مسلمان سیرت نگاروں اور دانش وروں سمیت زیادہ تر لوگ جدید مغربی افکار سے متاثر نظر آتے ہیں، شاید یہی وجہ ہے کہ کئی سیرت نگاروں کے ہاں معجزاتِ نبوی ﷺ کے بارے میں مدافعانہ رویہ پایا جاتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ معجزات نہ صرف انسانوں کی روحانی فلاح کا باعث بنتے ہیں، بلکہ ان کی مادی ترقی کی تمہید بھی بنتے ہیں۔ سید از کیا ہاشمی اپنے مضمون "سیرت نگاری میں معجزات کا مطالعہ اور جدید رجحانات" میں ترک مفکر فتح اللہ گولن کے معجزاتِ نبویؐ کے بارے میں ترقی پسندانہ نقطہ نظر کے بیان میں بتاتے ہیں کہ :

ان کے نزدیک انسانیت نے مادی ور وحانی ہدایت کی تمام کنجیاں انبیا کرامؑ سے حاصل کی ہیں۔ قرآن کریم نے انبیا کرامؑ کے معجزات کی وضاحت کرتے ہوئے انسانیت کو اس بات کی دعوت و ترغیب دی ہے کہ وہ ان آخری حدود تک پہنچنے کی کوشش کریں، جنہیں انبیا کرامؑ نے اپنے معجزات کے ذریعے مقرر کیا ہے۔[۱۱۵]

ابدال بیلا بھی آج کے انسانوں، بالخصوص مسلمانوں کے دل میں یہ احساس اجاگر کرتے ہیں کہ کائنات کی تسخیر کے لیے، جن باتوں پہ مسلمانوں کو عمل کا حکم ملا ہے وہ ان باتوں کو فراموش کر چکے ہیں، جب کہ غیر ان ہی باتوں پہ عمل کر کے پوری دنیا پر حکمرانی کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ آج کی نسل غور و فکر کرنے کی صلاحیت سے عاری ہو رہی ہے۔ ابدال بیلا قارئین کو دعوتِ فکر و عمل دیتے ہوئے قرآن و حدیث سے اپنی بات کی تاویل پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

آقا ﷺ نے غور و فکر کرنے پر زور دیا۔ اللہ نے بھی مہر تصدیق لگا دی اور کہہ دیا کہ جو لوگ غور نہیں کرتے اللہ کی نشانیوں پہ، وہ انسان نہیں جانور ہیں، بلکہ ان سے بھی بد تر۔ جس جس نے غور کیا۔، ان کو راستہ ملا، انہیں انعام ملا۔ ابھی تک مل رہے ہیں۔ خدا نے زمین و آسمان اور جو جو اس کے بیچ میں اس نے تخلیق کیا، سب پہ سوچنے اور غور کرنے کا حکم دیا۔[۱۱۶]

اس کے ساتھ ہی نئی نسل کی غور و فکر نہ کرنے والی عادت جتلا کر، ان کی کمزوری سے آگاہ کر کے تنبیہ بھی کر رہے ہیں :

۔۔۔خدا نے قرآن میں کیا کچھ نہیں بتایا۔ کتنی بار حکم دیا کہ سوچو، غور کرو۔ ان باتوں پہ غور کرو۔ یہ ساری باتیں وہ ہیں، جنہیں آج کا ہمارا علم سائنس کہتا ہے۔ ان پہ سوچنے، غور کرنے اور انعام پانے کا اعلان ہوا ہے۔ اسی کو انگریزی میں ریسرچ کہتے ہیں۔ اسی کو ترجیح دی گئی۔ ہم نے الٹ کیا۔ جہاں سوچنے کا حکم ملا، اسے رٹ کے آگے چلے گئے۔ سوچا ہی نہیں، سوچنے بھی نہیں دیا۔ جہاں سیدھا سادھا قانون

دیا، سوچنے کی بات نہیں کی، عمل کرنے کا حکم نہیں دیا، وہاں سوچنے لگے۔ یہ کرو، یہ نہ کرو، وہاں سوچ میں پڑ گئے۔ مناظرے کرنے لگے۔ فرقے بنا لیے۔۔۔۔۔اب غور و فکر، سوچنے اور کچھ کرنے کے لیے خدا نے بار بار اس شدت سے جو تلقین کی، وہ غیروں نے سن لی، پلے باندھ لی۔ انہوں نے پرندوں سے اڑنا سیکھا، ہوائی جہاز بنائے۔ پانی کو سمجھا، اس سے قوت لی۔ آسمانی بجلیوں کا سراغ لگایا، اپنے شہر روشن کیے۔ انہوں نے وقت کے پہیے کی رفتار کو سوچا اور ہم سے صدیوں آگے نکل گئے۔ ہم وہ بدنصیب، جن کے لیے سارے حکم نامے اترے، وہ اسے سمجھے بغیر آنکھیں بند کر کے گردنیں ہلا ہلا کے اسے رٹتے رہے۔[۱۱۷]

آخر میں اپنے فہم سے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنا زیادہ تر وقت لاحاصل اور بے مقصد مباحث میں صرف کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنا وہ مقام گنوا دیا ہے، جو ان کی میراث تھا۔ وہ مسلمانوں کی اسی بے مقصد بحث کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> سوچا اور غور کیا کچھ بھی نہیں۔ کہیں سوچا بھی تو اس بادام کے چھلکے کو سوچا، اخروٹ کے ہڈی نما خول پہ غور کیا، مگر ان کے اندر جو مغز ہے، جو گری ہے، ساری تاثیر، سارا اثر، ساری فوقیت جس میں ہے، اسے چھوا ہی نہیں۔ ظاہر ہے ہم جب تک اخروٹ کا چھلکا نہیں توڑیں گے، اس کی گری تک کیسے پہنچیں گے؟[۱۱۸]

ابدال بیلا کی تصنیف آقاﷺ میں جب بھی معجزات کا بیان آتا ہے، تو ان کے لہجے سے نبی پاکﷺ کے لیے عقیدت و محبت جھلکتی ہے۔ وہ قاری کو معجزات پہ یقین کرنے یا نہ کرنے پر اکساتے نہیں، لیکن وہ صرف معروضی انداز میں معجزات کے بیان پر ہی اکتفا نہیں کرتے۔ کہیں تو وہ معجزات کی سائنسی تاویل پیش کر کے اہلِ دنیا کو معجزات کی صداقت کا جواز بتاتے ہیں تو کہیں معجزات کے بیان سے آقاﷺ کی عظمت کی دلیل دیتے نظر آتے ہیں۔ واقعہ معراج کی تفصیل بتانے کے بعد اس واقعے کی سائنس کی روشنی میں تاویل پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> سائنس اس حقیقت کو مانتی ہے۔ یہ رفتار روشنی کی رفتار سے ہزار گنا زیادہ تیز ہے۔ یہ اصل میں کسی بھی رفتار سے تیز ہے۔ اس رفتار کو کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ یہ ایسا عمل ہے، جو کائنات بناتے سمے قائم ہوا تھا، جب وقت ابھی تخلیق نہیں ہوا تھا۔ ایسا ہی وقت قیامت کے دن ہو گا۔ ہر جگہ ایک ہی کیفیت ایک ہی وقت میں ہو جائے گی۔ مگر آقاﷺ کی عظمت اور توقیر کے لیے آقاﷺ کی زمین، دنیا کا وقت اس لمحے کائنات کے وقت سے الگ کر دیا گیا۔ روکے رکھا گیا۔[۱۱۹]

مصنف کے نزدیک معجزات نبویﷺ پہ یقین، کامل ایمان کی علامت ہے۔ اس لیے جب بھی نبی پاکﷺ سے منسوب کسی بھی معجزے کا ذکر کرتے ہیں تو آپﷺ کی عظمت کے سامنے اس معجزے کو معمولی اور عام بنا کر پیش کرتے ہیں، جیسے یہ ثابت کر رہے ہوں کہ میرے مولاﷺ کی عزت و عظمت کے سامنے ایسی کرامات کوئی بڑی بات نہیں، گویا کائنات کی ہر شے آقاﷺ کی غلام ہے۔ رکانہ نامی پہلوان نے جب آپﷺ کے سامنے

یہ شرط رکھی کہ وہ آپؐ کا پیغام تب قبول کرے گا جب وہ کیکر کا پرانا درخت خود چل کے آ کے آپ ﷺ کی گواہی نہیں دے گا۔ اس واقعے میں درخت کے نبی کریم ﷺ کے پاس چلے آنے کو اتنے سادہ انداز میں بیان کیا، جیسے درخت کا چلنا نبیؐ کی شان کے سامنے نہایت معمولی واقعہ ہو۔ لکھتے ہیں:

> آقا ﷺ نے اس کی بات سنی اور مسکرتے ہوئے اپنا رخِ روشن کیکر کے اونچے، مضبوط پھیلے درخت کی جانب کر کے خدا جانے محبت سے بلاوے کا کیا اشارہ دیا کہ زمین سر سرائی، بکریوں کا ریوڑ ہلا، صدیوں سے صحرا میں جمے پتھروں میں لرزا آیا، جیسے ہر پتھر آقا ﷺ کو سجدہ کرنے کے لیے اپنا ماتھا رگڑنے کو بے تاب ہو۔ ریت زمین میں دراڑیں پڑیں اور گزوں موٹے تنے والا کیکر کا درخت ایک غلام کی طرح پتھروں کی چٹانوں اور مٹی ریت سے بنی گزر گاہ سے سرکتا ہوا آقا ﷺ کی طرف آنے لگا۔ [۳۰]

آج اکیسویں صدی میں سیرت نگاری کے ایسے اسلوب کی اشد ضرورت ہے، جس کی بنیاد نئی نسل کے ذوق اور فہم کے مطابق رکھی گئی ہو۔ آقا ﷺ کے مصنف نے بھی اپنی تصنیف میں سیرت نگاری کے روایتی اسلوب کی پیروی کی بجائے جدید سوانح نگاری کا انداز اپنایا ہے۔ سیرت کے واقعات کو زمانی ترتیب کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری آپ ﷺ کی سوانح پاک سے آشنا ہونے کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کی تعلیمات اور آپؐ کے اخلاقِ حسنہ سے بھی واقفیت حاصل کرتا چلا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی پوری تصنیف میں یہ بات اپنے پیشِ نظر رکھی کہ وہ اللہ پاک کے محبوب ترین نبی، جو کہ تمام انبیا کے سردار ہیں، کی حیاتِ مقدسہ پر لکھنے کی جسارت کر رہے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کو عام انسان کی بجائے نورِ مجسم سمجھ کر مصنف نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ مصنف نے تاریخی حقائق کو زمانی ترتیب کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انھوں نے اپنی تصنیف میں اپنے علم کی خواہ مخواہ کہیں نمائش نہیں کی، اپنے مسلک کا پرچار نہیں کیا، نہ ہی مختلف مسالک کی کہیں بحث چھیڑی ہے۔ جدید سوانح نگاری کے انداز کو اپنایا ہے اور کوئی واقعہ بار بار لکھ کے قاری کو کے مرتکز ذہن کو منتشر کرنے کی کوشش نہیں کی۔ پوری تصنیف میں انداز یہی رکھا ہے کہ پڑھنے والا جو بھی پڑھ رہا ہے وہ زمانی ترتیب سے تمام تفاصیل سے اس طرح آگاہی حاصل کرے کہ خود کو اسی منظر کا حصہ سمجھے، جیسے وہ سارا واقعہ خود دیکھ رہا ہو۔

آقا ﷺ کے اسلوب میں اختصار و ایجاز نمایاں ہیں۔ مصنف نے کسی بھی واقعہ میں لمبی چوڑی تفاصیل میں جانے سے گریز کیا۔ بہت کم الفاظ میں اپنا مدعا بیان کیا۔، لیکن کسی کسی جگہ مصنف نے اس حد تک اختصار سے کام لیا کہ واقعہ پوری طرح واضح نہیں ہو پاتا۔ کم الفاظ میں پورے معانی کا ابلاغ ہو جائے، تو ہی اسے ایجاز کہا جاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس قدر کم الفاظ منتخب کیے جائیں کہ مدعا ہی پوری طرح سمجھ نہ آئے۔

ابدال بیلا نے بہت سی جگہوں پر روایاتِ سیرت کی تنقید و تنقیح بھی کی ہے، بلکہ ایک جگہ تو باقاعدہ جدید سیرت نگاروں کو ردِ روایت کا اختیار دینے کا بھی مطالبہ کیا ہے۔ مصنف نے جو بھی واقعہ بیان کیا ہے اس کے ساتھ واقعے کی تفہیم کے لیے اپنی ذاتی رائے ضرور دی ہے۔ کسی بھی واقعے سے پہلے یا بعد میں اس واقعے کے متعلق اپنی ذاتی رائے دینے کے بعد، اگر ضروری ہو تو بحث و تمحیص سے بھی کام لیا ہے۔ مصنف اکثر واقعات کے بیان سے پہلے استقرائی انداز اختیار کرتے ہیں۔ واقعے کے بیان سے پہلے اس کے سیاق وسباق یا پھر اس واقعہ کی کی وضاحت کرتے ہیں، تاکہ قاری کا ذہن واقعہ کی طرف متوجہ ہو جائے۔ کبھی کبھی استخراجی انداز میں واقعے کے بعد کی تفصیلات بیان کرتے ہیں، جیسے حقائق کی وضاحت کر رہے ہوں۔

ابدال بیلا نے اپنی تصنیف میں قبل طلوع اسلام کے معاشرے کی عکاسی کے ساتھ ساتھ حضور اکرم ﷺ کے زمانے کے معاشرتی نظام پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ عہد نبویؐ میں مسلم معاشرے کی تشکیل اور اس کے امتیازی اصولوں سے متعارف کرواتے ہیں۔ مصنف نے نہ صرف اس عہد میں اخلاقی و سماجی اور سیاسی حالت اور غریب طبقے کی بے چینی اور اضطراب کو بیان کیا ہے، بلکہ اس معاشرے پر نبی کریم ﷺ کے آفاقی پیغام کے مثبت اثرات کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

سیرت نگار کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے کہ وہ متعلقہ ملک کی قدیم تاریخ کے بارے میں اچھی طرح آگاہ ہو۔ آقا ﷺ کے مصنف کا انداز یہ ظاہر کرتا ہے کہ انہوں نے عرب کی قدیم تاریخ کا مطالعہ کیا ہے۔ واقعات کے بیان میں جہاں مناسب سمجھتے ہیں، ان علاقوں کے بارے میں قاری کی معلومات میں اضافہ بھی کرتے چلے جاتے ہیں۔

ابدال بیلا چوں کہ خود بھی پاکستانی فوج سے منسلک رہے، اس لیے بہت باریکی سے آپ ﷺ کی ان کامیابیوں کا تجزیہ کرتے ہیں، جو آپ ﷺ نے بحیثیت سپہ سالار اور جرنیل کے حاصل کیں۔ انھوں نے آقا ﷺ کتاب میں مختلف غزوات کے ذکر میں آپ ﷺ کی دفاعی حکمتِ عملیوں کا بھی تجزیہ کیا ہے۔ یوں تو سیرتِ نبوی ﷺ کی تمام تصانیف میں آقا ﷺ کی طرف سے اپنائی گئی حکمتِ عملیوں کا ذکر ہوتا ہے۔ لیکن آقا ﷺ میں ابدال بیلا کی طرف سے آپ ﷺ کی ہر حکمتِ عملی پر تبصرہ بھی ملتا ہے۔ مصنف نے آقا ﷺ کی جنگی بصیرت کا ایک اور پہلو سامنے رکھتے ہوئے بتایا کہ دراصل آقا ﷺ آنے والے زمانوں کے لیے فوجی قیادت کے لیے اصول طے کر رہے تھے۔

آقا ﷺ کتاب میں مصنف نے سیرت کے واقعات کی تاویل میں قرآنی آیات سے استفادہ کیا ہے، لیکن ان میں سے اکثر کا صرف اردو ترجمہ ہی دیا ہے۔ انجیل، زبور، تورات اور ہندوؤں کی مقدس کتب سے بھی حوالے اردو میں ہی درج کیے ہیں۔ احادیث کی اہم کتب میں سے زیادہ تر ابنِ کثیر اور ابن ہشام کے حوالے دیے ہیں، کچھ دیگر کتبِ

احادیث کے حوالے بھی درج ہیں۔ مثلاً صحیح مسلم، صحیح بخاری، ترمذی، نسائی وغیرہ۔ ایک خامی یا کمزوری جو ہمیں مصنف کی تصنیف میں نظر آتی ہے وہ یہ کہ وہ حوالوں کا زیادہ اہتمام نہیں کرتے۔ جو حوالے ان کی تصنیف میں موجود ہیں ان کو بھی مکمل حوالہ نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ نہ تو مصنف نے یہ وضاحت کی ہے کہ انہوں نے احادیث کی کتب کے کون سے ایڈیشن کا مطالعہ کیا ہے اور نہ یہ واضح کیا ہے کہ اس تصنیف کے لیے عربی و فارسی کی اصل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے یا فلاں فلاں مترجم کے تراجم سے رہنمائی لی گئی ہے۔ واقعات میں حوالوں یا حواشی کا نہ ہونا قاری کو دورانِ مطالعہ دقت میں مبتلا کر دیتا ہے، جس سے تحریر کی روانی تو برقرار رہتی ہے، لیکن واقعات کے فہم میں ایک قسم کا خلا محسوس ہوتا ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے مصنف واقعے کی روانی پر بعض اوقات حوالوں کو قربان کر دیتے ہیں۔ کیوں کہ یہ ضروری نہیں کہ مصنف کی تحریر کردہ سیرت کی کتاب کا صرف اہلِ علم یا حافظِ قرآن حضرات ہی مطالعہ کریں گے۔ سطحی علم رکھنے والا انسان یقیناً آیات کی تصدیق کے لیے مشکل سے دوچار ہو گا۔ سیرت نگاری اس طرح کے غیر محتاط رویے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ ان کا یہ انداز ان کے اپنے دعوے کے برعکس دکھائی دیتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سیرت کی اس تصنیف کے ذریعے وہ مغربی دنیا میں آقا ﷺ کا پیغام پہنچانے چلے ہیں، لیکن کوئی بھی نو مسلم یا غیر مسلم ان واقعات کو پڑھے گا تو وہ یقیناً ان آیات یا سورہ کے حوالہ جات کے معاملے میں تشنگی محسوس کرے گا۔ جن تمام اشعار سے مصنف نے اپنی تصنیف کو مزین کیا ہے، ان کے بارے میں یہ نہیں بتایا کہ ان اشعار کے مآخذ کون سے ہیں۔ عربی اشعار کے اردو تراجم کے دوران قارئین یہ جاننے سے قاصر رہتے ہیں کہ کیا یہ تراجم مصنف نے خود کیے ہیں یا کہیں اور سے نقل کیے ہیں۔ مصنف کی طرف سے اس قسم کی کوئی وضاحت نہیں ملتی۔

سیرت کا موضوع سیرت نگار سے جہاں تصنیف کے فنی مراحل میں احتیاط کا تقاضا کرتا ہے، وہاں مواد کی پیش کش میں بھی احتیاط ناگزیر ہے۔ آقا ﷺ کے مصنف نے سیرت کی اس تصنیف میں دو مقامات پر حضرت علی کرم اللہ وجہ کو حضور پاک ﷺ کا بھتیجا لکھا ہے، حالاں کہ وہ آپ ﷺ کے چچا زاد بھائی تھے۔ چچا زاد کے علاوہ ان کا آقا ﷺ سے داماد کا رشتہ بھی تھا۔ مصنف کا ان کو نبی کریم ﷺ کا بھتیجا لکھنا یقیناً صریحی غلطی ہے۔ کوئی نو مسلم، جو اسلام کی تاریخ نہ جانتا ہو، وہ اگر اس تصنیف کا مطالعہ کرے گا، تو یقیناً الجھن کا شکار ہو گا۔

آقا ﷺ کے مصنف نے اپنی تصنیف میں جا بجا نفسیاتی تجزیے کی مدد سے مختلف کرداروں کے باطنی محرکات تک رسائی کی کوشش کی ہے۔ مصنف کبھی کبھی آقا ﷺ کی نفسیاتی کیفیت کی ترجمانی میں بھی اپنی ذاتی رائے اور تخیل کا سہارا لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سیرت نگاری جیسے نازک موضوع میں علمِ نفسیات کے اطلاق کے حوالے سے یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ نفسیات در حقیقت ذہنی سر گرمیوں کا علم ہے۔ وہ واقعات جو ۵۷۱ء میں رونما ہوئے، ان کے بارے میں جان کاری پندرہ سو سال بعد کرنی ہے۔ ماضی کے بارے میں گفتگو چوں کہ نتائج کو دیکھ کر ہوتی ہے، اس

لیے اس حوالے سے مفروضات تو قائم کیے جا سکتے ہیں لیکن انہیں مکمل حقیقت نہیں کہا سکتا۔ یہ مفروضات تبھی وجود میں آتے ہیں، جب تجربہ اس زمانے کے انسانی افعال و کردار سے جڑا ہوا ہو۔ چیزیں سیاق و سباق کے بغیر اپنی حقیقت کی طرف نہیں جا سکتیں۔ اس لیے آج کے مصنفین ماضی کے کرداروں کی ذہنی سرگرمیوں کی تہہ تک اس لیے مکمل طور پر نہیں پہنچ سکتے، کیوں کہ ان کے پاس ماضی کے واقعات کا مکمل سیاق و سباق نہیں ہوتا۔ جہاں تک نفسیاتی تجزیے کا تعلق ہے، تو ماضی کے دیگر کرداروں کی نفسیات کا جائزہ تو عام انسانی افعال کے تناظر میں لیا جا سکتا ہے، لیکن نبی پاک ﷺ کی ذاتِ اقدس کے بارے میں چوں کہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نہ تو اپنی مرضی سے کچھ بولتے تھے اور نہ ہی کچھ کرتے تھے، اس لیے آپ ﷺ کے افعال کے باطنی محرکات کا تجزیہ عام نفسیاتی اصولوں کی روشنی میں نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی اسے درست قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ یہ سچ ہے کہ کسی بھی سیرت نگار کے لیے اپنے قیاس اور تخیل کو ذہنی ادراک سے الگ کرنا ممکن نہیں، لیکن نبی کریم ﷺ کے اعمال و افعال کے بارے میں خیال بافی سے کام لینا یا قیاس میں اس حد تک آگے چلے جانا کہ غیب کی باتیں جاننے کا دعویٰ کرنا پڑے، یہ سب سنجیدہ سیرت نگار کو زیب نہیں دیتا۔

حوالہ جات

۱۔ محمود احمد غازی،محاضرات سیرت طبع سوم(الفیصل ناشران:لاہور،۲۰۰۹ء)،ص ۲۵۰۔

۲۔ المبحذ عربی اردو(کراچی:دارالاشاعت)،۱۹۷۵ء۔

۳۔ محمد جنید ندوی،"سیرت نگاری کے مآخذ،اصول اور منہج"،مشمولہ السیرتہ العالمی،(۱۴۲۵ھ):ص۱۵۶۔

۴۔ شبلی نعمانی،سیرۃالنبیؐ جلداول(لاہور:علم و عرفان پبلشرز،جولائی،۲۰۰۷ء)،ص ۶۳-۱۔

۵۔ احمد التاجی،"سیرتہ النبی العربی محمد رسولؐ"،مشمولہ مصطفیٰ البابی الحلبی (۱۹۷۸ء)،ص۲۵-۱۔

۶۔ ابوالحسن علی ندوی،رحمت عالمؐ(کراچی: مجلس نشریات اسلام،س۔ن)،ص ۲۱۔

۷۔ ندیم الواجدی،"سیرت نگاری کے بعض اہم پہلو"،مشمولہ نقوش رسولؐ نمبر جلد ا،شمارہ ۱۳۰(دسمبر ۱۹۸۲ء)،ص ۶۵۔

۸۔ مولاناوحیدالدین، مطالعہ سیرت ،(نیو دہلی: نائس پرنٹنگ پریس،۱۹۹۹ء)،ص ۵۔

۹۔ حکیم محمد سعید، *Islamicus In Search of Manuscripts in Quarterly hamdard*
جلد ۲ (کراچی: ہمدرد فاؤنڈیشن ۱۹۹۰ء)،ص ۶۷-۴۶۔

۱۰۔ محمد حمیداللہ،پیغمبر اسلام ﷺ، مترجم پروفیسر خالد پرویز(ملتان:بیکن بکس،۲۰۰۵ء)،ص ۲۱۔

۱۱۔ شاہ علی،اردو میں سوانح نگاری(کراچی:گلڈ پبلشنگ ہاؤس،۱۹۶۱ء)،ص ۲۱۳۔

۱۲۔ شبلی نعمانی،سیرۃالنبیؐ جلداول(لاہور:علم و عرفان پبلشرز،جولائی ۲۰۰۷ء)،ص ۵۱۔

۱۳۔ ابوالحسن علی ندوی،،"سیرت نگار کی ذمہ داریاں"،مشمولہ نقوش رسولؐ نمبر،جلد ا،شمارہ ۱۳۰،(دسمبر ۱۹۸۲ء)،
ص ۸۳۔

۱۴۔ ایضاً،ص ۸۸-۸۱۔

۱۵۔ سید عبداللہ،"فن سیرت نگاری پر ایک نظر"،مشمولہ فکر و نظر،شمارہ نمبر ۱۳۵ (۱۹۷۶ء)،ص ۷۔

۱۶۔ ایضاً ،ص ۱۵-۷۔

۱۷۔ محمد شکیل صدیقی،''برصغیر پاک وہند میں سیرت نگاری کے رجحانات''(مقالہ برائے پی ایچ ڈی،جامع کراچی،
۲۰۰۵ء)،ص ۲۷۹۔

۱۸۔ محمد حمیداللہ،پیغمبر اسلام ﷺ، ص ۲۲-۲۱۔

۱۹۔ ایضاً،ص ۲۲-۲۱۔

۲۰۔ www.goodreaders .com/book/show/554450181 تاریخ ملاحظہ ۲۵ مارچ ۲۰۲۱ء
بوقت ۱۲:۰۰ بجے۔

۲۱۔ لیزلی ہیزلٹن،(Lasley Hezleton)، *The First Muslim* (لندن:ایٹلانٹک بکس،۲۰۱۳ء)،
ص ۳۰۵۔

۲۲۔ ایس۔زمان چشتی،نقوشِ سیرت،(لاہور:پروگریسو بکس، طبع ۲۰۰۷ء)، ص ۱۴۱ وبعدہ۔

۲۳۔ شبلی نعمانی،سیرت النبی ﷺ،(اعظم گڑھ: مطبع دارالمصنفین، ۱۹۷۴ء)، ص ۹۔

۲۴۔ ابدال بیلا،آقاﷺ،انتساب(لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۵ء)۔

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۵۵۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۲۵۴۔

۲۷۔ ایضاً، ص ۲۵۸۔

۲۸۔ ایضاً۔

۲۹۔ ایضاً، ص ۱۷۱۔

۳۰۔ ایضاً۔

۳۱۔ ایضاً، ص ۳۳۶۔

۳۲۔ ایضاً، ص ۳۷۷-۳۷۶۔

۳۳۔ ایضاً، ص ۳۸۔

۳۴۔ ایضاً، ص ۴۶۵۔

۳۵۔ ایضاً، ص ۶۴۸۔

۳۶۔ راقم کا انٹرویو، ص ۳۔

۳۷۔ راقم کا انٹرویو، ص ۹۔

۳۸۔ ابدال بیلا،آقاﷺ، ص ۳۰-۲۹۔

۳۹۔ ایضاً، ص ۴۴۔

۴۰۔ ایضاً، ص ۷۹۲۔

۴۱۔ ایضاً، ص ۷۴۶۔

۴۲۔ راقم کا انٹرویو، ص ۲۔

۴۳۔ ابدال بیلا،آقاﷺ، ص ۷۳۔

۴۴۔ ایضاً، ص ۸۵۔

۴۵۔ ایضاً، ص ۸۶۔

۴۶۔ ایضاً، ص ۲۴۔

۴۷۔ ایضاً، ص ۱۱۰۶۔

۴۸۔ ایضاً، ص ۷۵۹-۷۵۸۔

۴۹۔ ایضاً، ص ۶۴۴۔

۵۰۔ ایضاً، ص۲۱-۲۰۔

۵۱۔ ایضاً، ص۴۱۔

۵۲۔ ایضاً، ص۵۰۸۔

۵۳۔ ایضاً، ص۶۸۴۔

۵۴۔ ایضاً، ص۳۶۳۔

۵۵۔ ایضاً، ص۱۱۸۔

۵۶۔ ایضاً، ص۵۷۹۔

۵۷۔ ایضاً، ص۵۹۶۔

۵۸۔ ایضاً، ص۸۵۴۔

۵۹۔ ایضاً، ص۷۹۵۔

۶۰۔ ایضاً، ص۸۷۹۔

۶۱۔ ایضاً، ص۲۵۔

۶۲۔ ایضاً، ص۶۱۔

۶۳۔ ایضاً۔

۶۴۔ ایضاً۔

۶۵۔ ایضاً، ص۱۱۰۔

۶۶۔ ایضاً۔

۶۷۔ ایضاً، ص۲۷۵۔

۶۸۔ ایضاً، ص۳۰۷۔

۶۹۔ ایضاً، ص۵۰۵۔

۷۰۔ ایضاً، ص۴۵۹۔

۷۱۔ ایضاً، ص۲۶۳۔

۷۲۔ ایضاً، ص۴۷۵۔

۷۳۔ ایضاً، ص۲۰۲۔

۷۴۔ ایضاً، ص۲۰۹۔

۷۵۔ ایضاً، ص۳۰۴۔

۷۶۔ ایضاً، ص۴۵۰۔

۷۷۔ ایضاً، ص۴۵۷۔

۷۸۔ ایضاً، ص ۴۶۰۔

۷۹۔ ایضاً، ص ۴۶۷۔

۸۰۔ محمد عبداللہ، "معاشرت نبویؐ: بیسویں صدی میں سیرت نگاری کا اہم رجحان"، مشمولہ دورِ جدید میں سیرت نگاری کے رجحانات (مارچ ۲۰۱۱ء): ص ۴۳۳۔

۸۱۔ ابدال بیلا، آقا ﷺ، ص ۶۰۳-۶۰۲۔

۸۲۔ ایضاً، ص ۳۳۹۔

۸۳۔ ایضاً، ص ۳۴۹۔

۸۴۔ ایضاً، ص ۳۴۲۔

۸۵۔ ایضاً، ص ۶۰۳۔

۸۶۔ ایضاً، ص ۶۱۴۔

۸۷۔ ایضاً۔

۸۸۔ ایضاً، ص ۳۱۷۔۳۱۵۔

۸۹۔ ایضاً، ص ۲۴۸۔

۹۰۔ ایضاً، ص ۸۵۔

۹۱۔ ایضاً، ص ۲۱۳۔

۹۲۔ ایضاً، ص ۳۳۷۔

۹۳۔ ایضاً، ص ۳۳۹۔

۹۴۔ ایضاً، ص ۵۱۹۔

۹۵۔ ایضاً، ص ۴۶۲۔

۹۶۔ ایضاً، ص ۵۴۹۔

۹۷۔ ایضاً، ص ۶۶۹۔

۹۸۔ ایضاً، ص ۴۶۲۔

۹۹۔ ایضاً، ص ۶۵۳-

۱۰۰۔ ایضاً، ص ۸۵۰۔

۱۰۱۔ ایضاً، ص ۶۹۰۔

۱۰۲۔ ایضاً، ص ۶۹۵-۶۹۴۔

۱۰۳۔ ایضاً، ص ۹۴۵۔

۱۰۴۔ ایضاً، ص ۲۳۵۔

۱۰۵۔ ایضاً، ص۱۰۱۸۔

۱۰۶۔ ایضاً، ص۲۳۷۔

۱۰۷۔ ایضاً، ص۴۵۴۔

۱۰۸۔ ایضاً، ص۴۸۵۔

۱۰۹۔ ایضاً، ص۵۲۰۔

۱۱۰۔ ایضاً، ص۵۹۱۔

۱۱۱۔ ایضاً، ص۳۷۷۔

۱۱۲۔ ایضاً، ص۲۵۔

۱۱۳۔ ایضاً، ص۱۶۰-۱۵۹۔

۱۱۴۔ ایضاً، ص۶۱۲-۶۱۱۔

۱۱۵۔ محمد عبداللہ، "معاشرت نبویؐ: بیسویں صدی میں سیرت نگاری کا اہم رجحان"، مشمولہ دورِ جدید میں سیرت نگاری کے رجحانات ،ص۳۷۳۔

۱۱۶۔ ابدال بیلا، آقاﷺ، ص۶۲۵۔

۱۱۷۔ ایضاً، ص۶۲۸-۶۲۷۔

۱۱۸۔ ایضاً، ص۶۲۸۔

۱۱۹۔ ایضاً، ص۴۶۹۔

۱۲۰۔ ایضاً، ص۴۸۴۔

باب سوم

اصول سوانح اور آقا ﷺ: تنقید و تجزیہ

باب سوم:

اصول سوانح اور آقا ﷺ: تنقید و تجزیہ

فن سوانح نگاری پر بہت کم تنقیدی کام ہوا ہے۔ حالاں کہ سینکڑوں اہم کتب اور مضامین میں شاعری، ڈرامہ اور افسانہ نگاری وغیرہ کی تکنیکوں پر وسیع پیمانے پر تبادلہ خیال کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اکثر نظریہ سازوں نے سوانح عمری کو تاریخ کا ایک چھوٹا سا حصہ سمجھا ہے اور باقاعدہ اس صنف کے اصول و ضوابط کا تعین ہی نہیں کیا۔ چناں چہ اس صنف میں زیادہ تنقیدی تجزیے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔ سوانح نگاروں کے لیے یہ عام سی بات تھی کہ وہ کسی بھی شخصیت کے بارے میں حقائق اکھا کریں اور انہیں ایک ساتھ جوڑ کر تاریخی ترتیب پر ختم کریں۔ جہاں تک فن کی بات ہے تو اسلوب بیان ہی کو اہم سمجھا گیا۔ کہانی کو سائنسی انداز میں روانی کے ساتھ کہنے کو ہی سوانح نگار کی کاری گری سمجھا گیا، لیکن بعد کے مطالعات نے یہ واضح کیا کہ ایک اچھے سوانح نگار کی ذمہ داری اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ دور حاضر میں سوانح نگار کے لیے دستیاب شواہد کی توثیق زیادہ مشکل مرحلہ نہیں ہے بلکہ یہ فیصلہ کرنا زیادہ کٹھن ہے کہ دستیاب مواد میں سے کتنا کچھ استعمال کیا جائے؟ کسی کی ذاتی زندگی کی گہرائی میں جانا کس حد تک جائز ہو سکتا ہے؟ یا کسی کی ذاتی زندگی کے حقائق کا کس حد تک انکشاف کیا جا سکتا ہے؟ ادبی تھیوریز کے جدید مباحث نے اس پیچیدگی میں بھی اضافہ کر دیا ہے کہ آیا بایو گرافی میں نفسیاتی وضاحتوں کی کوشش کی جانی چاہیے یا نہیں؟ ان تمام مباحث میں پہلے نقاد دلچسپی نہیں لیتے تھے کیوں کہ سوانح نگاری کو ایک الگ صنف شاید ہی سمجھا جاتا تھا۔ اسے تاریخ نگاری کا ایک معمولی ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ سوانح عمری کی ہیئت، ساخت اور اخلاقی مسائل کا تجزیہ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی تھی۔[1]

قرون وسطیٰ میں جب بڑے پیمانے پر مقدسین کی سوانح عمریاں ضابطہ تحریر میں لائی گئیں تو اس وقت بھی سوانح نگاری کے الگ سے کوئی ایسے تنقیدی مباحث موجود نہیں تھے جن میں اس صنف کے طریق کار کو بیان کرنے یا اس کی وضاحت کی کوشش کی جاتی۔ ہر کسی نے از خود ہی یہ خیال کر لیا کہ سوانح عمری لکھنے والوں کو سب پتا ہوتا ہے کہ کیا کرنا ہے؟ ان کا کام حقائق کو اکٹھا کرنا اور اپنی مرضی کے مطابق تاریخ وار ترتیب دے دینا ہے۔ اٹھارھویں صدی کے پہلے نصف حصے میں سوانح عمری پر شاید ہی کسی کا کوئی ایک مضمون ملتا ہو، سوانح نگار کے مسائل پر بھی کسی نے کچھ لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ معروف سوانح نگار لیئن ایڈل بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ:

> There exists, I am sorry to say, no criticism of biography worthy of the name. Reviewers and critics have learned how to judge plays, poems, novels-but they reveal their helplessness in the face of a biography.[۲]

اٹھارھویں صدی کے وسط میں سموئیل جانسن(Samuel Johnson)، جن کو جدید ادبی بایو گرفی کا بانی مانا جاتا ہے، نے سب سے پہلے اس جانب توجہ مبذول کی۔ جانسن نے سب سے پہلے یہ سوال اٹھایا کہ کسی کی ذاتی زندگی کے حقائق خواہ وہ مثبت ہوں یا منفی، ان کو کس طرح اور کس حد تک عوام کے سامنے لایا جائے؟اس طرح کے سوالات نے نئی سوانح عمری کے امکانات کو روشن کیا۔ سوانح نگاری کو جب سے ایک فن کا درجہ حاصل ہوا ہے، اس کے طریق کار اور تکنیکوں کا تجزیہ ادبی دنیا کے لیے بہت ثمر آور ثابت ہوا ہے۔ جانسن کا جانشین ان کا اپنا سوانح نگار "جیمز بوسویل(James Boswell)" تھا۔ سوانح حیات کے بارے میں ان دونوں کے نظریات بہت مختلف تھے۔ بوسویل کا سوانح نگاری میں طریقہ یہ تھا کہ کہ وہ اپنے موضوع کو، عقل و دانش کے ساتھ ،الفاظ ، گفتگو اور کہانیوں کے ذریعے خود بولنے دیتے تھے۔[۳] یہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی انسان اپنے مسائل کے حل کے لیے، سلطنتوں کے انقلابات کی تاریخ کی بجائے، کسی کی بھی زندگی کی کہانی سے زیادہ سبق حاصل کرتا ہے کیوں کہ کسی بھی شخصیت کی سوانح حیات کا اصل مقصد یہ ہے کہ اس شخصیت کے تجرباتِ زندگی سے عوام الناس کو متعارف کروایا جائے۔ یہ دراصل ماضی کی شخصیات کی "حیاتِ نو" کا نام ہے۔ اس کے ذریعے ہم ان شخصیات کے کارہاے نمایاں سے واقف ہو کر انہیں سراہنے کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی سے سبق بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ دورِ حاضر میں سوانح نگاری کی صنف وسیع تر مفہوم کی حامل ہوتی جارہی ہے۔ قدیم سوانح نگاروں نے اس صنف میں جن مسائل کا سامنا کیا، اب ان پر قابو پانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ رابرٹ فریزر(Robert Fraser) اپنی تصنیف *After Ancient Biography* میں دور حاضر میں فن سوانح نگاری کی اہمیت، وسعت اور دائرہ کار کے بارے میں بتاتے ہیں کہ سوانح نگاری، اپنی خصوصیات اور اندازِ فکر کے لحاظ سے اب ایک وسیع اور ابھرتا ہوا موضوع بن چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس موضوع کی درجہ بندی، اصول و ضوابط اور سوانح عمری کے مختلف ادوار کے مابین بامعنی موازنے کے لیے اقدامات کیے جارہے ہیں۔ ان کے خیال میں سابقہ ادوار سے لے کر موجودہ دور کی سوانح عمریوں پر توجہ مرکوز کرنے کا فائدہ یہ ہوا ہے کہ اس مطالعے نے اس موضوع کے دو پہلوؤں کو روشن کیا ہے۔ اوّل یہ کہ قدیم سوانح عمریوں کو اس انداز سے دیکھا جائے کہ اِس صنف کے اُس دور کے مسائل اور امکانات کس حد تک موجودہ دور کی سوانح نگاری کے مسائل کے

عکاس ہیں؟اور دوم یہ کہ ان اقدامات نے سوانح نگاری کو ماضی کی کہانیوں کی بجائے ایک نیا موڑ اور نیا رخ عطا کر دیا ہے۔[۴]

سوانح نگاری میں صاحبِ سوانح کی زندگی کے حالات و واقعات، اس کے احساسات و جذبات اور اس کی زندگی کے مختلف پہلو مثلاً خاندانی، قومی اور مقامی معاملات وغیرہ کو غیر جانب داری سے نمایاں کیا جائے تو بلا شبہ اس صنف کا کام خاصا پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ زندگی کی کہانی کو بیان کرنے کے لیے "بیانیے" کے تقاضوں کے مطابق ادبی ڈھانچے کا استعمال بذاتِ خود سوانح نگاروں کے لیے ایک چیلنج ہے۔ ورجینیا وولف (1941ء-1882ء، Virginia Woolf,) نے سوانح نگار کے لیے جدید زمانے کے چیلنج سے نمٹنے کو ضروری قرار دیا ہے، کیوں کہ آج کے سوانح نگار اس دور میں رہ رہے ہیں، جہاں اخبارات، خطوط اور ڈائریوں وغیرہ کے ذریعے ہر کردار پر ہر زاویے سے ہزاروں کیمرے لگے ہوئے ہیں۔ اس لیے ہر سوانح نگار کو صاحبِ سوانح کی شخصیت کے متضاد پہلوؤں کو بھی تسلیم کرنا چاہیے۔[۵] یہاں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ سوانح نگاری اس وقت بھی اسی طرح کے مسائل سے دوچار تھی، جن سے اب ہے۔ اس صنف کو درپیش چیلنجز کی بات اکیسویں صدی کے کسی نقاد نے نہیں کی بلکہ ۱۹۳۹ء کی ورجینیا وولف کی دوررس نظر نے اس صنف کا مستقبل بہت پہلے بھانپ لیا تھا۔

اس باب میں آپ ﷺ کی سوانح پاک کو جدید مغربی اصول سوانح نگاری کے مطابق پرکھا جائے گا تاکہ یہ دیکھا جائے کہ جدید فن سوانح نگاری کے نقاد، سوانح نگار سے جس رویے کا تقاضا کرتے ہیں، کیا آقا ﷺ کے مصنف اس رویے کے حامل نظر آتے ہیں یا نہیں؟ اس تصنیف کا جائزہ دو ناقدین اور سوانح نگار جیمز لوری کلفرڈ اور مائیکل بینٹن کے مباحث کی روشنی میں لیا جائے گا اور یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے گی کہ آقا ﷺ کے مصنف، اپنی تصنیف میں کہانی کے تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے کس طرح آغاز، وسط اور اختتام کی طرف بڑھے ہیں، نیز آقا ﷺ کو کلفرڈ کی بیان کردہ سوانح نگاری کی اقسام میں سے کس قسم میں شمار کیا جا سکتا ہے؟

ذیل میں کلفرڈ اور بینٹن کے مباحث کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے، تاکہ ان کے تنقیدی مباحث کی روشنی میں آقا ﷺ کا تجزیہ کیا جا سکے۔

جیمز لوری کلفرڈ کے مباحث:

جیمز لوری کلفرڈ (1978ء-1901ء: James Lowry Clifford) نے اپنی تصنیف *From Puzzles to Portraits : Problems of Literary Biographer* میں سوانح نگاری کے بارے میں نظریاتی مباحث پیش کیے ہیں۔ ان کے خیال میں ایک سوانح نگار کو جن جن مسائل کا سامنا

کرنا پڑ سکتا ہے،ان میں سے سب سے پہلا مسئلہ شواہد کی تلاش ہے،اور جب وہ شواہد ڈھونڈ نکالتا ہے تو اگلا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ ان کو استعمال میں کیسے لائے؟سوانح نگار کی اکٹھی کی ہوئی معلومات کو کلفرڈ جگ سا پزل (Jigsaw Puzzle) کہتے ہیں اور سوال کرتے ہیں کہ ایک سوانح نگار اس پزل کو ایک پوری تصویر کے روپ میں کیسے لائے؟وہ ان بکھری ہوئی معلومات میں سے کس کو اپنے مواد کے طور پر اپنائے؟ان سوالات کے جوابات حاصل کرنے کے لیے وہ سوانح نگار کو صرف لائبریریوں میں بیٹھ کر تحقیق کرنے اور مواد جمع کرنے سے منع کرتے ہیں۔وہ سوانح نگار کے لیے Outdoor Research کا طریقہ متعارف کرواتے ہیں،تاکہ سوانح نگار کو نئے شواہد مل سکیں۔کلفرڈ نئے شواہد کی تلاش میں سوانح نگار کی طرف سے دو طرح کے سوالات گنواتے ہیں۔پہلا سوال یہ ہے کہ "جب مشہور لوگوں کے بارے میں تمام شواہد موجود ہیں تو پھر نئی معلومات کی تلاش میں وقت کیوں برباد کیا جائے؟"[۱۷]

کلفرڈ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ہر کوئی جانتا ہے کہ نا معلوم اور غیر مطبوعہ ڈائریاں اور خطوط نئی تعبیرات میں روشنی کی نئی کرن کی مانند ہوتی ہیں۔یہ اثاثہ خواہ کم ہی کیوں نہ ہو،تنقیدی تجزیے کے لیے بہت اہم سمجھا جاتا ہے۔کلفرڈ کا خیال ہے کہ دوسرا سوال یہ کیا جا سکتا ہے کہ سوانح نگاری کے حوالے سے بہت سے موضوعات کے بارے میں پہلے سے مطبوعہ مواد موجود ہونے کے باوجود دستاویزات کے اصلی نمونے کی تلاش پر ہی کیوں برسوں صرف کر دیے جاتے ہیں۔

اس کا جواب کلفرڈ کے خیال میں واضح ہے کہ بہت سارے پچھلے مواد قابل اعتبار نہیں ہیں۔وہ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ بیسویں صدی سے پہلے کے ترمیم شدہ مواد پر مکمل طور پر یا متن کی درستی کے لیے بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ان کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے بہت سے پرانے نسخوں کی جانچ پڑتال کی،ان کو ایک بھی ایسا نسخہ نہیں ملا جس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہ کی گئی ہو،بلکہ ان کو بہت حد تک تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ہم تک متن اس درستی کے ساتھ نہیں پہنچا، جس کا مطالبہ آج کا محقق کرتا ہے۔ان کی رائے ہے کہ جب تک ہمیں یہ یقین نہ ہو جائے کہ جو کچھ بھی ماضی کے نامور لوگوں نے سوچا، کہا یا کیا تو کیا وہ من و عن ہم تک پہنچ رہا ہے؟اگر نہیں تو پھر ہم ماضی کو جاننے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔[۱۸]

جیمز لوری کلفرڈ بتاتے ہیں کہ ایک سوانح نگار کے لیے ضروری ہے کہ اپنی تصنیف سے پہلے ، وہ درج ذیل امور کو پیش نظر رکھے۔

۱۔ وہ مواد کو کس ترتیب میں پیش کرے گا؟

۲۔ وہ اپنی تحریر میں تاریخی تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے،خود کو کس حد تک آزاد تصور کر سکتا ہے؟

۳۔ کیا اسے صاحبِ سوانح کے حسب، نسب اور پیدائش سے شروع کرنا چاہیے اور پھر اگلے ابواب میں ایک ترتیب سے بڑھتا جائے اور موت تک کے حالات اس طرح تحریر کرے۔ جس طرح وہ وقوع پذیر ہوئے ہوں؟

۴۔ کس مواد کو استعمال کیا جائے؟

۵۔ اقتباسات کون سے اور کتنے شامل کیے جائیں؟

۶۔ موزوں مواد کا انتخاب کیسے کیا جائے؟

یہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ ایک مصنف کس طرح مواد کی اہمیت کا اندازہ لگا سکتا ہے؟ اس کے شعور کی کون سی آواز اسے یہ بتاتی ہے کہ اس جملے کا اقتباس دینا ہے اور اس کا نہیں؟ مختلف روایات میں سے کسی کو نظر انداز کر کے کسی روایت پر کس طرح اعتبار کیا جا سکتا ہے؟ کیا سوانح نگار مختلف روایات کے انتخاب کے سلسلے میں اپنے تنقیدی فیصلوں سے آگاہ ہوتے ہیں؟ کلفرڈ خود ہی ان سب سوالات کے جواب میں بتاتے ہیں کہ جب کسی مواد میں سے کسی ایک چیز کو لینا ہو اور دوسری کو چھوڑنا ہو، تو مواد کا انتخاب مصنف کی تنقیدی بصیرت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اگر صاحبِ سوانح کی شخصیت و کردار کے مختلف پہلو سامنے موجود ہوں تو سوانح نگار کو زیادہ تنقیدی بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔[۸]

زیادہ تر سوانح نگار پہلے سے اچھی طرح تیار کردہ خیال سے آغاز کرتے ہیں کہ ان کی تصنیف کا موضوع کیسا ہونا چاہیے؟ اسی pattern کی تائید میں اپنی تصنیف کے لیے شواہد کا انتخاب کرتے ہیں۔ زیادہ تر سوانح نگار اپنی تصنیف کے مقاصد اور طریقِ کار کے بارے میں کوئی باقاعدہ اصول متعین نہیں کرتے، کیوں کہ وہ اپنے آپ کو صرف تخلیقی فن کار سمجھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ بہت کم تنقیدی سوچ سے کام لیتے ہیں۔ بہت سے سوانح نگار اپنی تصنیف کی ہیئت/ڈھانچے اور تکنیک کے مسائل سے بے خبر ہوتے ہیں، لیکن باصلاحیت سوانح نگار اپنے کام کے لیے پہلے اصول وضع کرتے ہیں اور پھر ان اصولوں کی روشنی میں اپنی تصنیف مکمل کرتے ہیں۔

سوانح نگاری کے لیے ضروری شرط ہے کہ سوانح نگار صاحبِ سوانح کی زندگی کو نمایاں کرنے والے تمام شواہد سے ہر ممکن طریقے سے واقف ہو۔ سیرت نگاری جیسے نازک موضوع کے ضمن میں تو سیرت نگار کی ذمہ داری دوچند ہو جاتی ہے۔ سوانح نگاروں کو اپنے موضوع کے بارے میں متعلقہ تفصیلات یاد رکھنی چاہیں، بلکہ کلفرڈ انہیں باقاعدہ نوٹس بنانے کا مشورہ دیتے ہیں، تاکہ اپنے Pattern میں وہ ان تفصیلات کو فٹ کرتے ہوئے غیر ضروری تفصیلات کو نظر انداز کرتے جائیں اور ان کا ایک متوازن نقطہ نظر سامنے آئے۔ اس نکتے کی وضاحت ضروری ہے کہ اگر سوانح نگار کے پاس دستیاب شواہد اتنے کم ہوں کہ کچھ بھی، چاہے وہ کتنا ہی غیر متعلق ہو، اسے اپنی تصنیف میں شامل

کرنا پڑے، تو اسے یہ بات لازماً ملحوظ رکھنی چاہیے کہ اگر بظاہر معمولی سی بات بھی اپنی تحریر میں شامل کی ہے تو اس کے پیچھے کوئی معقول وجہ ہونی چاہیے، خواہ وہ ساختی اعتبار سے ہو یا تنقیدی اعتبار سے، لیکن اگر مواد زیادہ دستیاب ہو تو ضروری نہیں کہ اسے اپنی تصنیف میں ہی ضم کرے، بلکہ سوانح نگار کو اس کا گہرائی سے مطالعہ کرنا چاہیے، اضافی معلومات کو اضافی نوٹس یا حواشی میں لکھا جا سکتا ہے تاکہ غیر ضروری طوالت سے بچا جا سکے۔ اگر ایک ہی واقعے پر مختلف راویوں کی مختلف آرا پائی جاتی ہوں تو کچھ سوانح نگار سب کی آرا کو تحریر کر دیتے ہیں اور فیصلہ قاری پر چھوڑ دیتے ہیں، لیکن دراصل یہ ذمہ داری سے فرار حاصل کرنے کے مترادف ہے۔[9]

کلفرڈ سوانح نگاری کا ایک اہم اصول بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ کسی بھی سوانح نگار کو واقعات کی تعبیر اور جانچ پڑتال میں سنی سنائی روایات اور زبانی داستانوں کو قبول نہیں کرنا چاہیے، کیوں کہ بار بار زبانی دہرائی جانے والی روایات کو نہایت لطافت کے ساتھ غیر محسوس طریقے سے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ الفاظ کی معمولی سی تبدیلی بھی پورے معنی کو مسخ کر سکتی ہے، اس لیے اب یہ سوانح نگار کا فرض ہے کہ وہ حقائق کا دیانت داری سے تجزیہ کرے۔ بااصول سوانح نگار کو کسی بھی واقعے (جسے وہ جانتا ہو) کی تفصیلات فراہم کرتے ہوئے بہت محتاط رویہ اپنانے کی ضرورت ہوتی ہے، خاص طور پر ایسے واقعات جو بار بار تحریر ہو چکے ہوں یا پھر بے احتیاطی سے مدون کیے گئے ہوں، چوں کہ سوانح نگار ہمیشہ سچ کی تلاش میں ہوتا ہے، اس لیے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ جمع شدہ حقائق کی اعتباریت کا اندازہ لگائے اور ہر واقعے کو سخت تنقید کا نشانہ بنائے۔ یہی وجہ ہے کہ نقاد سوانح نگار کے لیے یہ ضروری قرار دیتے ہیں کہ وہ اپنے کشادہ ذہن (Open Mind) کو موضوع میں ہر قسم کی ممکنہ تبدیلیوں کے لیے تیار رکھے۔[10]

کلفرڈ کی بیان کردہ سوانح نگاری کی اقسام:

کلفرڈ کے خیال میں ایک سوانح نگار کے لیے اپنی سوانح نگاری کی ساخت، ہیئت اور بنیادی سمت متعین کرنا ایک مشکل اور اہم فیصلہ ہوتا ہے۔ اکثر سوانح نگار پہلے سے سوانح عمری کی ہیئت اور ساخت طے نہیں کرتے، نہ ہی وہ ابواب بندی کی منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ ان کا بنیادی مقصد روانی سے کہانی بیان کرنا ہوتا ہے۔ ان کے خیال میں جیسے جیسے ان کی کہانی آگے بڑھتی ہے خود بخود ہی ہیئت متعین ہو جاتی ہے، لیکن در حقیقت سوانح نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلے اس بات کا تعین کر لے کہ وہ کس قسم کی سوانح عمری تصنیف کر رہا ہے؟ وہ اپنے شواہد یا اسلوب کی بھی اس وقت تک وضاحت نہیں کر سکتا جب تک اسے خود یہ معلوم نہ ہو کہ اس کی تصنیف کیا شکل اختیار کرے گی، لیکن یہ سب اتنا آسان نہیں جتنا نظر آتا ہے۔ آج کل کے جدید مباحث اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ایک ہی مخصوص قسم کی تصنیف کی بجائے مختلف اقسام کی سوانح عمریوں میں سے، جو کہ وسیع پیمانے پر موجود ہیں، کسی ایک کا انتخاب کیا

جائے۔اصل دشواری اس وقت محسوس ہوتی ہے جب سوانح نگار کو اس بات کا ادراک ہوتا ہے کہ مختلف اقسام کی سوانح عمریوں کے مابین فرق کی نشاندہی کے لیے کوئی باقاعدہ طریق کار نہیں ہے۔ان اقسام کے تعین کے بارے میں کچھ نقادوں کی رائے ہے کہ یہ صرف ذرائع کے استعمال کی بات ہے۔ایسے لوگوں کی سوانح جن کا زمانہ قدیم ہے اور ان کے بارے میں معلومات سے آگاہی بھی کم ہے توان کی سوانح حیات کے بیان میں زیادہ زور پس منظر پر دیا جاتا ہے،اور اگر صاحب سوانح کا تعلق جدید دور سے ہو اور اس کے بارے میں بہت سے شواہد دستیاب ہوں ، مطبوعہ و غیر مطبوعہ مخطوطات تک رسائی بھی ممکن ہو تو سوانح عمری میں ان معلومات کے درست استعمال کا سوال اٹھتا ہے۔سوانح عمری کی درجہ بندی مصنف کی طرف سے کی گئی تعبیر و وضاحت کے ذریعے سے بھی کی جا سکتی ہے۔مصنف چاہے تو صرف حقائق بیان کرے یا صاحب سوانح کے شعور تک رسائی حاصل کرے اور اس کے افعال کے پیچھے وجوہات و اسباب تلاش کرے۔واقعات کے تجزیے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ سب واقعات کے اسباب کو بخوبی جانتا ہو، لیکن وہ اپنی تنقیدی بصیرت اور ذہانت سے کام لے کر واقعات کی تعبیر پیش کرتا ہے۔کسی بھی واقعے کے تجزیے کے بہت سے ممکنہ طریقے ہو سکتے ہیں،ان ہی ممکنہ طریقوں کی روشنی میں کلفرڈ سوانح عمری کی پانچ اقسام میں درجہ بندی کرتے ہیں،ہر چند کہ یہ درجہ بندی آسان کام نہیں تاہم کلفرڈ نے سوانح نگاری کی مندرجہ ذیل اقسام گنوائی ہیں۔

۱۔ معروضی بایو گرافی(Objective Biography)

۲۔ علمی،تاریخی بایو گرافی(Scholary Historical Biography)

۳۔ فنکارانہ(ادبیانہ) بایو گرافی(Artistic Biography)

۴۔ بیانیہ بایو گرافی(Narrative Biography)

۵۔ افسانوی بایو گرافی (Fictional Biography)[۱۱]

معروضی بایو گرافی(Objective Biography):

یہ سوانح نگاری کی وہ قسم ہے، جس میں صاحب سوانح کے متعلق مواد کو اکٹھا کرنے اور اسے کسی بھی ذاتی تبصرے کے بغیر پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔اس قسم کی سوانح نگاری میں سوانح نگار اپنی طرف سے وہ تمام مواد جمع کرتا ہے جو صاحب سوانح کی زندگی سے کسی نہ کسی طرح وابستہ ہوتا ہے اور اپنی تصنیف کو تاریخی حقائق کا منبع سمجھتا ہیں جسے وہ کسی بھی قسم کی ذاتی دخل اندازی اور موضوعی وضاحت کے بغیر مکمل کرتا ہے۔ معروضی سوانح عمری کی تفصیلات فراہم کرنے سے پہلے کلفرڈ خود تذبذب کا شکار نظر آتے ہیں اور سوال کرتے ہیں کہ آیا اس قسم کی سوانح نگاری ممکن بھی ہے یا نہیں؟ کلفرڈ کا کہنا ہے کہ بہت سے تاریخ نگاروں نے خواہ مخواہ یہ فرض کر لیا کہ وہ مکمل طور پر معروضی

ہو سکتے ہیں۔چونکہ آج ہم قدیم شواہد کے بارے میں مشکوک ہو چکے ہیں اور یہ نقطہ نظر اپنایا جاچکا ہے کہ ماضی کا کوئی وجود نہیں سوائے اس کے کہ جو ہمارا ذہن بنائے۔اس لیے تاریخ نگار شعوری یا غیر شعوری طور پر ماضی کو اپنی شخصیت کے نقش میں ڈھالتا ہے، لیکن اس کے برعکس معروضی سوانح عمری والوں کا موقف ہے کہ انہوں نے دستیاب شواہد اکٹھے کیے،ان کی صداقت کو جانچا اور پھر قاری کے سامنے پیش کر دیا۔لیکن جب ان سے سوال ہوا کہ انہوں نے مواد کے انتخاب کا مرحلہ کیسے طے کیا تو وہ اسی بات کا اعادہ کرتے رہے کہ مواد کا انتخاب ہمیشہ ہی مواد کے اندرونی رنگ اور موضوع کی نوعیت کے مطابق کرنا پڑتا ہے۔وہ یہ تسلیم کرنے سے گریزاں تھے کہ مواد کا انتخاب کسی نہ کسی طور پر مصنف کی ذاتی سوچ اور خیال سے منسلک ہوتے ہیں۔دراصل اس معاملے میں مصنف کا ذاتی انتخاب اہمیت کا حامل ہوتا ہے، کیوں کہ دستیاب معلومات میں سے،اس نے کون سی استعمال کرنی ہیں، یہ اسی کا فیصلہ ہوتا ہے۔[۱۲]

علمی،تاریخی بایو گرافی(Scholary Historical Biography):

اس قسم کی سوانح عمری میں ہر ممکن طریقے سے شواہد اکٹھے کیے جاتے ہیں لیکن ان شواہد کو محتاط انداز سے قاری کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔مواد کی پیشکش میں مصنف کی طرف سے افسانوی حربوں، قیاس آرائی اور نفسیاتی تجزیے کے ذریعے صاحب سوانح کی شخصیت اور اس کے افعال کی ترجمانی کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔اگر علمی و تاریخی سوانح عمری کی تکنیک کی بات کی جائے تو یہ صرف اور صرف منتخب حقائق کا محتاط استعمال ہے، جن کو تاریخی پس منظر میں جوڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ اس قسم میں اتنی احتیاط کے باوجود جب کبھی کسی واقعے کی موضوعی وضاحت کی ضرورت محسوس ہو تو، مصنف کی جانب سے اس کی ذاتی رائے کی گنجائش رہتی ہے، لیکن اس قسم کے حامل سوانح نگار ہمیشہ دیانت دار رہنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ قاری خود ہی سمجھ جائے کہ اصل معاملہ کیا ہے۔[۱۳]

فنکارانہ(ادیبانہ)بایو گرافی(Artistic Biography):

زیادہ تر نقاد سوانح نگاری کی اس قسم کے لیے "ادبی سوانح نگاری" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں، لیکن کلفرڈ نے اس کو فنکارانہ طرز کی حامل بتایا ہے۔ان کے خیال میں ادبی سوانح نگاری انفرادیت کی حامل ہوتی ہے،اگرچہ یہ تخیل کی وجہ سے کچھ مبہم ہو جاتی ہے، لیکن فنکارانہ عمل کے ذریعے بصیرت حاصل کرنے کا یہ امکان قارئین کے لیے زیادہ کشش کا باعث ہوتا ہے، جس میں سوانح نگار اپنے تخیل کے ذریعے تاریخی بیانیے کو آگے بڑھاتا ہے۔یہ ایک ایسی صنف ہے جس میں زندگی کے بیانیے(Life Narrative)کو مختلف زاویوں سے تلاش کیا جا سکتا ہے۔اس قسم

میں جب ایک بار شواہد اکٹھے ہو جائیں تو سوانح نگار ایک تصوراتی اور تخلیقی فنکار کے طور پر حقائق کو ممکنہ طور پر انتہائی دلچسپ انداز میں پیش کرتا ہے، لیکن شعوری طور پر حقائق کی صداقت کو مسخ نہیں کیا جاتا یا از خود واقعات بنائے نہیں جاتے۔اصل نقطہ یہ ہے کہ سوانح نگار اپنے آپ کو ایک مؤرخ سے زیادہ اہم سمجھتا ہے۔جیسا کہ لیئن ایڈل کا کہنا ہے کہ:

> The biographer may be as imaginative as he pleases – the more imaginative the better – in the way in which he brings his materials together.But he must not imagine the materials. He must read himself into past ; but then he must read that past into our present.[۱۴]

کلفرڈ اپنی ایک اور تصنیف *Young Sam Johnson* کو اس طرز کی سوانح عمری کی مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے اپنی تصنیف کے لیے ہر ممکن حد تک جا کر شواہد تلاش کیے، لیکن جب انہوں نے لکھنے کا آغاز کیا تو اپنی توجہ اس بات پر مرکوز کی کہ ان دستیاب شواہد کو کس طرح تخیلاتی انداز میں استعمال کریں تاکہ نفس مضمون کو کہانی کے انداز میں روانی سے بیان کر سکیں۔ظاہر ہے تاریخی حقائق کے بیان میں خیال بافی سے کام لینا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔اس میں انتہائی بصیرت کے ساتھ ان حقائق کو تصور کی آنکھ سے بیتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔مثال کے طور پر وہ اپنی تصنیف میں اس تکنیک کی وضاحت میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنی تصنیف کے پہلے باب میں بچپن سالہ جانسن کو اُس کی زندگی کے ابتدائی سالوں کا احوال لکھتے ہوئے دکھانا تھا۔اس مقصد کے لیے انہوں نے بوسویل کی تصنیف، جو انہوں نے ۱۷۶۵ء میں تحریر کی تھی، سے رجوع کیا۔اس تصنیف میں بوسویل نے بتایا تھا کہ جانسن جب بھی کچھ لکھنے بیٹھتے تھے، تو وہ اپنے سر کو ہلا ہلا کر، آگے پیچھے کر کے، خود کلامی کرتے ہوئے اور اپنے گھٹنے کو ہاتھ کی ہتھیلی سے رگڑتے ہوئے لکھتے تھے۔جہاں تک بوسویل کو علم تھا،اسی سال جانسن نے اپنی گیارہ سال تک کی زندگی کو بیان کرتے ہوئے ایک چھوٹا سا سوانحی ٹکڑا لکھا تھا۔کلفرڈ بتاتے ہیں کہ اس طرح ان دونوں مثالوں کو جوڑ کر انہوں نے اپنی تصنیف کا ڈرامائی انداز سے آغاز کیا۔[۱۵] لیکن کلفرڈ یہاں خطرے کی بات بھی کرتے ہیں کہ اگر کسی واقعہ کی تخیلاتی تفصیلات اصل متن/نسخے میں نہ ہوں یا پھر انہیں تبدیل کر دیا گیا ہو،اور یہ واضح ہو جائے کہ مصنف نے جو کچھ تخیل کی آنکھ سے دیکھا ہے،وہ غلط ہے،تو سوانح نگار کی رنگین عبارت معتبر ہونے کے لحاظ سے مشکوک ہو جاتی ہے اور مصنف کے لیے شرمندگی کا باعث ثابت ہو گی، لیکن اس کے باوجود سوانح نگار خطرہ مول لیتے ہیں اور

ڈرامائی انداز میں ترتیب وار حقائق بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں پر اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ سوانح نگار کو چاہیے کہ حواشی میں اپنے ذرائع سے آگاہ ضرور کرے تاکہ اگر کوئی قاری ان حقائق کی پرکھ کرنا چاہے تو اس کے لیے آسانی ہو، اور متن میں روانی کے دوران یہ مد نظر رکھے کہ کوئی بھی مکالمہ یا منظر ایسا تخلیق نہ کرے جو کہ حقیقت میں رونما ہی نہ ہوا ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ادبی بایو گرافی قارئین کے اذہان پہ غیر معمولی اثرات مرتب کرتی ہے۔ چاہے عام انسان کی ہی سوانح کیوں نہ ہو، قارئین اس تصنیف کو تخلیقی وجود کی بنیادی شرط کے طور پر قبول کرتے ہیں۔[۱۶]

بیانیہ بایو گرافی (Narrative Biography):

اس بایو گرافی میں تمام حقائق اکٹھے کرنے کے بعد ان کو داستان کی طرح بیان کیا جاتا ہے یہ داستان تقریباً تخیلاتی ہوتی ہے۔ اس میں ڈرامائی مناظر اور گفتگو ہوتی ہے جو کہ حقیقی زندگی کی فضا پیدا کرتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ سوانح میں ہونے والے مکالمے یا گفتگو غیر حقیقی ہوتی ہے۔ اس میں دستاویزات اور تحریری نسخوں کی مدد لی جاتی ہے۔ خطوط یا ڈائریوں کے حوالہ جات یا دیگر ذرائع سے حاصل ہونے والی معلومات کو مکالمے کی شکل میں اس طرح پیش کیا جاتا ہے جیسے وہ مکالمہ سوانح نگار کی نظر کے سامنے رونما ہوا ہو۔ سوانح نگار مختلف ذرائع سے حاصل ہونے والے مواد کو اصل گفتگو کے طور پر اپنے متن میں پیش کرتا ہے۔ سوانح نگار کا یہ فرض ہے کہ وہ واقعات و حقائق کی صداقت پر کوئی سمجھوتہ نہ کرے، البتہ ان واقعات کے اثرات کو مزید واضح کر کے بیان کر سکتا ہے۔ اس قسم کی سوانح عمری میں سوانح نگار اپنی طرف سے تخیل کی مدد سے واقعات کی موضوعی وضاحت کرتا ہے اور اپنے بیانیہ کو رنگین بناتا ہے۔ یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس قسم کی سوانح عمری خالصتاً افسانے کی طرز پر نہیں لکھی جاتی کیوں کہ افسانے میں حقائق کے مسخ ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔

افسانوی بایو گرافی (Fictional Biography) :

افسانوی سوانح نگار خود کو ناول نگار سمجھتا ہے۔ اس قسم کی سوانح نگاری میں تخیل کو پوری ڈھیل دی جاتی ہے۔ مصنف کو زیادہ گہرائی سے تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی کیوں کہ دیگر محقق یہ کام کر چکے ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ افسانوی سوانح نگار ثانوی ذرائع پر زیادہ انحصار کرتے ہیں اور اپنی طرف سے خشک تاریخی حقائق کو ادب میں بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نامعلوم حقائق کی وجہ سے تاریخی واقعات میں جب بھی کچھ خالی جگہیں آتی ہیں تو وہ ضروری لوازمات بنا کر خالی جگہوں کو پر کر دیتے ہیں۔ اپنی طویل گفتگو سے پس منظر کا تصور دیتے ہیں اور اپنی تصنیف کو ایک ناول کی شکل میں ڈھال دیتے ہیں۔ افسانوی سوانح نگار اپنے ہیرو کی زندگی کی تفصیلات اور اہم مناظر

خوبصورتی سے عیاں کرتا ہے۔افسانوی سوانح عمری میں بیان کیے گئے حقائق کو زیادہ معتبر نہیں سمجھا جاتا۔اس میں ناول کی کچھ تکنیکوں کا استعمال کیا جاتا ہے، لیکن افسانوی مناظر صاحب سوانح کی زندگی کے حقائق پر ہی مبنی ہوتے ہیں یا پھر ان سے ماخوذ ہوتے ہیں۔[۱۷]

مائیکل بینٹن کے مباحث:

مائیکل بینٹن (Micheal Benton) اپنی تصنیف *Literary Biography: An Introduction* میں اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ایک سوانح نگار اپنی تصنیف کے لیے جب مواد اکٹھا کر لیتا ہے تو اگلا مسئلہ زندگی کی کہانی کی بُنت کا ہوتا ہے، یعنی وہ اپنی کہانی کو کیسے پیش کرتا ہے؟ اس حوالے سے مائیکل بینٹن کی رائے ہے کہ سوانح نگاری کے فن میں ایجاد کے ساتھ ساتھ تشریح بھی شامل ہے۔اس صنف میں زندگی کو پر جوش بنانے کے لیے بیانیہ کی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ تحریری عمل میں ادبی سوانح نگار گزرے ہوئے واقعات کے گرد گردش کرتا رہتا ہے۔اسے اپنی تصنیف میں داستانی تسلسل پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، کیوں کہ وہ تاریخی لوازمات اور مربوط کہانی سنانے کا پابند ہوتا ہے، جس میں کسی بھی روایتی کہانی کی طرح آغاز، وسط اور انجام ہونا چاہیے۔وہ کہتے ہیں کہ :

> For biographers, like the rest of us, need narrative in order to make sense of life; and the sense we make is a provisional construct created from a mixture of elements -- selection, continuity, coherence and closure - that characterise the artistic form of narrative.[۱۸]

اس صنف میں جو بھی بیانیہ پڑھا جارہا ہوتا ہے، وہ صرف "مقاصد" اور "مواد کی پیش کش" پر محیط ہوتا ہے۔ سوانح نگاری کے بیانیے کو افسانے کی طرح بھی کہا جا سکتا ہے اور اس کے برعکس بھی۔ سوانح نگار کے اپنی تصنیف کے حوالے سے جو بھی مقاصد ہوتے ہیں، ان کے بیان میں اس کا انداز افسانوی نہیں ہوتا، جب کہ مواد میں زندگی کی کہانی کے انتخاب، وضاحت اور تکنیکی پیش کش کے لحاظ سے افسانے سے مماثلت پائی جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ادبی سوانح نگاری کو دورخی (Hybrid) ہئیت کا کہا جاتا ہے، جس میں حقائق کو بیانیہ کے فن سے جوڑا جاتا ہے۔سوانح نگار معروضی انداز میں حقائق کو پرکھتا ہے، لیکن "زندگی کی کہانی" کی تخلیق کے لیے اسے بیانیہ کے اصولوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ Narrative Theory اس دورخی کے لیے جواب دہ ہوتی ہے۔ شاید اسی لیے سوانح نگار اپنے

تاریخی بیانیوں کی وجہ سے مشکوک حالت میں ہیں۔ان پر یہ ذمہ داری عائد کی جاتی ہے کہ وہ زندگی کی کہانی کو گود سے گور تک بیان کریں۔ان سے یہ توقع بھی کی جاتی ہے کہ بیانیہ کے کے طریقوں سے "زندگی کی کہانی" کو وہ انداز دیا جائے، جو عام طور پر افسانوں کے لیے مختص ہوتا ہے۔[۹۱]

جدید سوانح نگاری کا یہ انداز، سوانح نگار کی رکاوٹوں کو دور کرنے اور خلا کو بھرنے میں مستقل طور پر سوانح نگاری کو اِسی سمت لے جارہا ہے۔بینٹن سوانح نگاروں کو اپنے بیانیے میں کہانی کے تسلسل اور ہم آہنگی کو قائم رکھنے کے لیے مندرجہ ذیل تین نکات کو مدِ نظر رکھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

۱۔ سوانح نگار زندگی کی کہانی کا ایجنڈا طے کریں۔

۲۔ اس ایجنڈے کو جاری رکھتے ہوئے اہم مناظر کو نمایاں کریں۔

۳۔ تاریخ میں ناگزیر خلا کو تسلیم کریں اور جہاں ممکن ہو، ہر خلا کو وضاحت سے پر کریں۔

کلفرڈ اور بینٹن کے مباحث کا آقا ﷺ پر اطلاق:

کسی بھی سوانح نگار کی اپنے بیانیے پر اختیار (Authority) کی وجہ سے اس بیانیے کو افسانے کے ساتھ جوڑا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ نقاد زندگی کی کہانی کے لیے بھی ضروری قرار دیتے ہیں کہ اس میں ایک مکمل داستان کے تمام لوازمات پائے جائیں۔ذیل میں جیمز لوری کلفرڈ اور مائیکل بینٹن کے مباحث کی روشنی میں، آقا ﷺ کتاب کے آغاز، وسط اور اختتام کا تنقیدی جائزہ لیا جارہا ہے، تاکہ آقا ﷺ کے لیے سوانح نگاری کی مخصوص قسم کا تعین کیا جا سکے اور یہ دیکھا جائے کہ مصنف نے اپنی تصنیف میں داستان کے ان لوازمات کو کس طرح برتا ہے؟ اور آقا ﷺ کے لیے سوانح نگاری کی مخصوص قسم کا تعین کیا جاسکے۔

آقا ﷺ کا ابتدائی حصہ (Biginning):

کوئی بھی کہانی ہو، اس کا آغاز، وسط اور اختتام ہوتا ہے۔سوال یہ ہے کہ کوئی بھی کہانی آخر شروع کب ہوتی ہے؟ معروف مغربی نقاد ڈیوڈ لاج (David Lodge) کہتے ہیں کہ یہ سوال ایسا ہی مشکل ہے، جیسے کوئی یہ پوچھے کہ ایک ایمبریو سے مکمل انسان کب بنتا ہے؟ کسی کہانی کی تخلیق یقینی طور پر اس کے ابتدائی الفاظ لکھنے سے ہوتی ہے۔اپنی تصنیف سے پہلے، بہت سے لکھاری، جو کچھ ان کے دماغ میں ہوتا ہے، اس حوالے سے بہت سا ابتدائی کام پہلے کر لیتے ہیں۔کچھ تو مہینوں تک صرف کہانی کا خاکہ ہی تیار کرتے ہیں، مثلاً پلاٹ، کردار، مزاج، سیٹنگ اور ان سب اجزا کو یکجا کرنے کا طریقہ کار وغیرہ۔اصل بات یہ ہے کہ ہر لکھاری کے کام کرنے کا انداز منفرد ہوتا ہے، جیسا کہ آقا ﷺ

کتاب کے مصنف ابدال بیلا نے اپنے ایک انٹرویو میں بتایا کہ انہوں نے اپنی تصنیف سے پہلے بہت سا "رف ورک" کیا۔انہوں نے اپنے کام کو ریاضی کے سوالات سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا کہ ان کے ساتھ بھی ریاضی کے سوالات والا معاملہ ہی ہوا۔انہوں نے بھی پہلے "رف ورک" کے نوٹس بنائے اور پھر ان کی مدد سے اپنی کہانی بُنی۔[۲۰]

ایک قاری کے لیے کسی بھی کہانی کی ابتدا ہمیشہ اس کے ابتدائی جملے سے ہوتی ہے۔یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ:

- کہانی کی ابتدا کہاں تک ہونی چاہیے؟
- کیا وہ صرف پہلا پیراگراف ہوتا ہے؟
- یا کچھ ابتدائی صفحات؟

کہا جا سکتا ہے کہ کسی بھی کہانی کی ابتدا دراصل ایک ایسی دہلیز ہے، جو ہماری اصل دنیا کو مصنف کی کہانی کی دنیا سے الگ کرتی ہے۔یعنی کہ یہ کوئی ایسا جملہ ہونا چاہیے، جو ہمیں کہانی کے اندر کھینچ کر لے جائے۔سوانح نگاری کے حوالے سے دیکھا جائے تو زندگی کی کہانی کی "جان دار ابتدا" کی ذمہ داری سوانح نگاروں پر بھی عائد ہوتی ہے۔ان سے بھی یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ صاحبِ سوانح کی زندگی کی کہانی کا مفصل حال لکھیں۔زندگی کی داستان ایک طویل عرصے پر محیط ہوتی ہے سوانح نگاری، "زندگی کی کہانی" کو تاریخوں اور واقعات کی مستحکم رفتار عطا کرتی ہے۔یہ وہ طریقہ بتاتی ہے، جس سے صاحبِ سوانح یا کوئی بھی فرد، وقت کا تجربہ کرتا ہے۔یہ تسلسل، امید، یاداشت، معمول، اور حیرت کا ایسا مرکب ہے، جو کسی بھی سوانح حیات میں نمایاں ہوتا ہے۔ادبی سوانح نگار ان لمحات کو تلاش کرتے ہیں، جو ان کے موضوع کی زندگی اور ان کے کاموں کو کلیدی حیثیت عطا کرتے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ ہر آدمی، جو کبھی زندہ رہ چکا ہے، وہ مختلف علامات اور ان پر، اپنے تحت الشعور کے محرکات کے ردِ عمل کے طور پر کام کرتا ہے۔یعنی ہر آدمی اپنے شعور کے مطابق افعال سرانجام دیتا ہے، نیز مختلف افعال پر اس کے ردِ عمل کا اظہار بھی یکساں نہیں ہوتا۔کیا ایک سوانح نگار کے لیے اپنے سے سالوں پہلے گزرے ہوئے انسان کے شعور تک رسائی حاصل کرنا ممکن ہے؟ اگر وہ اسے اپنے لیے ممکن بنا بھی لیتا ہے تو وہ اسے کس طرح جدید قاری کے سامنے پیش کر سکتا ہے؟ ہمارے لیے یہ ناممکن ہے کہ کسی بھی انسان کے ذہن تک رسائی حاصل کریں، لیکن اگر صاحبِ سوانح کی زندگی کے مختلف ادوار سے مواد اکٹھا کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ کچھ حد تک جائز ہو سکتا ہے۔اس میں کچھ بھی من گھڑت بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔افسانوی تکنیکوں کی مدد سے ایسا تاثر حاصل کیا جاتا ہے، جو ناول نگاری میں ہوتا ہے۔[۲۱] یہی وجہ ہے کہ آج کل سوانح نگاری کے لیے ادبی انداز مختص ہوتا جا رہا ہے۔

چوں کہ اس باب میں سیرت کی تصنیف کو سوانح نگاری کے تناظر میں دیکھا جارہا ہے، اس لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ اردو سیرت نگار اپنی تصنیف کا آغاز کس انداز سے کرتے ہیں؟ پروفیسر نجیبہ عارف نے اپنے ایک مضمون "نوآبادیاتی عہد میں اردو سیرت نگاری: چند مخصوص رجحانات واسالیب کا جائزہ" میں جدید اردو سیرت نگاری کے جن چار رجحانات کا ذکر کیا ہے ان میں سے ایک جغرافیائی تناظر کے حوالے سے ہے۔ سیرت نگاری کی ابتدا کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ نوآبادیاتی عہد میں خطہ عرب کے جغرافیائی حدود اربعہ کے بیان سے اردو سیرت نگاری کے آغاز کا رجحان مغرب کے زیرِاثر پروان چڑھا، کیوں کہ مغرب میں اشیا، واقعات اور حوادث میں علت و معلول کا رشتہ تلاش کرنے کی روِش موجود تھی۔ [۲۲] آقاﷺ کتاب کو دیکھا جائے تو اس کی ابتدا، خشک انداز میں عرب کے جغرافیائی محلِ وقوع کے بیان سے نہیں ہوتی، بلکہ مصنف نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے اپنی تصنیف کا آغاز کیا ہے۔ آقاﷺ کی ابتدا، نپی تُلی، معروضی اور تجسس سے بھرپور ہے۔ان کی تصنیف کے پہلے باب کا عنوان ہے "سنی گئی دعا"۔اس باب کا پہلا جملہ ہی قاری کے لیے آگے بڑھنے کی تحریک کا باعث بنتا ہے۔ان کا پہلا جملہ ہے: "جب وہ دعا سن لی گئی تو پھر یہ واقعہ ہوا"۔ [۲۳] مصنف نے پہلے جملے میں ہی قاری کے اندر تجسس بھر دیا ہے کہ یہاں کس دعا کا ذکر ہو رہا ہے؟ دعا جاننے کا تجسس قاری کو مزید پڑھنے پر اکساتا ہے۔ تجسس کو قائم رکھتے ہوئے مصنف اپنی کہانی کو بڑھا رہے ہیں۔ تجسس وہ کیفیت ہے، جو قاری کو نتائج کا انتظار کرواتی ہے، واقعات کچھ اس طرح بیان کیے جارہے ہوتے ہیں کہ قاری سانس تھامے، معلومات جاننے کے لیے بے چین ہوتا ہے۔ "آگے کیا ہونے والا ہے؟"، یہ سوال قاری کے ذہن میں ابھرتا رہتا ہے۔ آقاﷺ کے مصنف نے اپنی تصنیف میں اس حربے کی مدد سے قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھا ہے۔ہزاروں سال قبل کے واقعات "فلیش بیک" کے ساتھ ہمارے سامنے لے کر آرہے ہیں۔ مثلاً حضرت براہیمؑ کا بی بی حاجرہؑ اور حضرت اسمائیلؑ کو بے آب وگیاہ وادی میں چھوڑ جانا، حضرت ابراہیمؑ کی مختلف مقامات پر ہجرت، بی بی ہاجرہؑ کا صفا و مروہ کے مابین چکر لگانا، زم زم کا پھوٹ پڑنا وغیرہ۔

مصنف نے مکہ کے لیے قدیمی نام "بکہ" کو استعمال کیا ہے، جو ظاہر کرتا ہے کہ مصنف خود کو اسی زمانے میں چلتا پھرتا محسوس کر رہے ہیں۔انہوں نے اس طرح مکہ کے اطراف کی جغرافیائی حدود کی نشان دہی کی:

> وادی بکہ اس وقت تک نہ کوئی گاؤں تھا، نہ قصبہ، نہ شہر۔دور دور تک انسانی آبادی کا کوئی نشان نہ تھا۔وہ تنگ سی وادی، سب طرف سے خشک بنجر دھوپ میں کھڑے، جلے پہاڑوں سے گھری ہوئی تھی۔ان پہاڑوں میں تین درے تھے۔یہاں آنے جانے کے یہی راستے تھے۔ایک شمال کی سمت شام کو جاتا تھا۔دوسرا جنوب میں دور یمن کنارے تک پہنچاتا تھا۔تیسری راہ قریب کے سمندر بحرِ احمر کے صحرائی ساحل کنارے سے ہوتی ہوئی اوپر فلسطین کو لوٹ جاتی تھی۔اسی راستے

سے دو اونٹوں پر سوار ہو کے وہ میاں بیوی اپنے ایک شیر خوار بچے کو لیے ہوئے اِدھر لائے گئے تھے۔[۲۴]

آقاﷺ کتاب کی یہ ابتدا پوری تصنیف کے تسلسل اور زمانی ترتیب میں ایک کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ مصنف نے اپنے نبی پاک ﷺ کی حیاتِ طیبہ کی کہانی کے لیے حقائق، ان کی تشریح اور بیانیے کی تکنیکی پیش کش میں داستان کا انداز اپنایا ہے۔ یہ سچ ہے کہ کہانی سنانے کا آسان اور سادہ طریقہ کہانی سنانے والے کی آواز میں ہے۔ اکثر اوقات مصنف کی یہ آواز لکھنے کے عمل کو بولنے کی ایک قسم میں تبدیل کر دیتی ہے ۔ ابدال بیلا کے کہانی سنانے کا انداز بھی ایسا ہے کہ جہاں کوئی گہری یا مشکل بات آتی ہے، کہانی کی روانی میں ہی سمجھانے بیٹھ جاتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالنے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے ، آگ کے سرد ہو جانے کی توجیہ ، سمجھانے کے انداز میں بیان کرتے چلے جا رہے ہیں۔ لکھتے ہیں :

> اس آگ میں گرائے جانے پہ سیدنا ابراہیمؑ کو اتنی خراش بھی نہ آئی، جو پھولوں کے ڈھیر پہ گرتے سے آ جاتی ہے۔ کچھ ہوا تو اتنا ہوا کہ ہاتھ پاؤں کی بندھی رسیاں جل گئیں۔ آگ جو جلائی گئی تھی، وہ سلامتی کی حد تک بجھا دی گئی۔ صرف ٹھنڈا ہونے کا حکم آیا ہوتا تو آگ ٹھنڈی ہوتی ہوتی برف بن کے پھر تکلیف کا باعث ہوتی۔ برف سے نیچے بھی نقطہ انجماد گرتا جائے تو ایک سے آتا ہے، جب منفی درجے پہ گری کوئی ٹھنڈی شے پھر جلانے لگتی ہے۔
>
> سلامتی کی حد کا تعین ضروری تھا،
>
> اس لیے وہ حکم 'سلامتی کی حد تک سرد ہو جا' ہوا۔[۲۵]

حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کا نقشہ ایسا کھینچا کہ جیسے قاری خود بھی ہزاروں سال پہلے کے زمانے میں جا کے حضرت ابراہیمؑ کو خود اُس حالت میں دیکھ رہا ہو۔

> آنے والا مرد چھیاسی سال کی عمر میں بھی مضبوط اعصاب کا مالک نظر آتا تھا۔ خشک گرم صحرا کی لمبی مسافت سے اس کی جلد پر سرخی مائل جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ قد دراز تھا۔ ہڈیوں کے جوڑ بھاری تھے۔ سر کے بال کپڑے میں بندھے تھے۔ سفر کی تکان کے باوجود، خیر بانٹتے چہرے پہ چراغوں کی طرح بولتی، بڑی بڑی آنکھیں بڑی جاندار تھیں۔ جدھر ایک نظر دیکھ لیتیں، لگتا اُدھر بوٹا اگ آیا۔ یہ خدا کے انتہائی برگزیدہ نبی سیدنا ابراہیمؑ تھے۔[۲۶]

اس کے بعد خود کلامی کے انداز میں لکھتے ہیں کہ :

> اب خدا جانے خدا نے پہلا فیصلہ کون سا کیا؟ اپنے گھر کو اس بے آب و گیاہ وادی میں بنوانے کا ارادہ یا اسی وادی میں پیدا کیے جانے والے اپنے لاڈلے رسول ﷺ کا، جن کی نسبت کو خدا اپنے گھر کی

پہچان بنانا چاہتا تھا۔ شاید دونوں ارادے ایک ساتھ ہوئے ہوں۔ اپنے گھر کا جب خدا نے سوچا ہو، تو اپنے آخری نبی ﷺ کا آبائی شہر طے کر لیا ہو، یا سب سے پہلے جب اپنے لاڈلے رسول ﷺ کی روح تخلیق کی ہو، تو تہیہ کر لیا ہو کہ یہیں اپنے حبیب کے آبائی شہر میں اس کے گھر کے پڑوس میں اپنا گھر بنوانا ہے اور اسے اسی کے ہاتھوں سے سجوانا ہے، سارے جہاں کو دکھوانا ہے۔ کچھ نہ کچھ، کبھی نہ کبھی، طے ہوا ہو گا۔ ورنہ یہ کیسے ہوتا جو ہو گیا۔[۲۷]

یہ سب ظاہر کرتا ہے کہ سوانح نگاری کے فن میں حقائق کی وضاحت کے ساتھ ساتھ "ایجاد" بھی شامل ہے۔ اس صنف میں "زندگی کی کہانی" کو "زندہ شاہکار" بنانے کے لیے بیانیہ کے عمل دخل سے انکار ممکن نہیں۔ مائیکل بینٹن زور دیتے ہیں کہ اس صنف میں داستانی انداز کے حامل اُس بیانیے کو اعلانیہ طور پر قبول کرنا چاہیے، جو "گزشتہ" کو "حال" بنا دیتا ہے۔[۲۸]

وسطی حصہ (Middle):

سوانح نگاری میں، کسی بھی زندگی کی داستان کے لیے مواد کے انتخاب، تسلسل، ہم آہنگی اور بندِش، ایسے عناصر ہیں، جو داستان کی ادبی شکل (Artistic Form) کو نمایاں کرتے ہیں۔ کسی بھی کہانی کے "وسط" کے تجزیے میں ان ہی لوازمات کو پرکھا جاتا ہے، تاکہ اس کی ہیئت اور ڈھانچے کا تعین کیا جا سکے اور یہ دیکھا جائے کہ سوانح نگار اپنے فرائض سے کس حد تک آگاہ ہیں؟ دورِ حاضر کے سنجیدہ قارئین افسانوں کے قارئین کی طرح علامتوں اور معنی کی پرتوں کی پیچیدہ وضاحت میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید سوانح نگار بھی اپنی تصنیف کے فارم اور تخلیقی تجربے کے بارے میں اتنا ہی سوچتے ہیں، جتنا ناول نگار اور شاعر۔ آقا ﷺ میں سیرتِ نبی پاک ﷺ کو ایک کہانی کے انداز میں بیان کرنے کے لیے، مصنف نے اپنی تصنیف کی ہیئت اور ڈھانچے سے لے کر مواد کی پیش کش تک، اپنے ذہن کو موضوع سے باہر نہیں جانے دیا۔ اپنی تحریر میں روانی اور تسلسل برقرار رکھنے کے لیے مصنف نے ہر ممکن کوشش کی ہے۔ واقعات کے بیان میں کرداروں کی ذہنی استعداد کو دیکھتے ہوئے، جہاں مناسب لگا، وہاں ان کا نفسیاتی تجزیہ بھی کرنے کی کوشش کی ہے۔ آقا ﷺ کے مصنف نے اپنی تصنیف میں Interwoven technique تکنیک کی مدد سے بھی کام لیا ہے۔ اس تکنیک میں سوانح نگار، قاری کو جمالیاتی انداز میں صاحبِ سوانح کی تخلیقات کی طرف راغب کرتا ہے اور اپنی تحریر کے درمیان ہی (اس کی تخلیقات کا) تجزیہ پیش کرتا ہے۔ جیسا کہ آقا ﷺ میں ہم دیکھتے ہیں کہ مصنف نامحسوس طریقے سے نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات کا پرچار کر رہے ہیں ۔ اپنی تحریر میں مختلف واقعات اور ان میں ہم آہنگی کے لیے مصنف نے سیرت کے واقعات کا چناؤ خوب سوچ سمجھ

کے کیا ہے۔اپنی تنقیدی بصیرت سے کام لے کر ان روایات کو ترجیح دی ہے، جن سے فرقہ پرستی کو ہوا نہ ملے۔اس حوالے سے وہ خود دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ یہ تصنیف انسانیت کو جوڑنے والی ہے۔ کلفرڈ کے خیال میں مخصوص روایات کا انتخاب دراصل اُس زمانے کی قوتِ ادراک پر منحصر ہوتا ہے، جس میں مصنف کام کر رہا ہوتا ہے۔شاید اسی لیے،آقاﷺ میں ابدال بیلا نے سیرت نگاری میں مختلف روایات میں سے کسی ایک مخصوص روایت کے انتخاب کے بنیادی ماخذ کے حوالے سے قرآن، سنت اور اجتہاد کو اہم قرار دیا۔ [۴۹]

سوانح نگار کا کام ہے کہ وہ سچ کی تخلیق نو کرے اور مواد کو جس حد تک ممکن ہو، بہتر طریقے سے بیان کرے۔ چھوٹی چھوٹی اہم تفصیلات اور جزئیات کو مہارت سے تحریر کرتا جائے، کیوں کہ یہی جزئیات تحریر کو رنگین بناتی ہیں اور حقیقت کی علامت سمجھی جاتی ہیں۔جب حضور اکرمﷺ نے دعوتِ اسلام دی،مکہ کے چار سردار؛ابو جہل،امیہ بن خلف،ابوسفیان بن حرب اور ابولہب کی آپس میں گفتگو کو مصنف اس انداز سے بیان کرتے ہیں، جیسے خود ان سرداروں کے پاس موجود ہوں اور چشم دید گواہ ہوں۔لکھتے ہیں:

> قریب بیٹھے ہوئے تندیل، موٹے بے ڈھبے پچپن سالہ امیہ بن خلف نے بیٹھے بیٹھے اپنے گرد لپٹی ہوئی چمکتی ریشمی قبا ذرا سی کھول کے اسے پھر سے عجب تکبر سے اپنے پھولے پیٹ اور چوڑے بے ہنگم کندھوں پہ بل دیا اور بولا۔یہی ہے نا، جو کہتا ہے، سارے انسان برابر ہیں۔وہ منہ کھول کے خود ہی ہنسنے لگتا ہے اور کعبہ کی دیوار کے ساتھ چھپکلیوں کی طرح سہمے، کھڑے بدرنگ، ننگے دھڑوں کے نیچے لونگیاں باندھے کھڑے غلاموں کو دیکھ کے کہتا ہے۔یہ کہتا ہے، یہ دو چار سو درہم میں خریدے غلام بھی ہمارے برابر ہیں، یہ چھچھوندر، یہ بدرنگے، بدہیئت غلام۔جن کی قیمت میری اس چادر سے بھی آدھی ہے۔پھر اپنی زعفران رنگی ریشمی قبا میں لپٹا لپٹایا اپنے دونوں ہاتھوں اور کہنیوں سے بیٹھے بیٹھے مور کی طرح پھڑ پھڑاتا ہے۔یہ جن کی قیمت میری سواری سے بھی کم ہے، یہ میرے برابر ہو گئے۔آپ سب کے برابر ہو گئے۔وہ دو باقی سرداروں کو دیکھ کے چنگاری لگاتا ہے۔سب بڑبڑانے لگتے ہیں۔ [۵۰]

مصنف جب کوئی بھی واقعہ بیان کرتے ہیں تو اس کے کرداروں کی زندہ تصویر قاری کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ درج بالا اقتباس سے نہ صرف امیہ بن خلف کا حلیہ نگاہوں کے سامنے آتا ہے، بلکہ اس کی باتوں کے دوران اس کی حرکات کی پوری فلم دماغ کی سکرین پہ روشن ہو جاتی ہے۔

ایک ادیب ہونے کے ناطے واقعہ نگاری میں مصنف کو کمال حاصل ہے۔وہ واقعے کی تمام جزئیات کو اپنے تخیل سے ایسے بیان کرتے ہیں کہ واقعے کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔آقاﷺ نے حضرت ایوب

انصاری کے دو منزلہ مکان کی نچلی منزل پر قیام فرمایا۔ وہ خود اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ اوپر والی منزل پر منتقل ہو گئے، لیکن وہاں ان کے ساتھ پیش آنے والی صورتِ حال کو مصنف نے یوں بیان کیا:

> سیدنا ابو ایوب انصاری اوپر کی منزل میں شفٹ ہو گئے۔ ابھی قیام کی پہلی رات تھی کہ ایک دم سیدنا ابو ایوب چونکے۔ بیوی کو بلایا۔ بولے، ہم سے گستاخی ہو گئی۔ جس چھت کے نیچے آقا ﷺ کا قیام ہو، اس پہ ہم پیروں سے چلیں۔ اف! کس قدر بڑی غلطی ہو گئی۔ ساری رات دیوار سے لگے کھڑے رہے۔ صبح ہوئی تو دست بستہ آقا ﷺ کے حضور حاضر ہوئے۔ پوری بات اور کیفیتِ دل بتائی۔ ہاتھ جوڑے کہا، آقا ﷺ اوپر کی منزل پہ آ جائیں۔ آقا ﷺ کا وہی نقطہ نظر تھا۔ آقا ﷺ کو اپنے ملنے ملانے والوں کی آسانی درکار تھی۔۔۔۔ آقا ﷺ نے سمجھا بجھا کے سیدنا ابو ایوب انصاری کو پھر سیڑھیاں چڑھا دیا۔ [۴۱]

جب سردی کا موسم آیا تو ایک رات اوپر ان کا گھڑا ٹوٹ گیا۔ ان کو یہ فکر لاحق ہو گئی کہ پانی کا کوئی چھینٹا آقا ﷺ پہ نہ پڑ جائے۔ ان کی کیفیت کی ترجمانی مصنف اس طرح سے کر رہے ہیں:

> اضطراری کیفیت میں گھر میں جو ایک لحاف تھا، وہ اٹھا کے گرے ہوئے پانی پہ رکھ دیا کہ کوئی بوند نیچے نہ گرے۔ اس وقت چھتیں بھی تو کچی ہوتی تھیں۔ نیچے جھاڑ پھونس اور کچھ کھجور کے کٹے تنوں کے شہتیر۔ صبح پھر ہاتھ جوڑے پہنچے۔ عرض کی آقا ﷺ، اب اور اوپر رہنے کا حوصلہ نہیں۔ آقا ﷺ نے پروانے کی بات مان لی۔ گھر کی اوپر والی منزل میں چلے گئے۔ [۴۲]

کبھی کبھی تحریر کو ہلکے پھلکے مزاح سے مزید شگفتہ بنا دیتے ہیں۔ قریش کے سرداروں نے جب معاہدہ حدیبیہ کی خلاف ورزی کی تو آقا ﷺ نے انہیں تین شرائط دیں، نہ ماننے کی صورت میں جنگ کا قوی امکان تھا۔ قریش نے تینوں شرائط ماننے سے انکار کر دیا۔ آقا ﷺ دس ہزار کا لشکر لے کر مدینے سے چل پڑے۔ ابو سفیان بن حرب کو معاملے کی سنگینی کا علم ہوا تو بد حواس ہو کر اکیلے مدینے چلا آیا۔ مصنف اس کی بد حواسی کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اپنے بھاری بھر کم جسم اور اکڑی گردن لیے، ریشمی قبا کے پھڑ پھڑاتے دامن کو بار بار پکڑ کے چھوڑتا، جاہ و حشم کا دکھاوا کرتا مدینے کی گلیوں میں پھرنے لگا۔ [۴۳]

اس کا خیال تھا کہ لوگ اس کے استقبال کو آئیں گے، مگر وہ جدھر دیکھتا، لوگ منہ پھیر لیتے۔ حتیٰ کہ وہ اپنی بیٹی، جو کہ زوجہ رسول پاک ﷺ تھیں، کے گھر گیا تو وہاں بھی اسے خفت کا سامنا کرنا پڑا۔ مصنف نے اس کی شرمندگی اور ذلت کا احوال یوں سنایا:

> بیٹی ام حبیبہ رضی اللہ عنہ کے دروازے پہ اب ابو سفیان نے پناہ کے لیے دستک دی۔ بیٹی نے درواز ہ کھول دیا۔ ابو سفیان کو بیٹھنے کو بھی نہ کہا، تو خود ہی ایک بچھی ہوئی چارپائی پہ بیٹھنے لگا۔ سیدہ ام حبیبہ

لپک کے آئیں اور چار پائی کا بستر سمیٹنے لگیں۔ابو سفیان بیٹھتا بیٹھتا، ہوا میں معلق، گھٹنوں کے بل کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔اپنی یہ توہین دیکھ کے اس نے فقرہ کسا۔ بیٹی یہ بستر میرے بیٹھنے کے قابل نہیں یا میں اس پہ بیٹھنے کا اہل نہیں؟سیدہ بولیں، یہ آقا ﷺ کا بستر ہے، رسول ﷺ کا۔آپ اس قابل نہیں کہ اس پہ بیٹھیں۔ [۳۴]

منظر نگاری کا یہ کمال ہے کہ منظر کی لفظی تصویر کشی حقیقی منظر سے اس حد تک مشابہ ہو کہ اس تصویر سے حقیقت کا گمان ہو۔ایک اچھا ادیب اپنی قوتِ تخیل سے مناظر کے بیان میں حسن پیدا کر دیتا ہے۔مکہ کی ایک صبح کا منظر ملاحظہ ہو، جب مکہ کے چاروں سردار کعبہ کی دیوار کے سائے میں بیٹھے تھے۔

سورج جبلِ نور کی غارِ حرا سے ابھر کے حرمِ کعبہ میں اپنی روشنی پھیلا چکا تھا۔سورج کی کرنیں حجرہ اسود کو چوم کے کعبے کے کالے پردے میں جذب ہو رہی تھیں۔ حطیم کی جگہ میں کعبے کی پینتالیس فٹ اونچی دیوار کا سایہ ٹھنڈا تھا۔اسی سائے میں مکہ کے متکبر، غصیلے، لالچی چاروں رئیس بیٹھے تھے۔ قالین بچھا تھا۔لوبان کی دھونی کی خوشبو کی چاپیاں چھپما رہی تھیں۔تانبے کی چمکتی طشتریوں میں زیتون کے موٹے بیروں جیسے چمکتے ملائم پھل پڑے تھے۔ساتھ اونٹ کے دودھ سے بنی پنیر کی قاشیں تھیں۔کچھ کانسی کے ڈونگوں میں خشک نمکین اونٹ کے گوشت کے ٹکڑے پڑے تھے۔رنگین پھول پتیوں سے مزیّن مٹی کے پیالوں میں صحرا کے سنہرے خوشبودار پھولوں سے بنے قہوے میں زعفران کی مہک تھی۔پیالیوں سے بھاپ اڑ رہی تھی۔ [۳۵]

ان کی تصنیف میں جن اشخاص کا ذکر ملتا ہے، ان کے مخصوص امتیازات اور خصوصیات کو کردار نگاری میں نمایاں رکھتے ہیں۔وہ کسی بھی کردار کی زندگی کے متعلق اہم خدوخال کو مثلاً واقعات و حالات، اس کی عادات و اطوار، حرکات و سکنات، اس کے حلیہ، لباس اور طرزِ گفتگو کو اس کے مزاج کے عین مطابق اس طرح اجاگر کرتے ہیں کہ قاری کی نگاہوں کے سامنے اُس انسان کی چلتی پھرتی شخصیت نمایاں ہو جاتی ہے۔ نبی کریم ﷺ کی شخصیت دکھانے میں ایک اچھا ادیب ہونے کا ثبوت دیا ہے۔آپ ﷺ کی نورانی اور بشری صفات کو، آپ ﷺ کی باکمال شخصیت کی عظمت کے مطابق توازن سے بیان کیا ہے۔آپ ﷺ جب اِمِ معبد کی جھونپڑی میں تشریف لے گئے تو اس نے آپ ﷺ کے جانے کے بعد اپنے شوہر سے آپ ﷺ کی شخصیت کی عکاسی کی۔مصنف نے وہ عکاسی اپنے لہجے میں محبت و عقیدت سمو کر یوں کی :

آج میں نے کائنات بھر کا سب سے حسین اجلا پن اور پاکیزگی انسانی شخصیت میں مجسم دیکھی ہے۔چہرہ پہ نور، اخلاق خلائق کی ہر حد سے خوباں، متناسب الاعضا، جسم پھولوں بھری ڈال، خوش خیال، خوش خصال، کمال حد جمال، نہ پیٹ بڑا ہونے کا عیب، نہ کوتاہ گردن، نہ چھوٹا سر، سر کے بال پورے، لمبے، گھنے، اور میانہ گھنگریلے، بالوں کی سیاہی تیز چمکتی ہوئی، ستواں اونچی سجیلی گردن، مہکتی گھنی داڑھی،

آنکھوں کے اوپر کٹار پتلی بھویں، آپس میں شائستگی سے جڑی ہوئیں، آنکھیں موتیوں بھرے جادوئی سیپ، لمبی خوش قطع روشن اور خوش نما، حیا سے سرسراتی ہوئیں، آنکھوں کی پتلیاں کالی کچور، خوش خیالی سے بھری ہوئیں، نیک سرشت، باقرینہ اور آنکھوں کی سفیدی، دودھ کے مکھن سے بھی اُجلی، براق، ان کی آنکھوں کی چمک، ہیرے سے ہویدا دھنک، بقعہ نور، نور در نور، جدھر آنکھ اُٹھتی، موسم بدل جاتا، خیر بھرا خیرہ، شاد کام، خوش اندام، خوش گام، شیریں کلام، خاموشی میں پر وقار۔ مسکراتے تو حسن کی آبشار، گفتگو جیسے نگینوں کی لڑی، آب دار مہکتے موتی ان کی باتوں سے جھڑتے، خوش نوا، شیریں سخن، قول فیصل کہنے والے، پر لطف، کم گو، مگر کم گوئی ایسی نہیں کہ بات پوری نہ ہو۔ لفظ لفظ موتیوں کی مالا، پھولوں کا گجرا، دل پسند، آواز میں سر کے سارے آہنگ، نفیس اور بلند خیال، فضول گوئی سے کوسوں دور، شان تمکنت والے، دور سے دیکھو تو سب سے حسین، سراپا جاہ و حشم۔ قریب سے شیریں، مرد ابریشم۔ گفتار میں فصیح، ابلاغ میں بلاغت، خوش گزار اور خوش رفتار، دیکھنے میں نہ اتنے لمبے کہ قد کی لمبائی چبھے، نہ کوتاہ قد، موزوں قد و قامت، خوش انگ، نرمل، بے میل، باسلیقہ اور باوقار قول و قال، دو شاخوں کے درمیان ایک ڈال، دور فیقوں کے ہم جولی، جو انہیں گھیرے رہتے۔ اپنی انتہا توجہ کے دائرے میں، ان کے لب سے نکلا ہوا ہر لفظ، ساتھ والوں کے لیے حکم، ساتھ اطاعت شعار، بلند بخت، حق شناس، بریاب، جو تعمیل میں دوڑ پڑتے، نہ ترش رو، نہ زیادہ گو، مخدوم ایسے کہ خادم پر سند، آقا ﷺ ایسے کہ چاند تارے غلام، خورشید اور ماہتاب ان کے پیروں کی دھول، کائنات کے ذرے ذرے کا ان کو سلام، کیسے کہہ دوں کہ وہ کیسے ہیں۔[۳۶]

حضرت بلال حبشی رضی اللہ کے حلیے کے بیان میں مصنف کا انداز ملاحظہ ہو:

> بلال اکتیس سال کا لمبا، کالا، کمزور سا آدمی تھا، کالے جسم پہ کالی کالی پسلیاں سینے کے اندر کسی اندرونی طوفان سے تھرک رہی تھیں۔ موٹے کھدر نما اون کے کپڑے کی لونگی باندھی ہوئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی روشن آنکھوں میں خوف جما ہوا تھا، سر کے بل گول گول، کٹی ہوئی لوہے کی باریک چھوٹی کترنوں کی طرح گھنگرائے ہوئے بے ڈھبی سے اونچی نیچی سر کی کھوپڑی پہ چپکے ہوئے تھے، ہونٹ موٹے تھے، ناک بڑا سا تھا، اس کے بازو کولتار میں رنگے ہوئے پتلے بانسوں کی طرح، اس کے جسم کے دونوں طرف بے ربط سے ہوئے تھرک رہے تھے۔[۳۷]

ابو لہب کا حلیہ اگرچہ بہت مختصر بیان کیا، لیکن اتنے اختصار کے باوجود ان کے الفاظ اس کے مکمل سراپے کو ظاہر کر رہے ہیں:

> اتنے میں آقا ﷺ کے پیچھے ایک موٹا، بدہیئت، بھینگی آنکھوں، دھوپ سے جلے لال ہوئے چوڑے منہ اور چوڑی داڑھی والا بڈھا، بڑبڑاتا ہوا تیز تیز چلتا آیا۔[۳۸]

بیعتِ عقبہ کا ذکر کرنے کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ نو مسلموں نے آقا ﷺ سے اپنے لیے استاد مانگا تو آقا ﷺ نے مصعب بن عمیر رضی اللہ کو مقرر فرمایا۔ مصنف نے حضرت مصعب بن عمیر کی شخصیت کی عکاسی ان الفاظ میں کی:

آقاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ہم جد، ہم شکل، قریش کے جھنڈا بردار معزز خانوادے عبدالدار کے خوبرو ترین خوشبو میں ہر وقت معطر، خوش لباس، گورے چٹے،، لمبے لمبے کندھوں تک بھیگے بھیگے کالے بالوں اور چمکتی روشن آنکھوں میں تارے رکھ کے دھیمے لحن میں تبسم افروز بات کرنے والے، سیدنامصعب بن عمیر کوان کے ساتھ کر دیا۔[۳۹]

ماضی کے کرداروں کی گفتگو اور مکالمے لکھنا بظاہر جتنا آسان معلوم ہوتا ہے، حقیقت میں اتنا ہی مشکل ہے۔ تحریر میں تقریر کی سی بے ساختگی پیدا کرنا مشکل ترین کام ہے، لیکن ابدال بیلا نے اپنی تصنیف میں مکالمے اس انداز سے لکھے ہیں کہ یہ بالکل فطری معلوم ہوتے ہیں، گویا مصنف ان کرداروں کو اپنی آنکھوں کے سامنے گفتگو کرتے ہوئے دیکھ رہے ہوں۔ امیہ بن عبد شمس نے اپنے چچا ہاشم کی فوقیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور مفاخرت کے لیے ہاشم کو چیلنج کیا۔ مصنف نے چچا بھتیجے کی باہمی گفتگو کو مکالمے کے انداز میں یوں لکھا:

ہاشم کو مفاخرت کے لیے امیہ بن عبد شمس نے چیلنج کیا تو اس نے بھتیجے کو کہا،
شرم کرو۔
بھتیجا تو شرم کے گھونگھٹ اٹھا کے آیا تھا۔ بضد ہو گیا۔
آخر ہاشم نے امیہ سے حلف لیا کہ ثالث کا فیصلہ مانو گے؟
وہ بولا، مانوں گا۔
ہاشم نے کہا، جو ہارے وہ سیاہ آنکھوں والی سوہنی پچاس اونٹنیاں ذبح کر کے بستی والوں کو کھلائے گا۔
امیہ بولا، منظور ہے، تم اپنی اونٹنیوں پہ نشان لگا دو۔
ہاشم کہنے لگا، نشان تو میں ہی گاڑوں گا، تمہاری اونٹنیوں پہ چھری پھیرنے سے پہلے بھتیجے،
مگر ایک شرط اور بھی ہے۔
امیہ بولا، کون سی چاچا؟
ہاشم کہنے لگا، جو ہار گیا، وہ اس بستی میں نہیں رہے گا۔
دس سال کے لیے اپنا منہ کالا کر کے دور جا کے بسے گا۔
بول جائے گا؟
جائے گا وہ جو ہارے گا۔
ہاں یہی کہتا ہوں۔
مجھے منظور ہے، تو سامان باندھنا شروع کر دے چاچا، امیہ بولا۔
تیرا سامان تو بندھ چکا ہے بھتیجے، اب ثالث کا فیصلہ سن۔[۴۰]

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والد، حضرت عبداللہ کی شادی کے دن ام قتیلہ اور حضرت عبداللہ کی ملاقات کا

احوال سناتے ہوئے لکھتے ہیں:

بارات کی راہ میں امِ قتیلہ کا گھر آیا تو وہ گھر کی دہلیز پہ تن کے کھڑی تھیں۔ اس نے کھڑے کھڑے عبداللہ کو آواز دی۔ عبداللہ۔

سیدنا عبداللہ اپنے والد عبدالمطلب کا ہاتھ پکڑے، سجے سنورے شادی کروانے جا رہے تھے۔ حسن میں پہلے ہی یکتا، یوسف ثانی، اوپر سے سج دھج کے دولہا بنے ہوئے۔ دیکھنے والی دوشیزاؤں میں زلیخا کی روح کیسے نہ حلول کرتی۔

امِ قتیلہ کے دل کی بات لبوں تک آگئی۔ سرِ عام بیچ گلی کے بلا لیا۔

سیدنا عبدالمطلب نے بیٹے کا ہاتھ چھوڑ دیا اور کہا،

جاؤ سنو۔ تمہاری کزن کیا کہتی ہے۔

سیدنا عبداللہ امِ قتیلہ کے پاس آئے۔ امِ قتیلہ نے آنکھوں میں تارے نچائے اور مسکرا کے پوچھنے لگی۔

اتنے سج بن کے کدھر جا رہے ہو؟

بولے، اپنے باپ کے ساتھ، شادی کروانے۔

امِ قتیلہ بولی، یہ شادی مجھ سے کر لو۔

ابھی میں کوئی فیصلہ نہیں کرتا، میرے والد کرتے ہیں فیصلہ۔

سنو، تمہارے صدقے پہ جیسے سو اونٹوں کی قربانی ہوئی تھی، ویسے سو اونٹ میں دوں گی۔

آگے نہ جاؤ۔ ٹھہر جاؤ۔

اسی لمحے مجھ سے شادی کر لو۔

سیدنا عبداللہ بہت شرمائے۔ گورے چٹے تھے۔ منہ لال ہو گیا۔ سر نفی میں ہلاتے ہلاتے بھاگ کے پھر اپنے والد کے پاس آ گئے۔[۱۴]

ابو سفیان اور ہندہ نے جب اسلام قبول کیا، تو ہندہ بھی آپ ﷺ سے بیعت ہونے کے لیے آئی۔ نبی کریم ﷺ نے اس سے جو گفتگو کی، وہ مصنف نے اس طرح بیان کی:

آقا ﷺ نے بیعت لیتے سے فرمایا۔

وعدہ کرو بتوں کو نہیں پوجنا۔

چہرے پہ ڈالے ریشمی نقاب کے اندر اس کے ہونٹ ہلے۔

ہمارے بتوں نے ہی ہمیں مروایا ہے، اب نہیں پوجنے۔

وعدہ کرو، چوری نہیں کرو گی۔

بولی۔ میرا خاوند کنجوس ہے، پورا خرچہ نہیں دیتا۔ کچھ اس کی گرہ سے نکال لیتی ہوں۔

اجازت ہے۔

ابو سفیان قریب ہی بیٹھا تھا، بولا، جو لے لیا لے لیا، اب نہ ویسے لینا۔

آ قاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابو سفیان کی بات سن کے چونکے۔

بولے، تم ہندہ ہو؟

ہندہ نے سر اثبات میں ہلایا۔

چہرہ پھر بھی شرمندگی میں نہ کھولا۔ آ قاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر وعدہ لیا، بولا بدکاری نہ کرو گی۔

ہندہ بولی، اچھے خاندان والیاں ایسا نہیں کرتیں۔

آ قاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، وعدہ کرو اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گی۔

ہندہ بولی۔

جنہیں ہم نے پالا، بڑا کیا، انہیں تو آپ نے بدر میں قتل کر دیا۔ اب ہم نے کہاں بچے پیدا کرنے اور پالنے ہیں۔ [۴۳]

حضرت حمزہ رضی اللہ کو ایک عورت نے بتایا کہ ابو جہل نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف مغلظات بک رہا ہے۔ مصنف نے ان کی اس گفتگو کو ایسے بیان کیا، جیسے وہ اس وقت موقع پر موجود ہوں۔ بیان کرتے ہیں:

کچھ پتا ہے تمہیں ابو عمارا؟

کیا،

تم بنو ہاشم کے رستم ہو، پورے قریش میں کوئی تمہاری ٹکر کا جوان نہیں اور۔۔

اور کیا؟

وہ ابوالحکم (ابو جہل) تمہارے خاندان کو کیسی کیسی گالیاں دے گیا۔

کب؟

کیوں؟

وہ تمہارا بھتیجا ہے نا، الامین، صادق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

سچا، یکتا، ایماندار۔

ہاں۔ اسے یہیں، اسی جگہ پہ ابوالحکم (ابو جہل) نے گالیاں دیں۔ جو منہ میں آیا، وہ بکتا رہا، تمہارے بھتیجے نے اف تک نہ کی۔ کوئی جواب نہ دیا۔ سب مغلظات سن کے بھی صبر کرتا رہا۔۔۔

حمزہ کے چہرے پہ ببر شیر کا چہرہ آگیا۔ سر سے پاؤں تک جسم جیسے بجلی کے کوندے سے لرزا۔ اس نے گھوڑے کی لگام زور سے کھینچی، ایک طرف موڑی اور گھوڑے کی پسلیوں میں پاؤں مارنے سے پہلے بولا،

کہاں ہے اس وقت، وہ ابو جہل؟

حرم کی طرف گیا ہے، وہ وہیں بیٹھا ہو گا۔[۴۳]

سوانح نگار کا صاحبِ سوانح سے پیچیدہ رشتہ ہوتا ہے، جس کا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ کچھ مغربی نقادوں نے بلاشبہ اس مسئلے کی اہمیت کی نشان دہی کی ہے، ان کا خیال ہے کہ سوانح نگاری کی تحقیق میں زیادہ فوکس اس بات پر ہونا چاہیے کہ سوانح نگار اور صاحبِ سوانح کا یہ رشتہ کس طرح سوانح عمری کی تصنیف میں کام کرتا ہے۔ سوانح نگار کی شخصیت اور اس کے موضوع کے مابین Psychological Intersection ہو، تو مصنف کا طریقِ کار زیادہ پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ ایک عام قاری کے لیے صداقت کی جانچ مشکل ہو سکتی ہے۔ اکثر سوانح نگار تسلیم کرتے ہیں کہ وہ تب تک کسی کی سوانح حیات نہیں لکھ سکتے، جب تک اس شخص سے جذباتی یا ذہنی ہمدردی نہ ہو، لیکن اس کے ساتھ ان کا یہ دعویٰ بھی ہوتا ہے کہ وہ تاریخی اعتبار سے شواہد کا تجزیہ کرنے کی بھی پوری کوشش کرتے ہیں[۴۴]۔ لیکن ان کی یہ رائے سوانح نگاری کی غیر جانب داری والی شرط کو پورا نہیں کرتی۔ کلفرڈ بھی اس کے حق میں نہیں، ان کا کہنا ہے کہ مصنف کی طرف سے مکمل محبت یا نفرت سے صاحبِ سوانح کی زندگی کے حقائق کی صداقت مشکوک ہو سکتی ہے۔ وہ رائے دیتے ہیں کہ رویے میں شدت پسندی کی بجائے ہمدردی یا تجسس، ایک مفید نقطہ نظر ہو سکتا ہے۔ جب ایک سیرت نگار، بالخصوص مسلمان سیرت نگار، نبی اکرم ﷺ کی سوانح حیات لکھتا ہے، تو کیا وہ آپ ﷺ کی ذاتِ پاک سے اپنی جذباتی وابستگی کچھ دیر کے لیے ہی سہی، فراموش کر سکتا ہے؟ کیا وہ اپنی عقیدت کی لے میں اپنی تصنیف میں نفسیاتی تجزیے کی کوشش کرتا ہے؟ اور اگر کرتا ہے تو اسے اپنے لیے کس حد تک مستند سمجھتا ہے؟ جدید سوانح نگاری میں تو کرداروں کے نفسیاتی تجزیے کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ اس تجزیے نے سوانح نگاری کو لامحدود حدود عطا کر دی ہیں۔ سوانح نگاری میں نفسیات کے استعمال کے مباحث ہمیں لیئن ایڈل کے ہاں زیادہ نظر آتے ہیں۔ ایک طرف تو انہوں نے واضح طور پر اس تکنیک کے استعمال کے خطرات سے آگاہ کیا، لیکن ساتھ ہی ان کا کہنا ہے کہ سوانح نگار کو نئی تکنیکوں میں مہارت حاصل کرنے کی بھی کوشش کرنی چاہیے۔[۴۵]

آقا ﷺ کتاب کے مطالعے سے مصنف کی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ انھوں نے اپنی تصنیف جا بجا نفسیاتی تجزیے سے مدد لی ہے۔ انسان کی نفسیات ہے کہ اسے خوشی کے لمحات یاد رہیں یا نہ رہیں، غم اور دکھ کے کرب ناک لمحات اس کی یاداشت سے کبھی محو نہیں ہوتے۔ آپ ﷺ کا اپنی والدہ کے ساتھ مدینے کا وہ سفر، جس میں آپ ﷺ ہمیشہ کے لیے اپنی والدہ سے جدا ہو گئے۔ اس سفر کے بارے میں مصنف کہتے ہیں کہ:

> رسول ﷺ کو اپنی والدہ کے ساتھ وہ یادگار سفر ہمیشہ یاد رہا ہو گا۔ راہ کی ریتلے میدان، سنگلاخ پہاڑ، گرم پتھر، کہیں کہیں پانی کے چشموں کے آس پاس بسے نخلستان۔ ریت اڑاتی ہوائیں، رستے

کی پیاس اور دل و جان سے پیار کرتی ماں، جن کے ساتھ رسول ﷺ کو واپسی کا سفر نصیب نہ ہوا۔ خادمہ کے ساتھ اکیلے آنا پڑا۔ وہ کیسے بھولے ہوں گے۔[۶]

مصنف اپنے تخیل کی آنکھ سے چھ سال کے بچے کو، جس کے سامنے اس کی ماں زندگی اور موت کی کش مکش میں ہو، اس کی جذباتی کیفیت کی ترجمانی اس طرح سے کر رہے ہیں:

> کیسی بے بسی ہو گی ننھے رسول ﷺ کی۔ ان کی کائنات، ان کی ماں ان کے سامنے بخار سے تپ کے دھیرے دھیرے موت کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ ننھے رسول ﷺ کو کیا پتا موت کیا ہوتی ہے۔ ماں کا گرم تپتا جسم، بے سرت ہوتی لال آنکھیں اور بے ترتیب ہوتی نبضیں، رسول ﷺ کے معصوم کم سن ذہن کو دکھوں میں دھکیل رہی تھیں۔ سفر کے دوران انجان ویرانے میں اپنوں اور بیگانوں سے کوسوں دور اپنی زندگی کی سب سے قیمتی ہستی کو یوں لحہ لحہ موت کی طرف جاتے دیکھنا، ایک چھ سال کے یتیم بچے کے لیے کیا معنی رکھتا ہے۔ یہ وہ ہی سوچ سکتا ہے جس کا کوئی نہ ہو۔ وہ بھی ایک بیابان ویرانے میں، اور جو ایک واحد پیاری ہستی ہو، وہ بھی بچھڑنے والی ہو۔[۷]

مصنف اپنے شعور کو عام انسانوں کی سطح پہ لا کے، رسولِ پاک ﷺ کی نفسیاتی کیفیت کا تجزیہ کر رہے ہیں۔ ان کا انداز ایسا ہے کہ پڑھنے والا اپنے آپ کو اسی ماحول میں محسوس کر کے اپنے نبی ﷺ کے دکھ کا صحیح ادراک کر سکتا ہے۔ ایک سوانح نگار کی یہ خوبی ہے کہ وہ اپنے تخیل اور قیاس کی مدد سے حقیقت کو ڈھونڈ نکالے۔ اگرچہ آقا ﷺ میں مصنف کے پیشِ نظر یہ ہے کہ وہ عام انسان کی سوانح نہیں لکھ رہے، لیکن اس کے باوجود وہ بہت سے مقامات پر آقا ﷺ کی نفسیاتی و بشری کیفیت کی عکاسی بھی کرتے ہیں، شاید وہ چاہتے ہیں کہ قاری خود کو اس منظر کا حصہ سمجھ کے چھ سال کے یتیم کا دکھ محسوس کرے۔ اس حوالے سے درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

> پتا نہیں کتنی بار رسول ﷺ نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کی چھوٹی چھوٹی ہتھیلیاں پھیلا کے خدا کے حضور گڑگڑا کے التجائیں کی ہوں گی۔ اے پہاڑوں اور ریگزاروں کو چلانے والے، اے آسمان سے بارش برسانے والے خدا، تو کعبہ کی دیوار کے سایہ تلے، میرے کھلے ہاتھوں سے مانگی ہوئی دعا سن کے اس خشک، بنجر، سنگلاخ وادی پہ بادل لے آتا تھا۔ آج دیکھ، پھر یہ ہاتھ پھیلے ہیں۔ ان ہاتھوں کی ہتھیلیوں پہ تیرے بادلوں کی بارش کی بجائے میری آنکھوں کے آنسو گرے ہوئے ہیں۔ آج تو میری آنکھوں کی اس بارش کو دیکھ کے ترس کھا لے۔ میرا تو باپ بھی نہیں ہے۔ میں نے اسے دیکھا بھی نہیں ہے۔ نہ کوئی بہن، نہ کوئی بھائی ہے، جو ایک بوڑھا دادا ہے، وہ کوسوں دور ہے۔ اسے پتا بھی نہیں ہم کہاں ہیں، ہم پہ کیا بیت رہی ہے؟ میرا کوئی رشتہ دار بھی یہاں نہیں ہے۔ کوئی شناسا نہیں، کوئی انجانا بھی نہیں۔ ہم ریتلی راہ کے دکھی مسافر ہیں۔ بس میری ساری کائنات میری اک یہ ماں ہے۔ اسے اچھا کر دے، اسے بچا لے۔ تیری ساری مخلوق

کے زندہ کم سن کو اس کی ماں پالتی ہے۔ مجھے نہیں پالنا، کون پالے گا مجھے اگر میری ماں بھی مر گئی۔ میری ماں کو بچا لے اللہ۔ [۴۸]

ننھے بچے کی اپنی ماں کی قبر پہ اپنی مری ہوئی ماں سے کی گئی گفتگو کو مصنف رقت انگیز لہجے میں بیان کر رہے ہیں:

خدا جانے رسول ﷺ کتنی بار تڑپ تڑپ کے رکے ہوں گے۔ کتنی بار سسک سسک کے روئے ہوں گے۔ اپنی ماں کی قبر سے لپٹ کر کتنا تڑپے ہوں گے۔ کتنی بار ماں سے کہا ہو گا۔ ماں کیوں یہاں ویرانے میں آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔ مرے ساتھ کون جائے گا؟ کون میرا خیال کھے گا۔ ابھی تو گھر بہت دور ہے۔ گھر میں بھی ماں تیرے علاوہ کوئی نہیں۔ تو تو مجھے باپ کی قبر دکھانے لائی تھی، اپنی قبر کیوں دکھا دی۔ ماں اٹھ، میرے ساتھ چل۔ مجھ سے اکیلا نہیں چلا جاتا۔ دیکھ تو سہی، ابھی میں کتنا چھوٹا ہوں۔ [۴۹]

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہ کی سہیلی نفیسہ نے آقا ﷺ سے حضرت خدیجہ سے شادی کی بات کی، تو آقا ﷺ کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

آقا ﷺ کی پر وقار آنکھیں حیا سے کپکپائیں، کنپٹی پہ سرخی کی ایک لہر آئی، بند ہونٹ ایک لمحے کو ہلے اور آواز آئی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں راضی ہوں۔ [۵۰]

کچھ عرصے کے لیے آقا ﷺ پر وحی کا نازل ہونا رک ہو گیا تو آقا ﷺ بہت دکھی ہوئے۔ ہر وقت اپنے رب کی طرف سے پیغام کے انتظار میں رہتے۔ جب کوئی بھی انسان انتظار کی کیفیت سے گزرتا ہے، تو اس کے دل پہ جو بیتتی ہے، مصنف نے اس حالت کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے اس کیفیت کو نبی کریم ﷺ کے اضطرار سے جوڑتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

وقت کیسے رکتا، کیسے چلتا اور کیسے اندر اور باہر سے انسان کو کاٹ کے لہو لہان کرتا ہے اور اس کا اندازہ صرف اس وقت ہوتا ہے جب کوئی کسی کا انتظار کر رہا ہو۔ پھر جس ہستی سے جتنا گہرا اور قلبی واسطہ اور تعلق ہو، اسی قدر اس کا انتظار شدید ہوتا ہے۔ انتظار کے لمحوں میں پتا چلتا ہے ایک ایک پل کتنا طویل ہے۔ ایک لمحے میں کتنے پل ہیں۔ پل دو پل کی بات نہیں، جب انتظار دنوں، ہفتوں، مہینوں کے بعد سالہا سال کا ہو جائے، تو دل پہ کیا بیتتی ہے، یہ صرف وہ جانتے ہیں، جن پہ یوں بیتا ہو۔ آقا ﷺ پہ ڈھائی تین سال وحی کا آنا موقوف رہا۔ ہر دن، ہر رات آقا ﷺ کو خدا کے برگزیدہ فرشتے جبرائیل کا انتظار رہا۔ گھر میں، باہر، غارِ حرا میں، ہر جگہ آقا ﷺ رہے، مگر جس کا انتظار تھا، وہ نہ آیا۔ آقا ﷺ دل ہی دل میں یہ سوچ کے ڈر گئے، گھبرا گئے کہ میرے خدا نے کہیں مجھے چھوڑ تو نہیں دیا۔ [۵۱]

مکہ فتح ہوا قریش کی نفسیاتی حالت کی ایسی عکاسی کی کہ ان کی بد حواسیاں مزید نمایاں ہو کے قاری کے سامنے آنے لگیں۔ ابو سفیان کو جب ادراک ہوا کہ مکہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا تو وہ بوکھلاہٹ کا شکار ہو گیا۔ حضرت ابوالفضل عباس نے اسے آقا ﷺ سے ایک رات کی امان لے کر دی۔ مصنف اس کی اضطراری کیفیت کو، چشمِ تخیل سے دیکھتے ہوئے قیاس کے انداز میں یوں بیان کرتے ہیں:

> وہ رات ابو سفیان کی ساری زندگی سے بھاری ہو گی۔ کہنے کو اسے رات بھر کی امان تھی، صبح اس کی زندگی اور اس کے قریش والوں کی قسمت کا فیصلہ آقا ﷺ نے کرنا تھا۔ ابو سفیان کو بھی آقا ﷺ پہ ڈھائے اپنے اور اپنی قوم کے پچھلے اکیس سال کے سارے جرم یاد ہوں گے۔ اسے نیند کیسے آتی۔ بوجھل بے خواب اجڑی آنکھوں اور ٹوٹے ہوئے اعصاب کے ساتھ وہ اگلی صبح آقا ﷺ کے خیمے میں حاضر کر دیا گیا۔ [۵۲]

انسان کی نفسیات ہے کہ اچھے دنوں کی یاد فوراً نہیں بھلا پاتا۔ ہندہ تو پھر ایک سردار کی بیوی تھی، اتنی جلدی کیسے یقین کرتی کہ وہ لوگ مغلوب ہو گئے ہیں۔ ابو سفیان نے اپنی قوم میں اعلان کیا کہ جو اپنے گھروں میں محدود رہیں یا میرے گھر چلے جائیں یا خانہ خدا میں ہوں گے، ان کو امان ملے گی۔ لیکن ہندہ جیسی سفاک اور ضدی عورت کے لیے یہ برداشت کرنا محال تھا۔ مصنف نے اس کی ہٹ دھرمی اور بد حواسی کو ان الفاظ میں بیان کیا:

> ابو سفیان بھاگا گیا اور لوگوں کو اکٹھا کر کے اعلان کرنے لگا۔ اس کی بیوی ابھی تک ترنگ میں تھی۔ ابو سفیان کی سہمے ہوئے لہجے میں باتیں سن کے سناٹے میں آگئی۔ بولی اس موٹے کی مونچھیں نوچ لو۔ یہ کنانہ کا ڈرپوک سردار، پاگل ہو گیا ہے۔ کوئی اس کی بات نہ مانے۔ وہ آکر ابو سفیان سے الجھ پڑی۔ لوگوں کو سمجھ نہ آئے، کس کی مانیں۔ [۵۳]

مکے کے لوگوں میں پھیلے انتشار اور اضطراب کو بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ:

> مکے کا ہر مشرک بجھی ہوئی راکھ جیسے چہرے اور پھیلی آنکھوں کی پتلیوں سے بد حواسی میں ادھر ادھر بھاگنے کی راہ تک رہا تھا۔ ہر شہری کا چہرہ زرد تھا۔ [۵۴]

ابو سفیان اور ہندہ کی بے بسی اور بے چینی کا ذکر آگے چل کے مصنف نے اس انداز سے کیا:

> مگر سیدنا امیر حمزہ کا کلیجہ چبانے والی ہندہ کے چہرے پہ لالی ابھی باقی تھی۔ غصے سے ابو سفیان کا گریبان پکڑ لیا اور بولی، تم سردار ہو کنانہ کے، بچاؤ سب کو۔ دفاع کرو مکہ کا۔ ابو سفیان نے ہندہ کا بازو پکڑ کے دور کیا۔ اور اپنی مری ہوئی روح کے ساتھ چلا کے بولا۔ مکہ ہمارے ہاتھوں سے نکل چکا ہے۔ اسے فتح کر لیا گیا ہے۔ تم اپنی جان بچاؤ، باقیوں کو بھی بچانے دو۔ ہٹ جاؤ، ہم ہار گئے۔ لوگ سہم کے اپنے اپنے گھروں کی سمت دوڑ پڑے۔ ہندہ اپنے بال کھولے وہیں بیٹھ گئی۔ اس کی ٹانگوں

میں اس کا بوجھ سہارنے کی قوت نہ رہی۔ ابو سفیان اسے کھینچتا ہوا گھر لے گیا، ہندہ ابھی تک ہوش و حواس میں نہ تھی۔ پھر بھڑک اٹھی، بولی یہ سب ہوا کیسے ؟[55]

سوانح نبی پاک ﷺ لکھنے والوں کے لیے نفسیات سے آگاہی اس لیے بھی ضروری ہے کہ وہ کفار کی اسلام لانے کے بعد کی دلی کیفیت بھی آشکار کر کے غیر مسلموں کے دل میں عشق نبی ﷺ کی چنگاری جلا سکیں۔ مصنف نے اپنی تصنیف میں شاعر کعب بن زہیر کا واقعہ بیان کیا۔ جب آقا ﷺ نے اسے پکڑنے کا حکم دیا تو اس نے اسلام قبول کرنے کا ارادہ کر لیا۔ آقا ﷺ نے قبولِ اسلام کے بعد اسے امان دے دی۔ اس کے بعد اس کی بدلتی ہوئی نفسیاتی و دلی کیفیت کی ترجمانی مصنف نے یوں کی کہ :

سیدنا کعب بن زہیر، جس نے زندگی بھر اپنے لفظوں سے آقا ﷺ کو زخم لگائے تھے، بیٹھا بیٹھا وجد میں اچھل پڑا اور عجیب کیف و مستی کے عالم میں جھوم کے ایک پروانہ بنا شمع رسول ﷺ کے گرد طواف کرتے ہوئے آقا ﷺ کی مدحت میں قصیدہ پڑھنے لگا۔

بانت سعاد و قلبی الیوم مبتول
متیم اثر ھالم یفد مکبول

پھر جب یہ شعر پڑھا۔

ان الرسول سیف یستضا ءبہ
مھند من سیوف اللہ مسلول

تو آقا ﷺ نے جو خوب صورت یمنی چادر اوڑھی ہوئی تھی، وہی اتار کے کعب بن زہیر کو اوڑھا دی۔ پروانے کی عید ہو گئی۔ اس کے نصیب جاگ گئے۔ باقی ساری عمر پھر وہ صرف آقا ﷺ کے قصیدے پڑھتا رہا۔[56]

مصنف کی طرف سے کیے گئے مختلف شخصیات کے نفسیاتی تجزیے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ سوانح نگاری کی صنف میں سب سے پہلا مسئلہ خود سوانح نگار کے اپنے محرک پر مبنی ہے، شواہد پر نہیں۔ اگر اس کا مقصد ایک مسلسل تاریخی داستان کو بیان کرنا ہے تو پھر تو طریقہ کار بہت پیچیدہ نہیں ہوتا۔ تاریخ وار حقائق اور راویوں کی صداقت کی جانچ ہی اس کے اہم فرائض ہو سکتے ہیں۔ اس کے برعکس، اگر صاحبِ سوانح کے کردار یا اس کے افعال کے اندرونی محرکات کا اندازہ لگانے کی کوشش کی جائے، تو طریقہ کار میں مصنف کی دخل اندازی کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ ایسے میں سوانح نگار اپنی تنقیدی بصیرت سے، مواد سے تخیلاتی گفتگو کرتا ہے۔ سوانح نگار کا کردار اس طرح مرکزی اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے۔ اس کے اندرونی محرکات، اس کی اپنی تصنیف میں پیش رفت کا باعث بنتے ہیں۔ لیکن ایک بات ملحوظ رہے کہ نبی کریم ﷺ کے دور کے عام انسانوں کی نفسیات کے تجزیے کے بارے میں تو سوچا جا سکتا ہے، لیکن کیا آقا ﷺ کے افعال اور ان ﷺ کی کیفیات کا نفسیاتی تجزیہ ممکن ہے؟ مصنف نے اپنے تئیں آپ ﷺ کی نفسیات کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے، ہر چند کہ وہ احترام کی حدود سے باہر نہیں گئے، لیکن حقیقت یہ ہے محبوبِ خدا، محمد

مصطفیٰ ﷺ، جن کا رتبہ اللہ پاک کے بعد سب سے بلند ہے۔ان کی نفسیات تک رسائی کسی بشر کے بس کی بات ہے نہیں۔

اختتامی حصہ(Ending):

کہانی کا اختتام بھی آغاز کی طرح متنوع ہوتا ہے۔

> We prefer not to read the subject's death, as perhaps it should be read, as without content, merely contingent, just the next fact in a series of facts.... We feel we must stage it and interpret it, or overinterpret it.[۵۷]

معروف برطانوی نژاد سوانح نگار اور ادبی نقاد ہرمایونی لی(Hermione Lee) کی درج بالا رائے عام انسانوں کی نفسیات کے بالکل عین مطابق ہے۔ انسانوں کی پرانی روایت کے مشترکہ اثرات اور "خاتمہ کے احساس" کے بارے میں ہماری نفسیات پر یہ رائے مکمل زندگی کے لیے فہم پیدا کرنے کی ہماری ضرورت کو پورا کرتی ہے۔سوانح نگاروں کا بنیادی مسئلہ ہے کہ زندگی کی کہانی کو ختم کیسے کریں؟سوانح نگاری میں یہ دیکھا جانا چاہیے کہ سوانح نگار اپنے موضوع کی موت سے کیسے نمٹتے ہیں؟وہ اسے زندگی سے کیسے جوڑتے ہیں؟واقعے کی تفاصیل اور مصنف کی آواز اور اس کا لب ولہجہ،یہ سب سوانح نگاری کے اختتام میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔[۵۸]

نبی کریم ﷺ ایک غیر معمولی انسان ہیں۔انؐ کے دنیا سے ظاہری پردہ فرمانے اور اپنی امت خاص کر وہ لوگ،جو اس وقت محبت کے پروانے بنے،نبی ﷺ کے گرد موجود تھے۔ان کے احساسات اور جذبات کی تصویر کشی کرنا کسی عام لکھاری کے بس کی بات نہیں۔آقا ﷺ کے آخر میں آپ ﷺ کے ظاہری پردے کے بعد اُس وقت کے مسلمانوں کی محبت وعقیدت اور رنج اور گہرے دکھ سے لبریز جذبات کا اظہار نہ کیا جاتا،تو یقیناً "غیر فطری معلوم ہوتا۔ابدال بیلا نے حضور اکرم ﷺ کے وصال مبارک کے حالات کو قلم بند کرنے کے لیے باب کا عنوان ہی "الوداع" تجویز کیا۔مصنف جدید سوانح نگاری کے انداز میں قارئین کو اپنے ہیرو کی "موت" کے موضوع کی طرف لا رہے ہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ دلاسہ دے رہے ہیں،گویا ان کو نبی آخر الزماں ﷺ کے دنیا سے پردہ فرمانے کی توجیہ بیان کر رہے ہوں۔وہ لکھتے ہیں:

> جو عظیم ترین ہستی ایک بڑے مقصد،عالمگیر آدرش اور کائنات بھر کی ہدایت کے لیے دنیا میں آئی ہو،اس سے اپنا کام مکمل کرنے کے بعد دنیا میں پھر رہا نہیں جاتا۔اس پاکیزہ ترین خوش خصال کو پھر

اس خدا سے ملنے کی جلدی ہوتی ہے، جس نے قدم قدم پر انہیں سنبھالا، پڑھایا، راستہ دکھایا، دشمنوں سے بچایا، ہر بات کو بتایا، جی کھول کے سراہا، سجایا اور پورے جہانوں کے ہر ذی ہوش سے منوایا۔[۵۹]

یہاں آقا ﷺ پر خدائے بزرگ و برتر کے انعامات کا ذکر کر کے گویا ہمارے اذہان کو نبی ﷺ کی جدائی کے لیے تیار کیا جارہا ہے۔ شاید مصنف کے پیشِ نظر یہ بات ہو کہ قارئین، آقا ﷺ پر اللہ تعالیٰ کے انعامات کے ذکر سے آپ ﷺ کی اپنے رب سے ملاقات کی خوشی میں اپنے نبی ﷺ کی خود سے ظاہری جدائی کا صدمہ سہہ جانے کے قابل ہو پائیں گے۔ مصنف کا یہ انداز جدید سوانح نگاری کے عین مطابق ہے۔ جدید سوانح نگار سے یہ تقاضا کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ہیرو کی "موت" کے بیان سے پہلے قاری کو نفسیاتی طور پر تیار کریں۔ اس مقصد کے لیے ابدال بیلا ہر حربہ استعمال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، تاکہ صحیح معنوں میں اس موضوع کو سنبھال سکیں۔ وہ Snapshot کے ذریعے صرف تسلسل ہی برقرار نہیں رکھتے، بلکہ جذباتی رنگ اور پرجوش طریقے سے منظر کو قاری کے تخیل میں لے جاتے ہیں۔ ان کا ذہن کبھی تو آقا ﷺ پر اللہ کے انعامات کی تفصیل میں گم ہے، تو کبھی کبھی ان کو آقا ﷺ پر ہونے والے ظلم و ستم یاد آرہے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی تصنیف کی کہانی کی روانی اور تسلسل کے لحاظ سے، حضورِ اکرم ﷺ سے بچھڑ جانے کے غم سے نڈھال، صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کی دل سوز کیفیت بیان کر رہے ہیں۔ ایک طرف مصنف کی طرف سے آقا ﷺ کے آخری رمضان مبارک کے اعتکاف کا ذکر کیا جارہا ہے تو دوسری طرف انہیں حجتہ الوداع کے موقع پر آقا ﷺ کا وہ فرمان یاد آرہا ہے، جس میں آقا ﷺ نے فرمایا تھا کہ "شاید اس سال کے بعد، اس مقام پہ تم لوگوں سے ملاقات نہ ہو۔"[۶۰] یہاں مصنف اپنے شعور کی رو کو نہ تو کسی ایک مقام کا پابند بنا رہے ہیں اور نہ ہی کسی ایک زمانے پر اپنی سوچ کو مرتکز کر رہے ہیں۔ ان کی سوچ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو کر جلدی جلدی سب تصویریں یکجا کر رہی ہے۔ وقت، یاداشت اور شناخت کا احساس ہمیں ابدال بیلا کے ہاں باہم جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہی جدید سوانح نگاری کے بنیادی تصورات ہیں۔ قدیم سوانح نگاروں کے ہاں ہمیں اس رجحان کا فقدان نظر آتا ہے۔ ورجینیا وولف بھی ماضی کے سوانح نگاروں پر تنقید کرتی ہیں کہ ماضی میں وہ صرف گھڑی کے وقت میں واقعات کی منظم رفتار کے ساتھ ہونے والے حقائق سے سروکار رکھتے، جب کہ ان تمام ناقابلِ فراموش لمحات کو، جو کسی بھی شخصیت کی داخلی زندگی کی کلید ہیں، بیان کرنے سے گریزاں رہے۔[۶۱] یہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی فرد کسی بیرونی عمل کی تحریک سے اپنے دماغ میں چلتے وقت کی قید سے آزاد ہو سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بیرونی عمل، اس کی شناخت کو توڑنے کے مترادف ہے، یہاں تک کہ وہ خود کو اس "ذہنی ٹائم فریم" سے کھینچ نکالے اور اس کا ذہن دوبارہ اپنے اندر موجود چیزوں کو پکڑنے کا وہم نہ پائے۔ ممکنہ تحلیل کا یہ تجربہ، اپنے وجود سے

الگ ہو جانے کا احساس اور اپنے اندر مختلف قسم کے تصورات و خیالات، انسان کو ایک ہی وقت میں مختلف زمانوں کی سیر کروا سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ورجینا وولف کہتی ہیں کہ خیالات کی متغیر جیو میٹری، وقت کے تجربے کو بہت ساری سمتوں میں پھیلا دیتی ہے اور غیر متوقع دورانیے کی متفرق چیزوں (Odds and Ends) سے بھر دیتی ہے۔ دراصل یہی متفرق چیزیں "یاداشت" ہیں، جو ہر فرد کو اس کے ہونے کا احساس فراہم کرتی ہیں۔[۶۲]

اسی تکنیک کو شعور کی رو کہا جاتا ہے۔ یہ دراصل گھڑی کی سوئیوں میں گردش کرنے والے وقت (Time in the click) اور دماغ میں چلنے والے وقت (Time in the mind) کے مابین تضاد کا نام ہے۔[۶۳] ہم دیکھتے ہیں کہ آقاﷺ میں مصنف کے ذہن میں سوچوں اور افکار کا مجموعہ، بلا تعطل، بغیر کسی رکاوٹ کے وقوع پذیر ہوتا رہتا ہے۔ سوچوں اور افکار کا یہ بہاؤ، ان کی سوچ کے عمل کو رواں کرتا ہے۔ ایک طرف مصنف ۱۲ ربیع الاوّل کی اُس اداس صبح کا ذکر کر رہے ہیں، جب آقاﷺ ہمیشہ کے لیے اپنے چاہنے والوں سے جدا ہوئے، لیکن ساتھ ہی ان کی سوچ ماضی میں پرواز کر کے مکہ سے مدینہ ہجرت کے موقع پر پہنچی ہوئی ہے، اور وہ نبی پاکﷺ کے درخت کے سائے میں بیٹھنے کا واقعہ سنانے میں مصروف ہیں۔ مصنف بیان کرتے ہیں:

> وہ صبح دھیرے دھیرے اس لمحے کی طرف بڑھ رہی تھی، جب دوپہر ہونے سے ذرا پہلے، آقاﷺ مکہ سے ہجرت کر کے مدینے کی دہلیزِ قبا پہ دس سال پہلے اسی تاریخ ۱۲ ربیع الاوّل کو پہنچے تھے۔ اور ایک درخت کے سائے کے باہر دھوپ میں کھڑے ہو کے، استقبال میں آئے ہوئے متوالوں میں سے اس درخت کے مالک سے پوچھا تھا۔
>
> "اگر اجازت ہو، تو میں ذرا آپ کے درخت کے سائے میں بیٹھ جاؤں؟
>
> آقاﷺ درخت کے سائے میں بیٹھے۔
>
> پورے جہاں کو اپنی عافیت اور سلامتی کا سایہ دے دیا۔[۶۴]

مصنف نے اس کے بعد اپنا سلسلہ کلام پھر سے آقاﷺ کی ذاتِ پاک سے عقیدت کے بیان سے جوڑ دیا۔

> آقاﷺ وہی شجرِ سایہ دار ہیں، جو کائنات بھر کی پوری زندگی میں پہلی بار زمین پہ اگا، بڑھا، پھیلا اور تمام بنی نوعِ انسانیت کے لیے سراپا رحم اور کرم بنا۔[۶۵]

اب مصنف اسی دن (۱۲ ربیع الاوّل) کے حوالے سے آقاﷺ کے جنم دن کا ذکر کر رہے ہیں۔ آسمان پہ فرشتوں کے چراغاں کرنے کا ذکر۔۔۔۔۔

> یہی ۱۲ ربیع الاوّل آقاﷺ کا جنم دن تھا۔
>
> جب آسمانوں پہ خدا کے سب فرشتوں نے چراغاں کیا تھا کہ آج سراجِ منیر زمین پہ اتارا جا رہا ہے۔ انسانوں کے دکھوں کا آخری مداوا انسانوں اور جنوں کو عطا کیا جا رہا ہے۔[۶۶]

آقا ﷺ سے بچھڑنے کے غم کو بیان کرنے اور اس کی صحیح تصویر کشی کرنے کے لیے مصنف نے جابجا صنعتِ تجسیم سے بھی خوب کام لیا ہے۔ آقا ﷺ سے منسوب ہر چیز جیسے محوِ گریہ تھی۔ آقا ﷺ کے آخری دنوں میں بخار کی کیفیت میں سات کنوؤں کا پانی آپ ﷺ پر ڈالنے کا واقعہ بیان کیا تو کنوؤں کے جذبات اور محسوسات کا بھی اظہار کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ "ساتوں کنویں بھی تو آقا ﷺ کے جسمِ اطہر کو چھو جانے کے پیاسے تھے۔[67] کنوؤں سے برابر پانی منگوانے کا ذکر کیا تو بولے کہ " کوئی کنوں شکایت میں روئے نا کہ آقا ﷺ میرے جسم سے کچھ بوندیں کم نکالی گئیں۔"[68]

آقا ﷺ کے آخری وقت میں آپ ﷺ کے جوتوں کے بارے میں کہا کہ "وہیں چارپائی کے نیچے آقا ﷺ کے جوتے جو اس لمحے کے بعد آقا ﷺ کے پیروں میں سمانے کو ترستے رہے۔"[69]

آقا ﷺ کے آخری لمحات کا ذکر اس انداز سے کیا کہ قاری الفاظ کے چناؤ میں کھو کے نبی پاک ﷺ کی عظمت کی گواہی دینے پہ مجبور ہو جائے۔ وہ لکھتے ہیں:

> زمین و آسمان کے سارے چاند، سارے سورج، سارے ستارے، جیسے پھڑ پھڑا کے گھومے اور ٹوٹ گئے۔
>
> وقتِ نزاع آگیا۔
>
> آقا ﷺ کی آنکھوں کا ماہ کامل دھیرے دھیرے پتھرانے لگا۔
>
> عرب کا چاند ﷺ آسمان کے ماہِ کامل کی آنکھ بننے لگا۔
>
> جنم جنم سے ملی اپنی چاندنی کو چاند منجمد کر کے ایسے تک رہا تھا کہ چاند دکھائی نہ بھی دے تو، چاندنی رہے۔ نور برستا رہے۔
>
> آقا ﷺ کی آنکھوں کے چاند پتھرا گئے۔ آسمان تکتے، آسمان پہ رفیقِ اعلیٰ پہ جم گئے۔
>
> انا للہ وانا الیہ راجعون۔[70]

مصنف نے اس نازک اور غمگیں موقع پر برمحل تشبیہات کے استعمال سے اپنی عبارت کو متاثر کن بنایا ہے۔ آقا ﷺ کے چہرہ انور کے بارے میں لکھا کہ "آقا ﷺ کا قرآن کے صفحے جیسا روشن سفید چہرہ یوں محسوس ہوا جیسے پڑھا جا رہا ہو۔[71] آقا ﷺ کے وصال مبارک کی خبر سننے کے بعد لوگوں کی حالِ زار کے بارے میں کہا کہ "لوگ کٹی ہوئی گردنوں والی مرغیوں کی طرح جان کنی کے دکھ میں پھڑ پھڑاتے، ادھر ادھر گرنے لگے۔"[72] حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہا کہ "اور وہ اپنا پہاڑ جیسا جسم لے کر دھڑام سے ریزہ ریزہ ہو کے زمین پہ گر پڑے۔"[73]

مصنف نبی مکرم ﷺ کے وصال مبارک کے حالات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ قارئین کو آپ ﷺ

کے اخلاقِ کریمانہ سے متعارف بھی کرواتے نظر آتے ہیں۔ دراصل تاریخی نمائندگی کے لیے "بیانیہ" ایک اہم ذریعہ ہے، لیکن یہ اپنے ساتھ تاریخ نگار کا اخلاقی مؤقف بھی رکھتا ہے، جو کہ صاحبِ سوانح کی زندگی کی کہانی کی ترجمانی کرنے کے عمل میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ آقا ﷺ نے آخری دنوں میں اپنے گھر میں پڑے سات دینار بھی صدقہ کرنے کا حکم دے دیا۔ آقا ﷺ کے پاس آخری وقت میں بچ جانے والے اثاثوں کی تفصیل بتا کر قارئین کی توجہ فوراً ہی آقا ﷺ کی صحت کے دنوں کے ایک واقعہ کی طرف مبذول کروا رہے ہیں۔

آقا ﷺ صحت کے دنوں میں ایک بار ساتھ باہر بیٹھے کہیں کھانا کھا رہے تھے۔ ایک بوڑھی
عورت قریب سے گزری۔ آقا ﷺ کو کھانا کھاتے دیکھ کے بولی،
دیکھو، کیسے غلاموں میں بیٹھ کے، غلاموں کی طرح کھانا کھا رہے ہیں؟
آقا ﷺ مسکرائے۔
بڑی بی سے عجز سے بولے۔
ماں جی، مجھ سے بڑا غلام کون ہے؟
میں اپنے رب کا غلام ہوں۔
اسی سے روز التجا کرتا ہوں،
اللہ مجھے مسکینوں میں رکھنا مسکینوں ہی سے اٹھانا۔[۴۴]

آقا ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کی کہانی کے بیان کے ساتھ ساتھ مصنف اخلاقیات کا پرچار بھی کر رہے ہیں۔

وہ آقا ﷺ جن کو زمین و مکان، جگہ اور وقت، ساتوں آسمانوں پہ دسترس دی گئی، انہوں نے با رضا اور رغبت مسکینی چنی۔ اپنے عہد کے کمزور ترین، سب سے بے مایہ شخص اور شہری سے اپنی ذاتی آسانیاں اور گھر کے اثاثے نہیں بڑھنے دیے۔ یہ تھی میرے آقا ﷺ کی لیڈرشپ۔
یہی اصول آقا ﷺ نے اپنے پیروکاروں کو عمل کر کے سکھایا۔[۴۵]

آج کل کے جدید دور میں، جہاں اخلاقیات کی یقینی کمی ہے، جدید سیرت نگاری کے لیے ضروری ہے کہ صاحبِ سوانح کی زندگی کے اختتام کے لیے مناسب انداز اپنایا جائے، جو ان کے بیانیے میں قارئین کے جذبات اور سوچ کو موڑنے کے کام آئے۔

مصنف نے اپنی تصنیف آقا ﷺ میں جب سرورِ انبیا ﷺ کی تدفین کا ذکر کیا تو انداز میں وہ ہی والہانہ اور جذباتی پن نمایاں رکھا، جو پوری تصنیف میں ان کا خاصہ رہا۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

اب وہ ماہِ کامل، وہ تاجدارِ حرم، وہ کائنات کے رتھ کو سیدھا راستہ دکھانے والے ہادی ﷺ، منوں مٹی کے نیچے چھپائے جا رہے ہیں۔ زمین و آسمان اور جو کچھ اس کے بیچ میں ہے، سب جن کے صدقے بنایا گیا، انہیں اسی مٹی کے ذروں میں چھپا دیا گیا۔[76]

آقا ﷺ کی لحد مبارک کی مقدس مٹی کا ذکر کچھ اس طرح کیا:

اس مٹی کے ایک ایک ذرے میں آسمان کے چاند، خورشید اور ستاروں سے بڑھ کے خوش بختی ہے۔ یہ ہمارے آقا ﷺ کا بچھونا مٹی ہے۔ قبر مبارک کے نیچے تہ وہ ہی ان کے کندھوں پہ پہنی ہوئی سرخ چادر ہے اور اوپر یہ متبرک مٹی۔[77]

جب قاری، آقا ﷺ کتاب کے پچھلے بہت سارے صفحات میں،، مصنف کے ساتھ سفر کر کے اس طویل سفر کے آخری مرحلے پر پہنچتے ہیں، تو مصنف اپنے مخصوص لہجے، انداز اور والہانہ پن سے ان کی توجہ آقا ﷺ کی قبر مبارک کی مقدس مٹی کی طرف موڑ دیتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے آقا ﷺ کی دائمی جدائی کا ذکر کرنے کے بعد اب قارئین کو پھر سے آپ ﷺ کے وجودِ مطہر کے قریب ہونے کا ذریعہ بتا رہے ہوں۔ کہتے ہیں:

ایک قدیمی آقا ﷺ کے عقیدت مند کی آقا ﷺ کی قبر مبارک سے اٹھائی ہوئی ایک مٹھی مبارک ترین مٹی میں سے ایک چٹکی بھر وہ ہی مٹی مجھ سے حقیر، بے مایہ، گنہگار کو مل گئی۔ جس مٹی کے ایک ایک ذرے کے آگے آسمان کے سارے ستارے، سورج اور چاند ہیچ ہیں۔[78]

مصنف نے اپنی تصنیف کے اختتام پر اپنی اگلی تصنیف کا ذکر کر کے گویا اپنے ساتھ قاری کے تجسس کو ہوا دے کر اگلے سفر پہ آمادہ کر رہے ہیں۔

اس چٹکی بھر مقدس مٹی کی کہانی اپنی اگلی کتاب "اعتکاف" میں لکھوں گا ان شاءاللہ، اگر خدا نے توفیق دی۔ وہ اعتکاف "جو مسجد نبوی ﷺ میں کیا اور عیدی میں وہ خوش بخت مٹی ملی۔[79]

آخر میں قارئین کو اپنے نبی پاک ﷺ سے ملاقات کی نوید درج ذیل الفاظ میں سنا کر مطمئن بھی کر رہے ہیں:

ہزاروں درود و سلام ہو
میرے آقا ﷺ پہ
جو اپنے پروانوں
چاہنے والوں
کے ہر سلام کا جواب دیتے ہیں۔
یاد کرنے والوں کو یاد رکھتے ہیں۔
اور جو آقا ﷺ کو یاد ہو

اسے زمانہ کبھی کیسے بھلا سکتا ہے؟[۸۰]

جیمز لوری کلفرڈ اور مائیکل بینٹن کے نظری مباحث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سوانح نگاری کے فن میں حقائق کی وضاحت کے ساتھ ساتھ "ایجاد" بھی شامل ہے۔اس صنف میں "زندگی کی کہانی" کو "زندہ شاہکار" بنانے کے لیے بیانیہ کے عمل دخل سے انکار ممکن نہیں۔مائیکل بینٹن زور دیتے ہیں کہ اس صنف میں داستانی انداز کے حامل اُس بیانیے کو اعلانیہ طور پر قبول کرنا چاہیے، جو "گزشتہ" کو "حال" بنا دیتا ہے۔ سوانح نگاری کی اقسام؛معروضی بایو گرافی، علمی، تاریخی بایو گرافی، فنکارانہ (ادیبانہ) بایو گرافی، بیانیہ بایو گرافی اور افسانوی بایو گرافی، کا آقاﷺ پر اطلاق کرنے اور اس تصنیف کے آغاز، وسط اور اختتام کا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد محقق کی رائے ہے کہ اس تصنیف کو ادیبانہ/فنکارانہ بایو گرافی (Artistic Biography) کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے مذکورہ تصنیف میں پیش کیے گئے اقتباسات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ابدال بیلا اپنی تصنیف آقاﷺ میں تصوراتی تخلیقی فن کار کے طور پر حقائق کو پیش کرتے ہیں۔

آقاﷺ میں سیرتِ نبی پاک ﷺ کو ایک کہانی کے انداز میں بیان کرنے کے لیے، مصنف نے اپنی تصنیف کی ہئیت اور ڈھانچے سے لے کر مواد کی پیش کش تک، اپنے ذہن کو موضوع سے باہر نہیں جانے دیا۔اپنی تحریر میں روانی اور تسلسل برقرار رکھنے کے لیے مصنف نے ہر ممکن کوشش کی ہے۔واقعات کے بیان میں کرداروں کی ذہنی استعداد کو دیکھتے ہوئے، جہاں مناسب لگا، وہاں ان کا نفسیاتی تجزیہ بھی کرنے کی کوشش کی ہے۔ آقاﷺ کے مصنف نے اپنی تصنیف میں Interwoven technique تکنیک کی مدد سے بھی خوب کام لیا ہے۔اس تکنیک میں سوانح نگار، قاری کو جمالیاتی انداز میں صاحبِ سوانح کی تخلیقات کی طرف راغب کرتا ہے اور اپنی تحریر کے درمیان ہی (اس کی تخلیقات کا) تجزیہ پیش کرتا ہے۔جیسا کہ آقاﷺ میں ہم دیکھتے ہیں کہ مصنف نامحسوس طریقے سے نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات کا پرچار کر رہے ہیں۔ اپنی تحریر میں مختلف واقعات اور ان میں ہم آہنگی کے مصنف نے سیرت کے واقعات کا چناؤ خوب سوچ سمجھ کے کیا ہے۔اپنی تنقیدی بصیرت سے کام لے کر ان روایات کو ترجیح دی ہے، جن سے فرقہ پرستی کو ہوا نہ ملے۔اس حوالے سے وہ خود دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ یہ تصنیف انسانیت کو جوڑنے والی ہے۔

ابدال بیلا بنیادی طور پر چوں کہ ایک ناول نگار اور افسانہ نگار ہیں، اس لیے ان کا سارا کام ہی ادبی نوعیت کا ہے۔ ایک ادیب ہونے کے ناطے انھیں واقعہ نگاری میں کمال حاصل ہے۔وہ واقعے کی تمام جزئیات کو اپنے تخیل سے ایسے بیان کرتے ہیں کہ واقعے کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔کردار نگاری میں بھی مصنف نے خوب محنت سے

کام لیا ہے۔ان کی تصنیف میں جن اشخاص کا ذکر ملتا ہے،ان کے مخصوص امتیازات اور خصوصیات کو کردار نگاری میں نمایاں رکھتے ہیں۔وہ کسی بھی کردار کی زندگی کے متعلق اہم خدوخال کو مثلاً واقعات و حالات ،اس کی عادات و اطوار، حرکات و سکنات،اس کے حلیہ، لباس اور طرزِ گفتگو کو اس کے مزاج کے عین مطابق اس طرح اجاگر کرتے ہیں کہ قاری کی نگاہوں کے سامنے اُس انسان کی چلتی پھرتی شخصیت نمایاں ہو جاتی ہے۔ اگرچہ سلاست ،روانی اور شگفتگی کے دیگر لوازمات ان کی تصنیف میں بہت نمایاں ہیں اور پوری تصنیف میں ناول اور کہانی کا انداز نظر آتا ہے، لیکن سیرت جیسے نازک اور حساس موضوع کا عنوان ہی کائنات کی سب سے معتبر ہستی کی داستانِ حیات ہے۔ جس کے بیان میں تخیلاتی اسلوب سے مبالغے کا گمان ہوتا ہے۔اس موضوع میں تخیل کا استعمال عام سوانح نگاری کے مقابلے میں زیادہ احتیاط کا متاضی ہے۔

مصنف نے اپنی تصنیف میں جا بجا نفسیاتی تجزیے سے مدد لی ہے۔ آقاﷺ میں دیگر اشخاص کے علاوہ انھوں نے اپنے شعور کو عام انسانوں کی سطح پہ لا کے ، رسولِ پاک ﷺ کی نفسیاتی کیفیت کا تجزیہ کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ ان کا انداز ایسا ہے کہ پڑھنے والا اپنے آپ کو اسی ماحول میں محسوس کرے۔ایک سوانح نگار کی یہ خوبی ہے کہ وہ اپنے تخیل اور قیاس کی مدد سے حقیقت کو ڈھونڈ نکالے۔اگرچہ آقاﷺ میں مصنف کے پیشِ نظر یہ ہے کہ وہ عام انسان کی سوانح نہیں لکھ رہے، لیکن اس کے باوجود وہ بہت سے مقامات پر آقا ﷺ کی نفسیاتی و بشری کیفیت کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ ہر چند کہ وہ احترام کی حدود سے باہر نہیں گئے، لیکن حقیقت یہ ہے محبوبِ خدا، محمد مصطفی ﷺ، جن کا رتبہ اللہ پاک کے بعد سب سے بلند ہے۔ان کی نفسیات تک رسائی کسی بشر کے بس کی بات ہے نہیں۔

جدید سوانح نگاری سوانح نگار سے یہ مطالبہ بھی کرتی ہے کہ اسے تاریخی حقائق کی تفصیلات پر مکمل عبور حاصل ہو،تاکہ وہ حقائق کی صداقت کو برقرار رکھتے ہوئے ڈرامائی انداز میں زندگی کی تخلیقِ نو کر سکے۔یعنی وہ اپنی رائے اور بصیرت سے واقعات کو دوبارہ تخلیق کرے اور بتائے کہ یہ واقعہ اس طرح ہوا ہو گا، لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ واقعے کی مزید تفصیلات حواشی میں لازماً درج کرے۔آقاﷺ کتاب کے حوالے سے دیکھا جائے تو مصنف اس اصول پہ پورا اترتے ہوئے محسوس نہیں ہوتے۔ان کا اپنا دعویٰ ہے کہ انہوں نے کسی بھی واقعے کے بارے میں مختلف روایات میں سے کسی ایک مخصوص روایت کا انتخاب بہت سوچ بچار کے بعد کیا، لیکن انہوں نے اپنی تصنیف میں کہیں بھی ان روایات کا ذکر نہیں کیا،نہ ہی حواشی یا حوالہ جات میں ان روایات کو بیان کیا۔ سوانح نگاری کا یہ بنیادی اصول ہے کہ تمام شواہد کی تفاصیل اضافی نوٹس یا حواشی میں بیان کی جائیں۔بے شک غیر ضروری طوالت سے بچنے کے لیے انہیں متن

میں جگہ نہ بھی دی جائے، لیکن قاری تک مآخذ کو پہنچانا سوانح نگاری کی ذمہ داری ہے۔ اپنی تصنیف میں ابدال بیلا اس ذمہ داری سے مکمل طور پر عہدہ برآ ہوتے نظر نہیں آتے۔

حوالہ جات

۱۔ ہینس رینڈرز، ڈی بن ہان(Hanss Renders, De Binne Han)، دیباچہ *Biographical Turns:Lives in History*، (لندن: راؤٹ لیج، ۲۰۱۷ء)۔

۲۔ لیئن ایڈل، (Leon Edel) *Writing Lives*، (نیویارک: نارٹن، ۱۹۸۴ء)، ص ۳۱۔

۳۔ مائیکل بینٹن(Michael Benton) *Literary Biography:An Introduction* (یوکے: ویلی۔ بلیک ویل پبلشرز، ۲۰۰۹ء)، ص ۵۔

۴۔ رابرٹ فریزر(Robert Fraser)، دیباچہ *After Ancient Biography* (سوئزرلینڈ: سپرنگر نیچر، ۲۰۲۰ء)۔

۵۔ مائیکل بینٹن(Michael Benton) *Literary Biography:An Introduction*، ص ۱۳۔

۶۔ جیمز لوری کلفرڈ(James Lowry Clifford) *From Puzzle To Portrait: Problems of literary Biographers*، (چیپل ہل: یونیورسٹی آف نارتھ کیلیفورنیا پریس، ۱۹۷۰ء)، ص ۳۔

۷۔ ایضاً، ص ۴۔

۸۔ ایضاً، ص ۱۰۹۔

۹۔ ایضاً، ص ۸۱۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۱۰۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۸۵۔

۱۲۔ ایضاً۔

۱۳۔ ایضاً۔

۱۴۔ ایضاً۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۸۶۔

۱۶۔ مائیکل بینٹن(Michael Benton) *Literary Biography:An Introduction*، ص ۲، ۳۔

۱۷۔ جیمز لوری کلفرڈ(James Lowry Clifford) *From Puzzle To Portrait: Problems of literary Biographers*، ص ۸۷۔

۱۸۔ مائیکل بینٹن(Michael Benton) *Literary Biography:An Introduction*،

ص۲۱۔

۱۹۔ ایضاً۔

۲۰۔ راقم کا انٹرویو، ص۲۔

۲۱۔ جیمز لوری کلفرڈ(James Lowry Clifford) *From Puzzle To Portrait: Problems of literary Biographers*، ص۲۹۔

۲۲۔ نجیبہ عارف، "نوآبادیاتی عہد میں اردو سیرت نگاری: چند مخصوص رجحانات و اسالیب کا جائزہ" مشمولہ دورِ جدید میں سیرت نگاری کے رجحانات (مارچ ۲۰۱۱ء): ص۵۱۶، ۵۱۷۔

۲۳۔ ابدال بیلا ,آقاﷺ، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء)، ص۲۷۔

۲۴۔ ایضاً۔

۲۵۔ ایضاً، ص۴۲۔

۲۶۔ ایضاً، ص۲۸۔

۲۷۔ ایضاً ۔

۲۸۔ مائیکل بینٹن(Michael Benton) *Literary Biography:An Introduction* ، ص۲۱۔

۲۹۔ راقم کا انٹرویو، ص۹۔

۳۰۔ ابدال بیلا ,آقاﷺ، ص۳۴۴۔

۳۱۔ ایضاً، ص۵۸۶، ۵۸۷۔

۳۲۔ ایضاً، ص۵۸۷۔

۳۳۔ ایضاً، ص۹۶۹۔

۳۴۔ ایضاً، ص۹۷۰۔

۳۵۔ ایضاً، ص۳۴۳۔

۳۶۔ ایضاً، ص ۵۶۰۔ ۵۶۴۔

۳۷۔ ایضاً، ص۳۴۸۔

۳۸۔ ایضاً، ص۴۷۸۔

۳۹۔ ایضاً، ص۴۹۶۔

۴۰۔ ایضاً ،ص۱۱۱۔

۴۱۔ ایضاً، ص۱۴۹، ۱۵۰۔

۴۲۔ ایضاً ،ص۱۰۲۰۔

۴۳۔ ایضاً ،ص۳۸۰۔

۴۴۔ جیمز لوری کلفرڈ(James Lowry Clifford) *From Puzzle To Portrait: Problems of literary Biographers*، ص۱۰۶۔

۴۵۔ لیئن ایڈل،(Leon Edel,)، *Literary Biography*، (ٹورنٹو: یونیورسٹی آف ٹورنٹو پریس،۱۹۵۷ء)، ص۶۰۔

۴۶۔ ابدال بیلا ,آقاﷺ، ص۲۲۹۔

۴۷۔ ایضاً، ص۲۳۲۔

۴۸۔ ایضاً، ص۲۳۲،۲۳۳۔

۴۹۔ ایضاً، ص۲۳۴۔

۵۰۔ ایضاً، ص۲۶۵۔

۵۱۔ ایضاً، ص۳۲۵۔

۵۲۔ ایضاً، ص۹۸۵،۹۸۶۔

۵۳۔ ایضاً، ص۹۹۱۔

۵۴۔ ایضاً، ص۹۹۲۔

۵۵۔ ایضاً۔

۵۶۔ ایضاً، ص۱۰۱۴۔

۵۷۔ مائیکل بینٹن(Michael Benton) *Literary Biography:An Introduction*، ص۲۵۔

۵۸۔ ایضاً ۔

۵۹۔ ابدال بیلا ,آقاﷺ، ص۱۱۰۳۔

۶۰۔ ایضاً، ص۱۱۰۶۔

۶۱۔ مائیکل بینٹن(Michael Benton)*Literary Biography:An Introduction*، ص۱۴۔

۶۲۔ ایضاً، ص۱۶۔

۶۳۔ ایضاً، ص۱۴۔

۶۴۔ ابدال بیلا ,آقاﷺ، ص۱۱۲۳۔

۶۵۔ ایضاً ۔

۶۶۔ ایضاً ۔

۶۷۔ ایضاً، ص۱۱۱۰۔

۶۸۔ ایضاً، ص ۱۱۱۱۔

۶۹۔ ایضاً، ص ۱۱۲۵۔

۷۰۔ ایضاً، ص ۱۱۲۸۔

۷۱۔ ایضاً۔

۷۲۔ ایضاً، ص ۱۱۲۹۔

۷۳۔ ایضاً، ص ۱۱۳۲۔

۷۴۔ ایضاً، ص ۱۱۲۷۔

۷۵۔ ایضاً ۔

۷۶۔ ایضاً، ص ۱۱۳۵۔

۷۷۔ ایضاً ۔

۷۸۔ ایضاً، ص ۱۱۳۶۔

۷۹۔ ایضاً ۔

۸۰۔ ایضاً ۔

باب چہارم

آقا ﷺ میں تاریخ نگاری کے معاصر اصول

باب چہارم:

آقا ﷺ میں تاریخ نگاری کے معاصر اصول

تاریخ نگاری ایک مستحکم علمی طریق کار ہے، جس کی اپنی ایک طویل روایت موجود ہے۔ تاریخی مطالعات ہمیشہ سچائی کا دعویٰ کرتے ہیں، مگر تاریخ نویسی محض گذرے ہوئے واقعات کی جمع بندی نہیں ہوتی بلکہ اس کو بیان کرنے کے کچھ پیمانے اور فکری و فنی تقاضے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حقائق کی جانچ پرکھ کے لیے تاریخ کے مخصوص منہج استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ تاریخی عمل کو سائنس کے طور پر متعارف کرواتے ہیں، جو کہ حقائق کی تحقیق میں زیادہ مہارت کا تقاضا کرتے ہیں۔ علمی طریق کار کی حیثیت سے تاریخ کے جدید مطالعات تاریخی صداقت کے اعتبار سے روایتی انداز سے الگ ہو جاتے ہیں کیوں کہ موجودہ دور میں تیزی سے بدلتے ہوئے سماجی سائنس کے نظریات نے تاریخ نگاری کے سیاق و سباق کو بھی تبدیل کرتے ہوئے اس کی تنظیم نو کی ہے۔ بیسویں صدی کے وسط سے لے کر اکیسویں صدی کے آغاز تک کی تاریخ نگاری کی خصوصیات کا موازنہ کیا جائے تو مؤرخین کے تاریخی ادراک، تاریخی علوم، ان کی حیثیت اور تاریخی واقعات کے بیان کے انداز میں بھی نمایاں تبدیلی دیکھی جاسکتی ہے۔ ۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کی دہائیوں میں تاریخی متون کی تشریحات کے بارے میں سنجیدہ مباحث منظر عام پر آئے جن میں تاریخ نویسی کے بہتر تصورات پیش کیے گئے اور آئندہ کے لیے نیا لائحہ عمل ترتیب دیا گیا۔ ماہرین کے یک موضوعی مقالات اور مضامین نے نہ صرف مؤرخین کو درپیش چیلنجز پر روشنی ڈالی، بلکہ ان چیلنجز کے ردِ عمل کو بھی نمایاں کیا۔ تاریخ کے سامنے جدیدیت کے بعد بنیادی چیلنج تاریخی صداقت کے ادراک کے حوالے سے تھا، جس کا نتیجہ ماضی کی مناسب تعمیر نو کی شکل کے طور پر سامنے آیا۔ ان مباحث میں تاریخی تفہیم کی ممکنہ گہرائی، معروضیت اور سکالرز کے اپنائے گئے طریق کار کو نئے تناظر میں سامنے لایا گیا۔ تاریخ نگاری میں علمی پیشہ ورانہ مہارت اور تاریخی سچائی کے دعوے کا آپس میں جو بہت گہرا تعلق ہے، اسے تلاش کرنے کی کوشش کی گئی۔ مؤرخ کو اب متون کو نئے سرے سے اور قریب سے دیکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی، تاکہ پوشیدہ معانی کو ظاہر کیا جاسکے۔ ثانوی و بنیادی ذرائع کی زبان میں ہونے والی تبدیلیوں سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے تاریخ نگاری کے اصول و ضوابط اور طریق کار کا از سر نو تجزیہ کیا گیا۔[1]

بیسویں صدی کے آخر میں رونما ہونے والی تبدیلیوں میں سے واضح تبدیلی یہ تھی کہ تاریخی علوم میں ادبی وسائل کا گہرا استعمال کیا گیا اور اس سلسلے میں معاصر ادبی علوم کے طریقے اور نظریات مستعار لیے گئے۔ دراصل نظریات ایسے بیانات ہوتے ہیں جو پیچیدہ طریقے سے ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں اور ان میں اعلیٰ درجے کی

عمومیت پائی جاتی ہے۔بلاشبہ تمام علوم(خواہ وہ ادبی ہوں یا سماجی و ثقافتی) میں نظریات سائنسی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، کیوں کہ سائنسی علم بذاتِ خود نظریاتی صلاحیت کا حامل ہوتا ہے، لیکن قدیمی دور میں جب بھی ثقافتی مطالعات میں نظریہ سازی کی کوشش کی گئی تو تاریخی علوم میں یہ عمل ناممکن تصور کیا گیا۔تاریخی علوم کے ماہرین نے روایتی تاریخ نگاری کے ڈھانچے اور تحقیقی کاموں کے بارے میں قائم کردہ خیالات پر نظرثانی کرنے پر زور دیا۔[۲] تاریخ اور ادب کا اشتراک مان لینے کے بعد مؤرخین کے لیے سائنس اور تاریخ کا تعلق پریشانی کا باعث بنا رہا۔در حقیقت فطری سائنس اور تاریخ میں بنیادی فرق موجود ہے۔روایتی تاریخی مطالعات نے حقائق کی صداقت اور سائنسی معروضیت برقرار رکھنے کا دعویٰ تو کیا ہے، لیکن ہم یہ کیسے نظرانداز کر سکتے ہیں کہ مؤرخین جب واقعات بیان کرتے ہیں تو واقعات کا بیان "بیانیہ" (Narration) کے اصولوں کی پیروی کرتا ہے اور یہ اصول و ضوابط سائنسی طریق کار سے مختلف ہیں۔یہی وجہ ہے کہ تاریخ نگاری سائنسی علوم کی بجائے ادب کے زیادہ نزدیک محسوس ہوتی ہے، کیوں کہ "بیان" معنی پیدا کرنے کا لسانی طریقہ ہے۔سائنسی معنوں میں حقائق کی معروضیت کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے جب کہ تاریخی واقعات کے بیان میں یہ مکمل طور پر ممکن نہیں، کیوں کہ یہ بیانات شخصی خصوصیات پر زور دیتے ہیں اور واقعات کی موضوعی وضاحت کے بھی متقاضی ہوتے ہیں۔[۳]

اس سلسلے میں ڈاکٹر مبارک علی تاریخ نگاری کے لیے تین عناصر اہم سمجھتے ہیں۔" اوّل واقعات، دوم اِن واقعات کو جانچنے پرکھنے کی شہادت اور سوم اِن واقعات کے بارے میں مورخ کی تنقید، تفسیر یا تاویل"[۴]، کیوں کہ محض واقعات کو سنہ وار بیان کرنے سے تاریخ کی اہمیت واضح نہیں ہوتی اور نہ ہی اِس سے تاریخی شعور پیدا ہوتا ہے۔

اس باب میں آقاﷺ کے تاریخی پہلوؤں کی جانچ، پرکھ کے لیے دو معاصر تاریخ دان جارن ریوزن (Jorn Rusen،۱۹۳۸ء)اور ڈیوڈ کار (David Carr،۱۹۴۰ء) کے تاریخی نظری مباحث کو پیمانے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ان مصنفین کے یہ نظری مباحث ان کی تصانیف بالترتیب *History : Narration, Interpretation, Orientation* اور *History , Fiction and Human Time: Historical imagination* میں بیان ہوئے ہیں۔ذیل میں ان تصانیف میں موجود نظریاتی مباحث کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے اور ان مباحث کی روشنی میں آقاﷺ کے تاریخی بیانیے کو مدِ نظر رکھ درج ذیل نکات کا تجزیہ کیا جا رہا ہے۔

۱۔ آقاﷺ میں تاریخی بیانیے کی نوعیت

۲۔ آقاﷺ میں معروضی حقائق کی موضوعی وضاحت

۳۔ آقاﷺ کے تاریخی بیانیے میں تخیل کی کارفرمائی

آقاﷺ میں تاریخی بیانیے کی نوعیت:

ریوزن کا خیال ہے کہ کسی بھی تاریخی علم کا گہرائی سے مطالعہ کرنے سے پہلے تاریخی بیانیے کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔ تاریخی بیانیہ، وقتی تجربے کی یاد کو متحرک کر کے کسی بھی دور میں عملی زندگی کو ایک خاص سمت دینے کا عمومی عمل ہے۔

ریوزن کے خیال میں تاریخی بیانیے کی اصل حقیقت درج ذیل تین خصوصیات میں مضمر ہے۔

۱۔ تاریخی بیانیے کا تعلق تاریخ نویس کی دماغی صلاحیت سے جڑا ہوتا ہے۔ یہ گزشتہ وقت کے تجربے کو متحرک کرتا ہے تاکہ موجودہ زمانے کا تجربہ قابلِ فہم ہو جائے اور مستقبل کی تلاش ممکن ہو سکے۔

۲۔ تاریخی واقعات کا بیان تسلسل کے تصور کے ذریعے زمانے کی ان تین جہتوں ؛ ماضی، حال، مستقبل، کے اندرونی اتحاد کو منظم کرتا ہے۔ یہ وقت کے تجربے کو انسانی ارادوں اور توقعات سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ ایسا کرنے سے ماضی کا تجربہ موجودہ زندگی کے حسبِ حال ہو جاتا ہے۔

۳۔ بیان کی روانی ایسی ہو کہ اس کی مدد سے قاری یا سامع اپنی اور اپنے ارد گرد کی دنیا کی وقتی تبدیلی سے ہم آہنگ ہو سکیں۔[۵]

ان تین خصوصیات کے ذریعے تاریخی حکایات عملی زندگی کی جانچ پرکھ کو وقت کے ساتھ ساتھ ایک ایسی واقفیت فراہم کرتی ہیں، جس کے بغیر انسانوں کے لیے اپنا راستہ تلاش کرنا بظاہر ناممکن نظر آتا ہے۔

دراصل تاریخی شعور موجودہ زندگی کے اصل حالات کو ایک مخصوص سمت دینے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ موجودہ حقیقت کو سمجھنے کے لیے یہ ماضی کے حقائق سے کام لے کر مؤرخین کی مدد کرتا ہے۔ اس کے بغیر حقائق کے اسباب و علل کی وضاحت بے سود ہو گی۔

تاریخی شعور ایک کلیدی عنصر کے طور پر کام کرتا ہے جو انسان کو موجودہ زمانے کا عملی تصور دیتا ہے۔ یہ تصور انسانی سرگرمی کی رہنمائی کرنے والے ارادوں میں اہم حیثیت کے طور پر موجود ہوتا ہے۔ ہمارے سامنے ماضی کو تجربے کے آئینے کی حیثیت سے پیش کرتا ہے، جس میں موجودہ زندگی کی عکاسی ہوتی ہے اور اس کی دنیاوی خصوصیات کا انکشاف ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تاریخ ماضی کی حقیقت کی آئینہ دار ہے، جس کی مدد سے ہم موجودہ زمانے کو صحیح طور پر سمجھنے کے ساتھ ساتھ مستقبل کے بارے میں بھی قیاس آرائی کر سکتے ہیں۔

ریوزن اس بات کے قائل ہیں کہ تاریخی شعور تصوراتی ہونا چاہیے، جس کو انسانی ذہانت کے عمل کے طور پر اس طرح سے تشکیل دیا جائے کہ موجودہ حقیقت کو سمجھ داری سے پیش کرے اور مستقبل کے بارے میں کسی نقطہ نظر

کو تیار کرنے کے قابل ہو۔ تاریخی شعور چونکہ ماضی کے تجربے سے متعلق ہے، اس لیے اس کی وجہ سے ہمیں زمانے کی ان عارضی تبدیلیوں کا پتا چلتا ہے جن سے ہماری زندگیاں دوچار ہوتی ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ ماضی، حال اور مستقبل میں ایک معنی خیز جوڑ ہے۔

تاریخی بیانیے کے عمل کو سمجھنے کے لیے ریوزن نے اپنی تصنیف میں اس کی چار اقسام گنوائی ہیں۔

۱۔ روایتی بیانیہ

۲۔ مثالی بیانیہ

۳۔ تنقیدی بیانیہ

۴۔ جینیاتی بیانیہ

ان اقسام کو ایک جدول کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے۔[۲]

تاریخی بیانیے کی اقسام

	یاداشت	**تسلسل**	**شناخت**	**وقت کی حیثیت**
روایتی بیانیہ	موجودہ روایات کی قدیم شروعات	قدیم روایات کا استعمال	دیے گئے تہذیبی زاویوں کی تصدیق	وقت کی جاودانی حیثیت
مثالی بیانیہ	عمومی قوانین کو بیان کرتی مثالیں	مختلف نظامِ زندگی کی زمانی تصدیق	قوانین کے عمومی زمانی تجربات	وقت کی تکوینی توسیع
تنقیدی بیانیہ	موجودہ زندگی کے مسائل سے روگردانی	مجوزہ خیالات میں تبدیلی	شناخت کے موجودہ زاویوں کی نفی	وقت کی منصفانہ حیثیت
جینیاتی بیانیہ	زندگی کے ارتقا کا سفر	زندگی کے استقلال کے لیے ترقی	خود شناسی کے عمل کے لیے پائیداری اور تبدیلی کی ہم آہنگی	وقت کی زمانی حیثیت

ذیل میں ان اقسام پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی اور یہ دیکھا جائے گا کہ آقاﷺ کتاب کے مصنف نے اپنے بیانیے میں ان اقسام کو کہاں کہاں اور کس انداز سے برتا ہے۔

ا۔روایتی بیانیہ:

انسانی زندگی کے ہر شعبے کو روایات نے متاثر کیا ہے۔روایات کو بالکل رد کرنا ممکن نہیں، ورنہ معاشرہ اپنی بنیادیں کھودے گا۔اس ضمن میں روایتی بیانیہ، روایات کو انسانوں کے لیے مشعلِ راہ قرار دیتا ہے، کیوں کہ روایات عملی زندگی کی سمت متعین کرنے کے لیے ناگزیر عنصر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ان کا انکار معاشرتی بگاڑ کی طرف لے جاتا ہے۔مؤرخین کا تاریخی شعور ان روایات کو زندہ رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔جب تاریخی شعور ہمیں روایات سے آگاہ کرتا ہے تو یہ ہمیں فرائض کی ابتدا(Origins)اور تکرار کی یاد دلاتا ہے۔یہ ماضی کے واقعات کی شکل میں ٹھوس اور حقیقی صداقت کو ظاہر کرتا ہے۔روایتی بیانیے کی دوسری مثالیں وہ نجی کہانیاں بھی ہو سکتی ہیں جو افراد ایک دوسرے کو سناتے ہیں۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ روایات تاریخی شناخت کی وضاحت کرتی ہیں۔خود انحصاری اور خود شناسی کے پہلے سے طے شدہ ثقافتی نمونوں کی توثیق کرتی ہیں اور شناخت کی تشکیل کو ایک عمل کی صورت میں ظاہر کرتی ہیں۔اخلاقی اقدار کے لیے بھی روایات کی اہمیت واضح ہے۔روایتی تاریخی رجحانات، اخلاقیات کو بھی روایت کے طور پر بیان کرتے ہیں۔[۷]

روایتی بیانیے کو اگر سیرت نگاری کے تناظر میں سمجھا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ سیرۃ النبی ﷺ کے پہلے مصنف ابن اسحٰق کی روایاتِ سیرت اور ان کے طریق تحقیق کی بعد میں آنے والے سیرت نگاروں نے پیروی کی ہے۔ان کا طریقہ یہ تھا کہ ہر واقعے کو کم از کم ایک مستند راوی سے نقل کیا ہے۔اسی طریق کے تسلسل کو بعد میں آنے والے تمام مصنفینِ سیرت نے برقرار رکھا ہے۔اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس روایت کی شناخت یہ ہے کہ کم از کم ایک مستند راوی سے سیرت کے ہر واقعے کو بیان کیا جائے۔روایتی بیانیے کی یہ روایت مستقبل کے سیرت نگاروں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ آقاﷺ کے مصنف نے بھی سیرت کی روایات کو من و عن ہم تک پہنچایا ہے۔اگرچہ واقعاتِ سیرت کی روایات کو مصنف نے اپنے انداز سے بیان کیا ہے، لیکن جہاں انہوں نے ضروری سمجھا، مختلف کتبِ سیرت یا احادیث کی کتب سے اپنی بات کی توثیق کے لیے اقتباسات بھی نقل کیے ہیں۔

بنو ہاشم کو شعبِ ابی طالب میں محصور کرنے کے حوالے سے قریش نے آپس میں جو عہد کیا تھا، اس عہد نامہ کو دیمک نے چاٹ لیا، تو اس کے بعد حضرت ابو طالب نے جو قصیدہ پڑھا، مصنف اس کے حوالے کے لیے سیرت کی ایک کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں:

خصائص کبریٰ میں ہے کہ سیدنا ابو طالب نے ایک قصیدہ بھی پڑھا جس کا ایک شعر تھا۔
الم یاتکم ان الصحیفہ مذقت
و ان کل مالم یرضہ اللہ یفسد
"کیا تو نہیں جانتا کہ وہ عہد نامہ چاک ہو گیا۔

اور جس شے سے اللہ راضی نہیں ہوتا وہ برباد ہو جاتی ہے۔" (خصائص کبریٰ، جلد ۱، ص ۱۵۱)[۸]

منافقوں کا سرغنہ عبداللہ بن ابی سلول کو قریش نے ایک خط لکھا۔ خط کے متن کے لیے مصنف نے سنن ابی داؤد کا حوالہ دیا۔[۹] ابو جہل کو دو بچوں معوذ اور معاذ نے واصلِ جہنم کیا۔ مصنف ان کے ذکر پر بخاری کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں: "بخاری کی روایت میں معوذ اور معاذ کو ابو جہل کو مارنے والے لکھا گیا ہے۔"[۱۰] ام المومنین حضرت سودہ رضی اللہ عنہ اور ان کے پہلے مرحوم شوہر کے بھائی سہیل بن عمرو کی باہمی گفتگو بیان کرنے کے لیے مصنف نے سیرۃ ابن ہشام کا حوالہ دیا۔ لکھتے ہیں:

> سہیل بن عمرو، ام المومنین سیدہ سودہ کے پہلے مرحوم خاوند کے بھائی تھے۔ ایک بار سیدہ سودہ کی نظر پڑی سہیل پہ کہ کیسے سر جھکائے، بندھے ہاتھوں سے گٹھڑی سی بنا بیٹھا ہوا ہے۔ بے ساختگی میں بولیں: "تم نے عورتوں کی طرح مشکیں کسوالیں، لیکن یہ نہ ہو سکا کہ لڑ کے مر ہی جاتے۔"
> آقا ﷺ قریب ہی تشریف فرما تھے۔ فرمایا: "سودہ، میرے مقابلے پہ اشتعال پھیلا رہی ہو۔"
> سیدہ سودہ سہم گئیں اور معذرت چاہی کہ بے اختیار منہ سے نکل گیا۔ (سیرۃ ابن ہشام)[۱۱]

غزوہ احد میں حضور پاک ﷺ کی حفاظت کرتے ہوئے حضرت قتادہ بن نعمان کی آنکھ تیر لگنے کے باعث باہر آگئی۔ اس واقعے کے لیے مصنف نے مختلف کتبِ سیرت کے حوالے دیے۔ لکھتے ہیں:

> قتادہ بن النعمان آقا ﷺ پہ شدید حملے کے وقت چہرہ پر نور کے آگے کھڑے ہو گئے اور اپنا چہرہ دشمنوں کے آگے کر دیا۔ ایک تیر آ کر سیدھا ان کی آنکھ پہ لگا۔ آنکھ کے نیچے چبھا کہ آنکھ گیند کی طرح اچھل کے ان کے ہاتھ میں آگئی۔ آقا ﷺ دیکھ کے آب دیدہ ہو گئے۔ دعا فرمائی۔ اللہ جس طرح تیرے نبی کے چہرے کی اس نے حفاظت فرمائی۔ اسی طرح اس کے چہرے کی حفاظت فرما۔ پھر اس آنکھ کو اسی مقام پہ رکھ دیا۔ اسی وقت وہ آنکھ صحیح و سالم ہو گئی۔ پہلے سے کہیں زیادہ روشن، آب دار اور خوش نما، نظر بھی تیز ہو گئی۔ (زرقانی، البدایہ والنہایہ، ابن ہشام، خصائص کبریٰ)[۱۲]

حضرت حمزہ رضی اللہ کی شہادت کے بعد آپ کے لقب کے بارے میں بتاتے ہوئے ابن ہشام اور مستدرک حاکم کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> آسمان سے جبرائیل علیہ السلام نے آ کر کہا ہے کہ ساتویں آسمان پہ سیدنا حمزہ کا لقب لکھا جا چکا ہے۔
> "اسداللہ و اسد رسول "
> "اللہ اور اللہ کے رسول کے شیر" (ابن ہشام)
> آقا ﷺ اس دن اتنا روئے کہ ہچکی بندھ گئی۔ پھر فرمایا:
> "قیامت کے روز اللہ کے ہاں حمزہ تمام شہیدوں کے سردار ہوں گے۔ (مستدرک حاکم)[۱۳]

جنگوں کا ذکر کیا تو ساتھ ہی یہ واضح کر دیا کہ مسلمانوں کی موت کوئی عام موت نہیں ہے، بلکہ شہادت کی موت ہے ۔ابدال بیلا نے آقاﷺ میں بہت سی جگہوں پر اخلاقیات کو روایت کے طور پر بھی بیان کیا ہے۔ مصنف نے جب عرب میں مسلمانوں اور قریش کی جنگوں کا ذکر کیا تو ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا کہ مسلمانوں کی موت کوئی عام موت نہیں ہے، بلکہ شہادت کی موت ہے، جو انہیں زندہ جاوید بناتی ہے۔اس کے ساتھ ہی مصنف قاری کو اس دنیا کے عارضی ہونے اور ہر عمل کا آخرت میں حساب دینے پر آمادہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> انہیں علم ہو گیا تھا کہ اس زندگی کا سفر سارا ایک رخ ہے۔ادھر آ گئے ہیں تو اب صرف آگے جانا ہے۔اگلے جہان میں۔ جہاں پوچھ گچھ ہو گی۔ جو جو سانس لیا، اس کا حساب ہو گا۔ کیا کمایا، کیا کھایا۔ کہاں زندگی بھر کی متاع لوٹائی۔سب بتانا پڑے گا۔انہیں زندگی کے سب راز آقاﷺ نے قرآن کے وسیلے سے بتا دیے۔اپنی زندگی کے برتاؤ سے سمجھا دیے۔ان کے لیے زندگی، آنے والی ابدی زندگی کا ایک مختصر سا پڑاؤ بن کے رہ گئی۔ایسی کھیتی، جس کے بیج تو ادھر ڈالنے پڑتے ہیں، پھل پھول ادھر سے آنکھ بند کر کے نظر آتے ہیں، ملتے ہیں۔ یہاں سے آبرومند اور کامیاب جانے کی کنجی اعلیٰ مقصد اور عظیم نصب العین میں ہے۔وہ ہے خدا کے بتائے اور آقاﷺ کے سمجھائے رستے پہ چلنا۔ چلتے رہنا۔[۱۴]

پہلی وحی کی روایت بیان کی تو ساتھ ہی جتلا دیا کہ اعلیٰ اقدار کا فروغ ہی دینِ اسلام کا اولین مقصد ہے۔ لکھتے ہیں:

> کہنے کو دین کی سمجھ نہ رکھنے والے کم عقل چاہے انہیں دنیاوی قدریں اور انسانی معاشرے کے باہمی معاملات کہہ کے اپنی آنکھیں بند کیے رکھیں۔ان ہی اعلیٰ قدروں کے فروغ کے لیے ہی یہ سلامتی کا دین آیا تھا۔ جس کا نام خدا نے اسلام رکھا۔[۱۵]

بنو حنیفہ کے سردار ثمامہ بن اثال کو رہزن سمجھ کر مسلمانوں نے مسجد نبویﷺ کے ستون سے باندھ دیا۔ تین دن کے بعد آقاﷺ نے اسے آزاد کر دیا۔وہ تین دن تک حیرت سے سب کے معمولات دیکھتا رہا۔آقاﷺ کے حسنِ سلوک سے متاثر ہو کر اس نے اسلام قبول کر لیا۔ مصنف بظاہر تو مسلمانوں کے اس وقت کے ان معمولات کو بیان کر رہے ہیں، جن کا ثمامہ بن اثال نے مشاہدہ کیا تھا، لیکن در حقیقت وہ ہر دور میں آقاﷺ کے ماننے والوں کو اپنے معمولات درست کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ان کے معمولات اس کی نظر سے گزرے تھے۔
> شراب مسلمانوں میں حرام ہو چکی تھی۔
> باتیں نکھری نکھری، نہ کوئی کسی کی پیٹھ پیچھے برائی کہتا نہ منہ پہ قصیدہ۔

ہر کوئی سچ بولتا۔ غیبت کا مزہ کوئی نہ لیتا۔
فتنے فساد کی بات کوئی نہ کرتا۔
یہ کیسے لوگ ہیں۔
نہ کم تولتے ہیں۔
نہ ملاوٹ کرتے ہیں۔
دنیا کے کسی معاملے میں کھوٹ نہیں ملاتے۔
ایک اللہ کو معبود بناتے ہیں، اسی کی عبادت کرتے ہیں۔ [۱۶]

سیرت نگار کے لیے واقعات کا انتخاب بھی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ ہر سیرت نگار اپنی بصیرت اور ادراک سے حقائق کا انتخاب کرتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ آقاﷺ کے مصنف کے پیشِ نظر صرف سیرت کے واقعات بیان کرنا ہی نہیں، بلکہ آپ ﷺ کی تعلیمات سے ہر قاری کو روشناس کروانا بھی ان کا مقصد ہے۔ جنگِ موتہ کے لیے جانے والے سالار، حضرت زید رضی اللہ کو، جو ہدایات نبی پاک ﷺ نے دیں، مصنف ان کو اس انداز سے بیان کر رہے ہیں:

ہر حال میں تقویٰ اور پرہیز گاری کو ملحوظ رکھنا۔
اپنے ساتھیوں کی خیر خواہی کرنا۔
اللہ کی راہ میں کفر کرنے والوں سے جہاد کرنا
مگر دیکھو بد عہدی نہ کرنا۔
خیانت نہ کرنا۔
کسی بچے، عورت اور عمر رسیدہ اور تارک الدنیا کو نہ مارنا۔
کسی عبادت گاہ، گرجے میں نہ گھسیٹنا۔
کسی کھجور یا کوئی اور درخت نہ کاٹنا۔
کسی عمارت کو منہدم نہ کرنا۔ [۱۷]

۲۔ مثالی بیانیہ:

عملی زندگی میں کسی خاص سمت کے تعین کے لیے روایات اپنے عمومی طرز کی وجہ سے بیانیے کے لیے کافی نہیں سمجھی جاتیں، کیوں کہ وہ اپنے تجرباتی مواد میں محدود ہوتی ہیں، اور اصول و قواعد کے انضمام کا مطالبہ کرتی ہیں۔ یہ اصول وقت کے متنوع تجربات کا احاطہ کرتے ہیں۔ لہٰذا ان روایات کو اس تنوع سے تعلق کی ضرورت ہوتی ہے۔۔ اس مقصد کے لیے مثالی بیانیے کو بہتر استعمال کیا جا سکتا ہے، کیوں کہ وہ اس رشتے کو قائم کرتا ہے۔ مثالی بیانیے

میں ان تجریدی اصولوں کو خاص بنایا جاتا ہے اور ایسی کہانیاں سنائی جاتی ہیں جو کسی خاص معاملے میں قواعد و صداقت کو ظاہر کرتی ہیں۔ مثالی بیانیہ عام اصولوں پر عمل درآمد کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یہ واقعہ نگاری کی مدد سے اصول و قوانین کی اہمیت کو بہتر واضح کرتا ہے۔ اس کی مدد سے ایک عام قاری ماضی، حال اور مستقبل کے تسلسل اور بیانیے کی یاداشت اور شناخت سے بدرجہ اتم آگاہ رہتا ہے۔ ریوزن کے خیال میں مثالی بیانیہ ایک مشہور قدیم مقولے کی ترجمانی کرتا ہے۔

"History is the teacher of life"[۱۸]

ہم کہہ سکتے ہیں کہ مثالی بیانیے میں صرف روایات کا بیان ہی نہیں کیا جاتا بلکہ استدلال سے کام لیا جاتا ہے۔ اس قسم میں یہ پتا چلتا ہے کہ کیا عمل کرنا ہے اور کس سے باز رہنا ہے؟ یہاں تاریخی شعور ماضی کے تجربے سے معاملات کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، جو دنیاوی تبدیلی اور انسانی طرزِ عمل کے قواعد کی نمائندگی کرتا ہے۔ تاریخی فکر کے اس انداز میں وقت کے تجربے کے افق کو نمایاں طور پر بڑھایا گیا ہے۔[۱۹]

اس قسم میں تاریخی شناخت اور شعور کو تدبر کی شکل دی جاتی ہے اور خصوصی قواعد سے عام اصول اخذ کرنے اور انہیں دوسرے معاملات میں لاگو کرنے کو اہمیت دی جاتی ہے۔

آقاﷺ میں ہم دیکھتے ہیں کہ پوری تصنیف میں ابدال بیلا کا یہ انداز نمایاں ہے کہ وہ صرف روایات کے بیان پر ہی اکتفا نہیں کرتے، بلکہ جگہ جگہ عقلی استدلال سے کام لیتے ہیں۔ وہ اپنے تاریخی شعور سے مختلف روایات کے بیان کے بعد، ان روایات سے عام اصول اخذ کر لیتے ہیں اور اپنے تدبر سے ان اصولوں کو موجودہ حالات پر لاگو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہجرتِ مدینہ کے موقع پر آقاﷺ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ سے اونٹنی خریدی تو انہیں اس کی قیمت ادا کی۔ اس واقعے کے بیان کے بعد لکھتے ہیں:

> ہدیہ یا کوئی تحفہ آقاﷺ وصول کرنے سے ہچکچاتے نہ تھے، مگر اس وقت معاملہ سرکاری تھا۔ سرکاری ڈیوٹی میں کسی تحفے کی گنجائش نہ رکھنے کا اصول آقاﷺ نے دینا تھا، دے دیا۔[۲۰]

حضور اکرمﷺ نے جنگ بدر سے قبل ایک ریکی پارٹی مکہ اور طائف کے درمیان واقع ایک مقام "نخلہ" میں بھیجی۔ اس پارٹی کا امیر مقرر کرتے ہوئے آقاﷺ کے فرمان کو مصنف نے اس طرح بیان کیا:

> امیر بناتے سمے آقاﷺ نے کہا۔
> "آج میں تم میں سے ایک ایسے شخص کو امیر بناؤں گا جو تم میں سے سب سے زیادہ بھوک اور پیاس برداشت کرنے والا ہے۔ اصول طے کر دیا۔ لمبے جنگی یا معلوماتی مشن کے لیے ہر قائد کی تعیناتی کے لیے۔[۲۱]

حضرت عباس رضی اللہ آ قاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے مطابق مکہ میں ہی تھے۔ وہ آ قاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکہ کی خفیہ خبریں پہنچاتے تھے۔ان کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں کہ "خفیہ ایجنسی کی ڈیوٹی میں دشمنوں کو دوست بنائے رکھنے کی قیمت دینا پڑتی ہے۔انہیں کھلانا پڑتا ہے۔" [۲۲]

فتح مکہ میں مسلمانوں کی کامیابی کے ساتھ آ قاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عاجزی کا ذکر کیا تو ساتھ ہی دنیا کے فاتحین کو سنہری اصول یعنی عاجزی کا اشارہ بھی دیا۔"دنیا کے فاتحوں کے لیے اصول طے کر دیا۔ جتنی بڑی فتح اور کامیابی، اتنا زیادہ جھکو۔" [۲۳] جنگ بدر میں آ قاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اصحاب سے مشاورت کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ "ایک اصول اور طے ہو گیا۔"سپہ سالار کو بھی مشورہ دیا جا سکتا ہے اور سپہ سالار صحیح مشورے کو مانے۔" [۲۴] آ قاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جنگی حکمتِ عملی کے بعد لکھتے ہیں کہ "اصول ایک اور طے ہو گیا کہ واپسی کی راہ ہمیشہ رکھی جائے۔" [۲۵]

مصنف بعض مقامات پر ماضی کے حقائق کے ذریعے حال اور مستقبل کے لیے رہنمائی لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔چودہ سو سال پہلے والا اسلامی خانگی کلچر کا احوال بتا کر افسوس کرتے ہیں کہ یہ پہلو برصغیر میں نہیں آیا۔وہ مشورہ دینے والے انداز میں کہتے ہیں:

> عرب مسلمان معاشرے کو دیکھ کے ہمیں ان کے ملبوسات، پہناوے، کھانے اور گیت اپنانے سے کہیں زیادہ ان کی زندگی کے یہ خانگی امور اپنانے چاہییں۔ پھر دیکھیں ہمارے معاشرے میں کوئی بے سہارا، مجبور اکیلی عورت نہ رہے گی۔ [۲۶]

اسلامی خانگی امور کو اپنانے کے فوائد گنواتے ہوئے کہتے ہیں:

> معاشرہ مجموعی طور پر ہر لحاظ سے صحت مند، بلند آبرو اور خوش خصال ہو گا۔ بس اک حسد، جلن اور رشک کی جگہ باہمی اخوت، رواداری اور بانٹ کے کھانے کے سنہرے اصول اپنانے ہوں گے۔۔۔۔۔۔ [۲۷]

ماضی کی روایات سے سبق حاصل کر کے مثال کے انداز میں قارئین کے سامنے پیش کرنے کے بعد ہمت بندھاتے ہوئے، قاری کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے سمجھانے کے انداز میں کہتے ہیں:

> یہ زیادہ مشکل کام نہیں، سوچ بدلنے کی بات ہے۔ کلچر سیکھنے والی چیز ہے۔ سیکھا جا سکتا ہے۔ سکھایا جا سکتا ہے۔اپنایا جا سکتا ہے۔ یہ جین میں ٹرانسفر نہیں ہو سکتا۔رسم ورواج سے بنتا ہے۔ رائج ہونے سے راسخ ہوتا ہے۔۔۔۔آ قاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیشہ ان دو راستوں میں وہ راستہ چنا، جو آسان تھا اور آسانیاں بانٹنے والا۔یہی ہمارا اصول ہونا چاہیے۔اگر ہم آ قاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔ [۲۸]

جنگ بدر سے پہلے حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینے کے اطراف میں معلوماتی گشتی پارٹیاں بھیجتے تھے تا کہ ارد گرد

کے قبائل کی صورتِ حال سے آگاہی ہوتی رہے۔ مصنف آپ ﷺ کے اس عمل کی توجیہہ بیان کرتے ہیں کہ اس کا مقصد مسلمانوں کی حیثیت اور حاکمیت کی حدود طے کرنا تھا۔ اس دور کی جنگی حکمتِ عملی کو موجودہ دور پر لاگو کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> یہی آج بھی جنگی لاجسٹک ہے۔ ان دنوں بھی یہی حال تھا۔ ہمارے دشمن کیوں ہمارے آج تک پیچھے پڑے ہیں؟ کیوں ہمیں وہ سڑکیں، جدید ریلوے، ڈیم اور بڑے کارخانے نہیں لگانے دیتے۔ کیوں ہمارے ہی چند چنے ہوئے بکاؤ لوگ وہ ہر دور میں خرید لیتے ہیں، جن کا کام انتشار پھیلانا اور ترقی کی رفتار کو روکنا ہے۔ جیسے قریشِ مکہ نے مدینہ میں یہودیوں اور منافقین کے سردار عبداللہ بن ابی سلول کو خریدا ہوا تھا۔ بس یہ بکاؤ لوگ کچھ ٹکڑوں کی خاطر یا محض اپنی انا کی بگڑی بے ہودہ شکل کو کسی گمان میں پال کے مملکت میں ہر فلاحی کام کی راہ میں رکاوٹ بنے رہتے ہیں۔۔۔۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔[۲۹]

مندرجہ بالا بحث کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تاریخی عمل میں اس طرح سے آگے بڑھتے ہوئے اس طرح کا تاریخی شعور اخلاقی استدلال کے سلسلے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ تاریخ خود مختلف حالات پر مختلف اصولوں کے اطلاق کے ذریعے اخلاقی دلائل کی تعلیم دیتی ہے۔

۳۔ تنقیدی بیانیہ:

تنقیدی بیانیہ قدیم روایات، اصولوں اور قوانین کی نفی کرتا ہے روایتی بیانیے کو تبدیل کرتا ہے اور نئے طرز ہائے بیان کی راہ کھولتا ہے۔ تنقیدی بیانیہ ایسی پرانی طرزوں سے روگردانی کرتا ہے جن پر آج مختلف سوالات اٹھ رہے ہیں۔ اس لحاظ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تنقیدی بیانیے کے تسلسل کی فطرت عجیب ہے، کیوں کہ اس کا حال ماضی کی نفی پر استوار کیا گیا ہے۔ تنقیدی بیانیہ رد شدہ روایات کا امین ہے۔ اس قسم کی فیصلہ کن دلیل یہ ہے کہ تاریخ کی روایت کے سلسلے میں ہم اس کے "پابند معیار" کے مطابق کوئی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے، ہمارے نزدیک یہ ایک قدیم کہانی ہی ہوتی ہے جس کی موجودہ عمل اور حقیقت سے کوئی مطابقت نہیں ہوتی۔ اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ روایت کا سرے سے ہی انکار کر دیا جائے، اگر روایت قبول کرنے سے انکار کرنا ہو تو مؤرخین کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کی ایک نئی تشریح پیش کریں، جو تاریخی استدلال کے ذریعے روایت کو رد کرے۔ صرف یہ کہہ دینا تو بہت آسان ہے کہ "روایت غلط ہے"، لیکن اس کو ثابت کرنے کے لیے ثبوت اکٹھے کرنا ضروری ہیں۔ اس کے لیے تنقیدی تاریخی دلائل سے کام لے کر، اس دلیل کو ثابت کرنے کی ضرورت ہے کہ مذکورہ روایت کی کوئی تاریخی حیثیت نہیں ہے۔

ریوزن اپنی تصنیف میں بیانیے کی اس قسم کے بارے میں بات کرتے ہوئے مؤرخین کو مشورہ دیتے ہوئے

کہتے ہیں کہ ردِ روایت کے لیے ایک نظریاتی تنقید تیار کی جا سکتی ہے، جس سے تاریخ کا رخ موڑا جا سکے۔ اس مقصد کے لیے تنقیدی بحث کے دوران مذکورہ روایت کی جگہ مختصراً "جوابی کہانی"(Counter Story) بیان کی جا سکتی ہے۔ ریوزن مزید کہتے ہیں کہ یہاں تاریخی شعور ماضی کے ایک خاص قسم کے تجربے کو ڈھونڈتا ہے اور متحرک کرتا ہے۔[۴۰]

اسی قسم کا تنقیدی تاریخی شعور آقاﷺ کے مصنف ابدال بیلا کے ہاں دیکھا جا سکتا ہے۔ جب وہ ایک یہودی شاعر کعب بن اشرف کے مسلمانوں کے ہاتھوں قتل کا واقعہ بیان کرتے ہیں تو ان کا بیانیہ یکدم روایتی سے تنقیدی ہو جاتا ہے۔ سارا واقعہ بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> کہانی تو اتنی ہی ہے۔ ہو سکتا ہے ایسا ہی ہوا ہو۔ مگر اس کہانی میں جو بات نا قابلِ یقین ہے، وہ یہ ہے کہ مارنے والے مسلمانوں نے کعب بن اشرف کو مارنے سے پہلے آقاﷺ سے اجازت لی تھی۔ یہ نا ممکن ہے۔ آقاﷺ نے کبھی بھی اپنے بد ترین دشمن کی یوں ٹارگٹ کلنگ نہیں کرائی۔ ابو جہل، ابو سفیان بن حرب کتنے شدید ترین دشمنوں کے نام لیتے جائیں، ان سب نے آقاﷺ کے قتل (نعوذ باللہ) کی بار بار سازشیں کیں۔ مگر زمانہ امن میں کسی بہانے، دھوکے یا گھر میں گھس کے آقاﷺ نے اپنے کسی گھٹیا ترین دشمن کے لیے بھی ایسا نہیں سوچا۔[۴۱]

اس طرح حضرت بی بی زینب سے آپﷺ کی شادی کا واقعہ بیان کرتے ہوئے سیرت نگاروں کی بیان کردہ روایات کی نفی کر کے دلائل دیتے ہوئے کہتے ہیں:

> شادی کا یہ واقعہ ۵ ہجری کا ہے۔ لوگوں نے خواہ مخواہ اس شادی کی حکمت کو سمجھے بغیر افسانہ بنا دیا۔ ہمارے اکثر سیرت نگار بھی اسی رو میں بہہ گئے اور دشمنانِ اسلام کو بلاوجہ خدا کے اس حسین فیصلے کو گرد آلود کرنے کا موقع دیا۔ یہ کہہ کے (نعوذ باللہ) آقاﷺ ایک بار زید کے گھر گئے اور سیدہ زینب کو دیکھ کے فریفتہ ہو گئے۔ آقاﷺ کی وہ سگی پھوپھی زاد تھی۔ سامنے پلی بڑھی تھی۔ پردے کا بھی پہلے تو کوئی قانون نہ تھا۔ اپنے ہاتھوں سے اپنے چہیتے غلام زید سے بہت چاہت سے بیاہا تھا۔ کیا پہلی بار سیدہ کو دیکھا تھا؟ پھر اٹھاون سال کی عمر میں آقاﷺ تھے۔ مکہ میں پچیس سال کی عمر میں ۴۰ سالہ بیوہ سیدہ خدیجہ سے ۲۵ سالہ سمبندھ کے دوران کوئی دوسری شادی نہ کی۔ آخری دم تک سیدہ خدیجہ کو محبت اور احترام سے یاد کیا اور تسلیم کیا کہ خدا نے ان سے بہتر انہیں کوئی بیوی عطا نہیں کی۔[۴۲]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کی ان کی شادی کے وقت کم عمری کے حوالے سے روایات پر سخت تنقید کرتے ہوئے اسے قدیم سیرت نگاروں کی انتہائی خوف ناک اور قابلِ اعتراض غلطی گردانتے ہیں۔ اس حوالے سے مصنف

مختلف روایات بیان بھی کرتے چلے جاتے ہیں اور ساتھ ساتھ خود کلامی کے انداز میں انہیں رد کر کے اپنا استدلال بھی پیش کرتے جاتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> صحیح بخاری میں سیدہ عائشہ کے ہی حوالے سے درج ہے کہ جب اسلام ہمارے گھر آیا تو مجھے پوری ہوش تھی۔ اب بچے کو چار یا پانچ سال کی عمر سے پہلے کہاں بات یاد رہتی ہے۔ اگر اس وقت عمر چار سال بھی لگائیں، تو مکہ کی تیرہ سالہ آقا ﷺ کی زندگی میں سیدہ عائشہ ۱۷ سال کی ہو گئیں۔ پانچ سال کی تھیں تو اس وقت عمر ہو گی ۱۸ سال۔۔۔۔۔۔ پھر کراس چیک میں پتا چلتا ہے کہ سیدہ عائشہ اپنی بڑی بہن اسما سے دس سال چھوٹی تھیں اور یہ بات بھی طے ہے، لکھی ہوئی ہے کہ ہجرت کے وقت سیدہ اسما ستائیس اٹھائیس سال کی تھیں۔ اب صرف وہ چند روایتیں رہ جاتی ہیں کہ سیدہ شادی کے بعد بھی کھلونوں سے کھیلتی تھیں۔۔۔۔۔ پھر جن معصوم اور شفاف دلوں میں اندر کا بچہ نہیں مرتا، وہ بچوں اور بچوں کے کھلونوں میں ہمیشہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ [۴۳]

تنقیدی بیانیے میں اس طرح کے دلائل روایات کی نفی کا اظہار کرتے ہیں۔ مصنف کا یہی تنقیدی شعور، قارئین کے لیے کردار سازی اور خود شناسی کے ذریعے نہ صرف خود کو جاننے کا موقع فراہم کرتا ہے، بلکہ ان کے تاریخی شعور کو جلا بخش کر روایت کی نفی سے ماضی کے حقائق کی پہچان کو بھی واضح کرتا ہے۔ مصنف کے تنقیدی دلائل، قاری کو بھی نئی سوچ کی راہ پر گامزن کرتے ہیں اور ان میں اپنی شناخت قائم کرنے کی روش پروان چڑھتی ہے۔

۴۔ جینیاتی بیانیہ:

اس قسم میں مؤرخین کا استدلال یہ ہوتا ہے کہ "وقت بدل چکا ہے۔" جس طرح روایتی یا مثالی اقسام میں روایات کی پاسداری کی جاتی ہے، یا پھر تنقیدی قسم میں ایسی روایات کی نفی کر کے ان کو نظر انداز کی جاتا ہے۔ اس کے برعکس بیانیے کی جینیاتی قسم میں روایت کو تو قبول کیا جاتا ہے، لیکن اس کو تشریح و تعبیر کے فریم ورک میں رکھا جاتا ہے۔

جینیاتی بیانیہ روایات کی نفی اور ان کے اثبات کی سرحد سے آگے، تبدیلی کی اصل اہمیت کو بیان کرتا ہے اور وقت کی رفتار کے ساتھ انسان اور معاشرے میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں کی طرف رہنمائی کرتا ہے، تاکہ قارئین وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ قدم ملا کے چل سکیں۔ جینیاتی بیانیہ تسلسل کو ترقی کی صورت میں دیکھتا ہے، جس میں زندگی کی تبدیلی ہی زندگی کے استحکام کی بنیاد ہے۔ [۴۴]

مصنف آقا ﷺ میں کچھ غیر مسلموں کے قتل کے واقعات بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ان کے قتل کے

پیچھے آقاﷺ کا حکم نہیں تھا، بلکہ سیرت کی کتب میں غلط بیانی کی گئی ہے۔ مصنف واقعات کے بیان کے بعد روایات کو مان تو لیتے ہیں، لیکن واقعے کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

> ان تینوں واقعات کے مطالعے سے اتنا ضرور پتا چلتا ہے کہ ایسے واقعات انفرادی طور پر کچھ مسلمانوں نے چھپ چھپا کے کیے ہوں گے یا کرنے کے خواہش مند ہوں گے۔ مگر ان میں سے کسی بھی واقعے پہ آقاﷺ کی رضامندی یا حکم یا شاباشی ناقابل یقین ہے۔ وہ آقاﷺ جنہوں نے اپنی ذاتی زندگی سے وابستہ بدترین دشمنوں کو بھی معاف کر دیا۔ وہ ایسے ایرے غیرے شاعروں کو یوں جھوٹ اور دھوکے سے کبھی نہیں مروا سکتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ آقاﷺ نے سوائے میدانِ جنگ کے کبھی نہ کسی کو مارنے کی اجازت دی نہ مارا۔[۳۵]

جس طرح موجودہ دور میں پرانے اصول و قواعد اپنا جواز کھو کر نئی طرز اختیار کرتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہمارا رویہ بھی ماضی سے تبدیل ہو جائے۔ یہ متحرک ارتقا کا عمل سمجھا جاتا ہے۔ اس قسم میں ماضی کے واقعات کو ماضی کا حصہ بننے دیتے ہیں، تاہم اس کے ساتھ ہی اسے ایک اور مستقبل عطا کرتے ہیں۔ یہ خود ہی تبدیلی ہے جو کہ تاریخ کو اس کے معنی دیتی ہے۔ یہ جدید تاریخی سوچ کی ایک قسم ہے جو ترقی کی ایک قسم کے طور پر تشکیل دی گئی ہے۔[۳۶]

ابدال بیلا بھی متحرک ارتقا کی اس قسم کے مطابق اپنی تصنیف آقاﷺ میں یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ:

> میری اہلِ خرد سے آقاﷺ کی شخصیت کے حسن رحمتہ اللعالمینی اور پوری زندگی کے موجود ریکارڈ کو ذہن میں رکھ کے دوبارہ اس پہ غور کرنے کی درخواست ہے۔ جس اصول "کامن سنس" اور قرآن کی بنا پہ جناب بخاری نے اپنی شروع میں جمع کی ہوئی چھ لاکھ حدیثوں میں سے صرف ۷۳۹۷ پہ اعتماد کیا، پھر ان کی بھی چھانٹی کر کے صرف ۲۶۰۲ احادیث کو صحیح قرار دیا، صرف اپنی عقل اور سوچ سمجھ کی بنیاد پہ، اس میں تھوڑا سا غور اب ہمیں بھی کرنے کی اجازت دی جائے۔ یہ میرے آقاﷺ کی حرمت کا سوال ہے۔ جو نہ جھوٹے تھے، نہ جھوٹ اور فریب کی سرپرستی کر سکتے تھے، کیوں کہ وہ صادق، امین اور رحمتہ اللعالمین تھے۔ یہی قرآن کہتا ہے اور قرآن یقیناً کسی بھی محدث اور تاریخ گو سے زیادہ سچا ہے۔[۳۷]

جنگ احد کا تفصیلی احوال اور اس جنگ کے نتائج بیان کرنے کے بعد قاری کو بھی متحرک ارتقا کے اس عمل میں شامل کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> اب خود فیصلہ کر لیں جیتا کون؟ ہارا کون؟ مگر ٹھہریں۔ ایک سال انتظار کریں۔ ابو سفیان کے اپنے چیلنج کا کہ اگلے سال پھر بدر میں معرکہ ہو گا۔ آقاﷺ نے فرمایا تھا: پکا وعدہ ان شاءاللہ۔ اس

چیلنج کا نتیجہ دیکھ کے جو جی میں آئے فیصلہ کیجیے گا۔[۳۸]

فتح مکہ کے بعد ہوازن اور طائف کے لوگوں نے مسلمانوں پر حملے کی ٹھانی تو آپ ﷺ بھی اپنے جان نثار ساتھیوں کے ساتھ مکہ سے باہر نکلے۔ تاریخ میں یہ پہلی بار تھا کہ مسلمان تعداد میں دشمن سے زیادہ تھے، لیکن وادی حنین سے گزرتے ہوئے دشمن نے اچانک تیروں کی بوچھاڑ کر دی۔ مسلمان وقتی طور پہ سنبھل نہ پائے اور ان میں بھگ دڑ مچ گئی۔ بعد میں نبی کریم ﷺ نے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو بھیج کے سب کو بلوایا اور ان میں دوباری صف بندی کروئی۔ مصنف اس واقعے کے بیان کے بعد کہتے ہیں:

> ہمارے انا کے مارے تاریخ دان لاکھ پردے ڈالیں، اللہ قرآن میں آقا ﷺ کی ساری ڈائری لکھتا رہا ہے۔ اللہ نے قرآن میں سچ اتار دیا:
>
> "اور بہت سے میدانوں میں اللہ نے تمہاری مدد کی اور حنین کے دن جب تم اپنی کثرت پر خوش ہوئے اور پھر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی اور تم پر زمین باوجود فراخی کے تنگ ہو گئی۔۔۔۔۔"
>
> اصل میں خدا نے سمجھانا یہ تھا کہ تم نہ کبھی پھر اپنی کثرت پہ گھمنڈ کرنا۔ تم تھوڑے ہو چاہے زیادہ ہو، جیتو گے اسی وقت جب صرف اللہ پہ بھروسہ کرو گے اور ثابت قدم رہو گے۔[۳۹]

مسلمان اس جنگ میں دشمن کی اچانک تیر اندازی سے خوف زدہ ہو کر بھاگے تھے، مصنف اس روایت کو مان تو رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ آئندہ کامیابی کے لیے یہ سبق بھی دیتے نظر آتے ہیں کہ اللہ پہ پختہ یقین ہی کامیابی کی اصل ضمانت ہے۔

مندرجہ بالا مباحث سے ایک عقلی سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ ان چاروں بیانیوں میں کیا قدر مشترک ہے؟ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اگرچہ یہ ایک دوسرے سے منفرد ہیں مگر یہ ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتے، بلکہ ان کا ایک باہم تعلقِ مسلسل ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخی عمل میں یہ چاروں بیانیے پائے جاتے ہیں جو باہم مل کر عملی زندگی کو وقت کے ساتھ تاریخی واقفیت فراہم کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ روایتی سے مثالی تک اور مثالی سے جینیاتی تک یہ بیانیے ایک عقلی جدت کا سفر طے کرتے ہیں۔ ہم ان عناصر کے مابین پیچیدہ تعلقات کی تشکیلِ نو کر سکتے ہیں تاکہ تاریخی شعور اور عقلی خصوصیات کی نشان دہی کی جا سکے۔

تاریخی بیانیے کی ان چاروں اقسام میں تاریخی شعور کی کارفرمائی کو مندرجہ ذیل جدول کی مدد سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔[۴۰]

تاریخی شعور کی چار اقسام

	روایتی	مثالی	تنقیدی	جینیاتی
وقت کا تجربہ	زندگی کی حقیقی صورت کا اعادہ	طرزِ عمل یا اخلاقی اقدار کے عمومی قواعد کی نمائندگی کرنا	زندگی کی حقیقی صورتوں اور اخلاقی اقدار کی مسئلہ سازی	زندگی کی اجنبی صورتوں کو باضابطہ صورتوں میں ڈھالنا
تاریخی اہمیت کے نمونے	وقتی تبدیلی میں حقیقی زندگی کا دوام	معاشرتی زندگی کے لازوال قواعد اور لازوال اقدار کی توثیق	تاریخی صداقت کا انکار کر کے ان کی اہمیت کا تجزیہ کرنا	ایسا ارتقا، جس میں زندگی کی مختلف صورتوں کا بدلاؤ، تاکہ ان کا استحکام برقرار رہے
بیرونی زندگی سے ہم آہنگی	معقول مشترکہ زندگی کی توثیق کے ذریعے پہلے سے جاری احکامات کی تصدیق	مخصوص حالات کو روزمرہ سے ملانا کہ کیا ہوا اور کیا ہونا چاہیے تھا	وضع کردہ فرائض سے اپنے نقطہ نظر کو الگ کرنا	مشترکہ ارتقا پذیر تناظر میں مختلف نقطہ نظر کی قبولیت
داخلی زندگی سے ہم آہنگی	پہلے سے وضع کردہ زندگی کی صورتوں کی حد بندی -کردار ادا کرنا-	عمومی اصول و ضوابط کی ذاتی خیال سے مطابقت عمومیت کے ذریعے کردار کی توثیق-	غیر جانب داری سے واجبات/فرائض کے انکار سے خود انحصاری --کردار کی تخلیق	ذاتی خیالات کا تغیر و تبدل (جو کہ دوام اور خود انحصاری کے لیے لازم و ملزوم ہے) کرداروں کے مابین توازن
اخلاقی اقدار سے وابستگی	اخلاقیات وضع کردہ فرائض کی پہلی ترجیح ہیں ؛ مستند اخلاقی جواز ا کے طور پر روایات کی پائیداری	اخلاقیات ، اقدار اور ویلیو سسٹم میں فرائض کی عمومی حیثیت کا درجہ رکھتی ہیں-	اقدار کی اخلاقی طاقت کو غلط ثابت کر کے توڑنا یا کمزور کرنا	اخلاقیات کا دنیاوی /وقتی ہونا-مزید ترقی کے امکانات ، اخلاقیات کی بنیادی شرط بن جاتے ہیں

اخلاقی استدلال سے وابستگی	اقدار کی دلیل، ان کی موثر پیش کش ہے، جو اخلاقی سوالات کو قبول کرنے کے قابل بناتی ہے	تسلسل اور اصول و ضوابط کے لیے عمومیت سے دلائل	اخلاقی مباحث کی اہم حکمتِ عملی کے طور پر قدر و تنقید اور نظریہ تنقید کو قائم کرنا	وقتی تبدیلی، اخلاقی اقدار کے استناد کے لیے فیصلہ کن دلیل بن جاتی ہے

تاریخی واقعات کو بیان کرنا در اصل ذہنی عمل کا ایسا نظام ہے جو مؤرخین کے تاریخی شعور کی وضاحت کرتا ہے۔ مؤرخ اپنی ذہنی اہلیت کے مطابق ماضی تک رسائی حاصل کرتا ہے، یعنی کہ مؤرخ کا تاریخی شعور اس کی ذہنی استعداد پر منحصر ہے۔ وہ اسی سے کام لے کر ماضی کے واقعات کو بصیرت کی آنکھ سے دیکھتا اور بیان کرتا ہے اس طرح کی قابلیت کو اس کے شعور کی صلاحیت کے طور پر بیان کیا جا سکتا ہے۔

معروضی حقائق کی موضوعی وضاحت:

ریوزن کی تصنیف میں معروضی حقائق کی موضوعی وضاحت کا نظریہ بھی پیش کیا گیا ہے، کہ تاریخی حقائق کے بیان میں معروضی حقائق کی موضوعی وضاحت بھی کی جاتی ہے۔ لہٰذا تاریخی مطالعات میں یہ دیکھنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے کہ تاریخی حقائق کی موضوعی وضاحت کہاں کہاں اور کیوں کر کی گئی ہے؟ تاریخی علوم میں معروضی حقائق کی موضوعی وضاحت کے بارے میں کسی بھی حتمی رائے تک پہنچنے سے پہلے ضروری ہے کہ معروضیت کی اصطلاح سے واقفیت حاصل کی جائے۔ جارن ریوزن معروضیت کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> Objectivity is a criterion of validity which renders historical thinking and historiography plausible; that is, it is a certain form of a truth claim, closely related to the rationalization of historical thinking and its academic—not to say scientific—character. [۱۲]

بیانیہ اور معروضیت تاریخی علوم کی دو متضاد خصوصیات سمجھی جاتی ہیں۔ بیانیہ کا زمرہ (Category) تاریخی مطالعات کو ادب کے قریب لاتا ہے۔ اس میں تاریخ نگاری کے ادبی کردار، لسانی طریقہ کار اور اصولوں کا انکشاف کیا جاتا ہے۔ یہی اصول اور طریقے، تاریخی یاداشت کے ثقافتی طریقوں میں تاریخ کو ماضی کی با مقصد اور عقلی نمائندگی کے طور پر تشکیل دیتے ہیں۔ اس کے برعکس معروضیت ایک ایسا زمرہ ہے جو تحقیقی طریق کار کے ذریعے

حاصل ہونے والے خاص قسم کے تاریخی علم کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ تاریخی حقائق کے خود مختارانہ (Arbitrary) معنی کے حوالے سے مستحکم جواز پیش کرتا ہے۔ دراصل معروضیت تاریخی علوم کی عمومی صداقت ہے جو ماضی کے تجربے سے حاصل ہونے والے ادراک اور شعور پر مبنی ہوتی ہے۔ مابعد جدیدیت کے تنقیدی مباحث نے اس رویے کو لسانی طریقہ کار کو چھپانے، False Consciousness کی حیثیت سے تنقید کا نشانہ بنایا ہے، جو موجودہ دور کی ثقافتی زندگی کو ماضی کے حقائق کی روشنی میں پرکھتا ہے اور ذہنی تعمیر کے طور پر مخصوص نوعیت کی تاریخ تشکیل دیتا ہے۔ اس حوالے سے اگر دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ پرانے نظریات، مؤرخین اور قارئین کے تعلق پر زور دیتے تھے اور ایسے اخلاقی اصولوں پر مرتکز ہوتے تھے، جو ماضی کو حال کے لیے اہم بناتے تھے اور ماضی کی نمائندگی کو ایسے اخلاقی پیغام میں ڈھال دیتے تھے جو مخاطب افراد کو عملی انسانی زندگی کے اصولوں کو سمجھنے اور انہیں نبھانے کے قابل بناتے تھے۔ تاریخی مطالعات کے جدید مباحث نے اس اخلاقی رویے کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا اور مؤرخین اور ماضی کے تجربے کے درمیان تعلقات پر زور دیا۔ مؤرخین نے عقلی طریقہ کار کے ذریعے تاریخی تجربے کو ظاہر کرنے کے لیے پیشہ ورانہ افراد کی حیثیت سے اپنی قابلیت کو واضح کیا۔[۴۲] تاریخی سوچ کی اس نئی عکاسی نے روایتی معروضی رویے کو بنیادی نقصان پہنچایا۔ یہی وجہ ہے کہ پیشہ ور مورخین نے ہمیشہ تاریخی حقائق کی اپنے ادراک سے وضاحت کے بارے میں نمائندگی پر بے چینی محسوس کی ہے۔ (اسی طرح کی بے چینی کا ذکر گزشتہ باب میں سوانح نگاری کے حوالے سے بھی کیا جاچکا ہے۔) اگرچہ وہ اس مخصوص اصول کو کسی اور، ایسی چیز میں تبدیل کرنے سے قاصر رہے ہیں، جو ایک ہی وقت میں تاریخ کے بارے میں سائنسی نقطہ نظر، تاریخی سوچ اور ادراک کے طریقہ کار کی خصوصیت کے مطابق ہو۔[۴۳]

یہی وجہ ہے کہ تاریخی مطالعات کی موجودہ صورتِ حال غیر واضح اور مبہم ہو چکی ہے۔ تاریخی مطالعات میں ایک طرف تاریخی سوچ کے ایک اصول کے طور پر "بیانیہ" کا عمل دخل ہے، جو کہ تاریخی نمائندگی کرنے میں کسی بھی سائنسی معروضیت کو منطقی طور پر روکتی ہے۔ اس کے برعکس دوسری طرف پیشہ ورانہ مؤرخین کے ابھی بھی، ان کے دعوے کے مطابق ان کے قائم کردہ عقلی و تحقیقی طریقِ کار موجود ہیں، جن کی مدد سے وہ تحقیق اور تاریخ نگاری کے اپنے کام کو آگے بڑھا سکتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ صداقت ہمیشہ سے ہی تاریخ نگاری کا خاصہ رہی ہے۔ ابتدا میں تاریخی مطالعات کے روایتی بیانیے میں صداقت کو مؤرخین کے اخلاقی رویے کے طور پر تصور کیا گیا تھا۔ ماضی کی پیش کش میں غیر حقیقی یا افسانوی عناصر کے استعمال کو غیر ضروری سمجھا جاتا تھا۔ بنیادی طور پر تاریخ دانوں کی سادہ سی سوچ تھی کہ "ماضی کے بارے میں سچ بتانا ہے"، لیکن موجودہ دور میں میٹاہسٹری میں ماضی کو سمجھنے کے لیے اور اس علم کو انسانی زندگی کے حالیہ

اموراوراس کے مستقبل کے تناظر میں لاگو کرنے کے لیے رہنمااصول کے طور پر معروضی حقائق کی وضاحت کی حدود طے کی گئیں۔تاریخ چونکہ زندگی کے افق سے آگے کے تجربے کو جمع کر کے انسانی زندگی کے اصولوں کی تعلیم دیتی ہے ،اس لیے اس بات کی توثیق کی گئی کہ تاریخی نمائندگی کے بارے میں باقاعدہ فیصلہ سازی کی جائے۔عام زندگی کے اصولوں کے مطابق عملی زندگی کو ترتیب دینے کی اہلیت، جو جمع شدہ تجربے سے حاصل ہوئی تھی،تاریخ اس عملی اور اخلاقی تربیت کو منظم اور اخلاقی قابلیت کے ذریعے سامنے لانے یعنی آشکار کرنے کے قابل ہے۔ایک بیانیے کی صورت میں ماضی کا تجربہ بیان ہوتا ہے ، جس میں انسانی سرگرمیوں کے عام اصولوں کی شکل میں اہم پیغام موجود ہوتا ہے۔ریوزن کے خیال میں ماضی کے تجربے اور صداقت کے دعوے کو سمجھنے کی مثال قدیم بزرگوں کی دانائی سے دی جاسکتی ہے، کیوں کہ ان کی طویل عمروں کی وجہ سے ان کے اذہان میں ان کی زندگی کے بارے میں بہت سے تجربات شامل ہوتے ہیں۔وہ بزرگ اس بات کے اہل ہوتے ہیں کہ اپنے سماجی حلقوں کی موجودہ زندگی کے بارے میں کوئی خاص سمت متعین کرسکیں۔زندگی کو کوئی خاص سمت دینے کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کے تجربات کی روشنی میں عملی مسائل کو سمجھنااور ان کو نمٹانا۔معروضیت اس سے بالکل مختلف ہے۔ماضی کے تجربے سے تاریخی نمائندگی کاایک خاص تعلق ہے۔یہ تعلق بنیادی طور پر اصولوں کے ذریعے نہیں،بلکہ تحقیق کے عملی طریقے سے ترتیب دیا گیا ہے۔[۴۳]

تاریخ،وقت کی مختلف جہتوں(Dimension)میں اصل انسانی دنیاہی ہے۔ یہ دنیاکی پیش گوئی(Pre figuration)ہے جو مؤرخین کو ماضی کو بیانیے کی صورت میں پیش کرنے کے قابل بناتی ہے۔اس ساری گفتگو کے بعداس نتیجے پر پہنچا جاسکتا ہے کہ تاریخ دراصل انسانی دنیا کی ایک دنیاوی حقیقت ہے۔یہ مؤرخین کے حاصل کردہ ماضی کے تجربے اور وقتی تبدیلیوں کاایک اندرونی تعلق ہے۔مؤرخین کے لیے اپنی تاریخ نگاری میں انسانی دنیا کی اس قدیم تاریخی ساخت کی نمائندگی کرناانتہائی ضروری ہو گیا ہے،تاکہ وہ یہ بتانے کے قابل ہو سکیں کہ واقعتاًیہ تجربہ کیسارہا ہے؟

اس حقیقی تاریخ کاانکشاف ایک ایسے علمی طریقہ کار میں کیا جاتا ہے، جس کاادراک صرف پیشہ ورانہ محققین ہی کرسکتے ہیں۔ماضی میں ہونے والے واقعات اور تبدیلیوں کا وقتی تسلسل انسانی دنیا کے گہرے ڈھانچے کا مظہر ہے۔تاریخ کے نام سے یہ ڈھانچہ انسانی دنیا کی وقتی تبدیلی کی متحرک قوتوں کے ذریعے سامنے لایا جاتا ہے۔یہ وہ متحرک قوتیں ہیں جو تاریخ کی حقیقت کو نظریاتی طور پر تشکیل دیتی ہیں۔تاریخی تجربے میں واقع اس حقیقت کو ماضی کے منتخب واقعات(relicts)کے بیانیے میں تحقیقی طریقہ کار کے ذریعے ظاہر کیا جاسکتا ہے۔

تاریخ اور تاریخی تحقیق کی عقلیت کاایک دوسرے سے قریبی تعلق ہے۔یہ وقوفی عمل کی علمی پیش گوئی ہے۔معروضیت کے پروقار(Prestigious)دعوے کے ساتھ مؤرخین اپنے پیشے کو قوم کے پیشوا یا رہنما کی

حیثیت سے استعمال کر سکتے ہیں، کیوں کہ انسانی ذہن ماضی میں ہونے والے واقعات اور وقتی تبدیلیوں کی روشنی میں اصل حقیقت کا انکشاف کر سکتا ہے۔[۴۵]

دراصل تاریخ کا مطلب ہے کہ انسانی دنیا نظریاتی طور رذہنی قوتوں (نظریات) کے ذریعے تشکیل دی گئی ہے جو انسانی سرگرمیوں کے ارادے کے ذریعے کام کرتی ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ وہ ہی ذہنی قوت ہے جو اپنے ادراکی ذوق سے انسانی ذہن کو ماضی کی توجیہہ کی طرف اپنی بصیرت سے متحرک کرتی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ بذاتِ خود مؤرخین کے ذریعے بات کرتی ہے۔ تاریخ نگاری تاریخ کی داخلی حقیقت کی حیثیت سے انسانی زندگی کی ایک روایتی جامع صورت کی نمائندگی کرتی ہے۔ معروضیت کا بھی یہی مطلب ہے۔ معروضیت کی حتمی بنیاد ہمبلٹ کے ان الفاظ میں ہے۔

An original antecedent congruity between subject and object.[۴۶]

یعنی تاریخ کی اصل مطابقت معروضیت اور موضوعیت کے درمیان ہے۔

یہاں تاریخی معروضیت کے فلسفیانہ مضمرات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ یہ تحقیقی طریقہ کار اور قواعد وضوابط کے مطابق ماخذات کی وضاحت کے لیے واضح خطوط متعین کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی تاریخ کے تصور کو انسانی سرگرمیوں کے ذریعے تشکیل پانے والی انسانی دنیا کی وقتی اور دنیاوی تحریک کے طور پر بھی لاگو کرتا ہے۔ معروضی حقائق سے حاصل ہونے والا تاریخی علم ثقافتی رجحان کے طور پر بھی کام کر سکتا ہے۔ یہ ماضی کی وقتی تبدیلی کے تناظر میں لوگوں کی اجتماعی شناخت کے ساتھ ساتھ مستقبل کے نقطہ نظر کو جنم دیتا ہے۔

آقا ﷺ کی تاریخ نگاری میں بیانیے کا کردار:

تاریخ میں معروضی حقائق کے بیان میں موضوعاتی عناصر کی موجودگی کے بارے میں ہمیشہ سے متنازعہ مباحث ہوتے رہے ہیں۔ بہت سے مؤرخین اپنے علمی کام میں موضوعاتی وضاحت کی شمولیت سے آگاہ تھے، لیکن وہ اس شمولیت کو بیرونی اضافے کے طور پر نہیں، بلکہ خود اپنی تصنیف کے جزو یا عنصر کے طور پر، اس کے داخلی ڈھانچے کی حیثیت سے تسلیم کرتے تھے۔ انہوں نے موضوعی وضاحت میں مؤرخین کی شمولیت کو معروضیت کی مخالفت کے طور پر نہیں دیکھا، بلکہ اس کے برعکس تاریخی معروضیت کے طور پر ہی گردانا۔

معروضیت کے تصور میں خاص بات یہ ہے کہ تاریخی بیانیے صرف حقیقت کے عکاس ہوتے ہیں، جن میں مؤرخ انسانی ذہن کی علمی صلاحیتوں کو ایک مخصوص انداز میں استعمال کرتا ہے۔ وہ اپنے مؤقف کو عام کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا طریقہ ہے جس سے سیاسی سیاق وسباق میں متنازعہ مفادات کو جامع مفاد میں ضم کیا جا سکتا ہے۔ اس تناظر میں ماضی

میں انسانی دنیا کی تبدیلی مستقبل کی سمت کی نشان دہی کرتی ہے۔ ترقی کے اس جامع تناظر اور رجحان کی بصیرت یہ ہے کہ مؤرخین کو اقتدار کی جدوجہد سے تجاوز کرکے مشترکہ سمت متعین کرنے کے قابل بنائے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تاریخی ادراک دراصل ایک وقوفی عمل (Cognitive Procedure) ہے، جس کے دو پہلو ہیں۔

۱۔ معروضی پہلو، جو کہ ماضی کے تجربے سے متعلق ہے۔

۲۔ موضوعی پہلو، جو زندگی کے مسائل کی نشان دہی اور ان کے حل سے متعلق ہے۔[۶۲]

دونوں پہلو ہی وضاحت کے عملی کام میں حصہ لیتے ہیں۔ یہ وہ وضاحت ہے جس کے ذریعے ماضی کے تجرباتی شواہد کی ٹھوس معلومات اپنی مخصوص تاریخی خصوصیت کو حاصل کرتی ہیں اور تاریخی بیانیے کے ڈھانچے میں ضم ہو جاتی ہیں، جس کے اندر وہ ثقافتی رجحان کے ایک عامل کے طور پر کام کر سکتی ہیں۔ حقائق کی تعبیر و وضاحت اس بیانیے کی بناوٹ میں موضوعیت کا باعث بنتی ہے۔ دراصل معروضیت اور موضوعیت ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔

تاریخی وضاحت بنیادی طور پر بیانیہ کی پابند ہے۔ اسے عام طور پر معروضیت کی نفی کے طور پر سمجھا جاتا ہے۔ ریوزن کے مطابق اسے چار اصطلاحات کے تحت سمجھا جا سکتا ہے۔

۱۔ ماضی کی طرف مڑ کے دیکھنے کا عمل (Retrospectivity)

۲۔ جذباتی تناظر (Perspectivity)

۳۔ قوتِ انتخاب (Selectivity)

۴۔ خصوصیت/اختصاص (Particularity)

ذیل میں ان پر ترتیب وار تفصیل سے روشنی ڈالی جا رہی ہے، تاکہ یہ دیکھا جائے کہ کس طرح یہ چاروں اصطلاحات معروضیت کی نفی کرتی ہیں۔

۱۔ ماضی کی طرف مڑ کے دیکھنے کا عمل (Retrospectivity):

تاریخی علم کے حصول کی کاوش کو Retrospectivity کہا جاتا ہے۔ اسے وہ کھلا دروازہ کہا جا سکتا ہے، جس کے ذریعے غیر تجرباتی عناصر مثلاً شخصی مفادات، اصول واقدار، خواہشات اور خطرات وغیرہ تاریخی عمل میں ماضی اور حال کے مابین اس حد تک داخل ہو جاتے ہیں کہ اس کے وقوفی ڈھانچے کو بھی اپنے طریقہ کار کی عقلیت سے متاثر کرتے ہیں۔ مؤرخ کی ماضی کے تجربے کے ذریعے حقائق تک رسائی، اسے مستقبل کے تخمینوں تک لے جاتی ہے، جو ماضی کے تجربے کے افق کو عبور کرتی ہے۔

۲۔جذباتی تناظر(Perspectivity):

یہ ماضی اور حال کے مابین تعلقات سے متعلق ہے۔یہ تاریخ نگار کے زمانے کے علمی رجحانات کے مسائل کو تاریخی تناظر میں دیکھتی ہے۔یہ اپنے زمانے کی معاشرتی زندگی میں مؤرخین کے مؤقف پر منحصر ہوتی ہے۔

۳۔قوتِ انتخاب(Selectivity) :

مآخذ میں سے صرف خاص قسم کی معلومات تحقیق کے لیے متعلقہ ہو جاتی ہیں، جو حال کی واقفیت کے مسائل کے لیے ماضی کی معنویت اور اہمیت پر زور دیتی ہیں۔انتخاب کا معیار وہ اقدار ہیں جو ماضی کو معنوی شکل عطا کرتی ہیں۔[۴۸]

۴۔خصوصیت/اختصاص(Particularity) :

یہ ماضی کے تجرباتی شواہد کی وضاحت کے لیے حدود کی عکاسی کرتی ہے۔بنیادی طور پر یہ تاریخی علم کا تعلق تاریخی یاداشت کی شناختی تعمیر کے مقصد سے استوار کرتی ہے۔ماضی کے حقائق کی شناخت، چونکہ بنیادی طور پر خاص ہے، یہ ہر تاریخ نگار کے تاریخی علم میں ہمیشہ مختلف ہوتی ہے، کیوں کہ شناخت کی تشکیل کے تخلیقی آئینے کے طور پر تاریخی علم بھی ہمیشہ مخصوص ہوتا ہے۔اس لیے یہ ماضی کے حوالے سے نقطہ نظر میں کثریت(Plurality)کا مطالبہ کرتی ہے۔اس طرح یہ اصطلاح، واقعات کی شناخت کی کثریت، شناخت کی دیگر جہتوں اور عملی زندگی کے متعلقہ مفادات اور امتیازات سے مطابقت رکھتی ہے۔

درج بالا مباحث سے اس نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ ہر مورخ اپنے نقطہ نظر سے ہی ماضی کو دیکھتا اور پرکھتا ہے۔ اسی بنیاد پر وہ ماضی کے دستیاب حقائق میں سے مخصوص معلومات کا انتخاب کرتا ہے اور اپنے تاریخی عمل میں، ان منتخب معلومات کی اپنے انداز، فہم اور بصیرت سے وضاحت بھی کرتا چلا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اوپر بیان کی گئی ان چاروں خصوصیات کی وجہ سے تاریخی عمل، ثقافتی ڈسکورس کا ایسا حصہ بن جاتا ہے، جس کے ذریعے انسانی دنیا میں ثقافتی رجحان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور تاریخ، ماضی کی نمائندگی کے طور پر روزمرہ زندگی کا حصہ بننے کی صلاحیت اور اہلیت کو حاصل کرتی ہے، لیکن تاریخی معروضیت تاریخ اور زندگی کے ناگزیر انضمام کے مخالف کردار ادا کرتی ہے اور اس انضمام کے برعکس ظاہر ہوتی ہے۔[۴۹]

ان مباحث کے آقاﷺ پر اطلاق سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مصنف نے اپنی تصنیف میں واقعاتِ سیرت کو اپنے انداز سے بیان کیا ہے۔ ماضی کے تجربے سے حاصل ہونے والے اسباق و نتائج کو بھی انہوں نے اپنے فہم اور ادراک سے بیان کیا ہے۔ اس وضاحت میں ماضی کی معروضی معلومات نہ صرف اپنی مخصوص تاریخی خصوصیت کو

حاصل کرتی ہیں بلکہ یہ وضاحت تاریخی بیانیے کے ڈھانچے میں ضم ہو جاتی ہے۔ معروضی حقائق کی تعبیر و وضاحت ان کی تصنیف کے بیانیے کی بناوٹ میں موضوعیت کا باعث بنتی ہے۔ معروضی حقائق کے بیان میں موضوعی وضاحت کا یہ انداز ان کی پوری تصنیف پر حاوی ہے۔ عرب کی سرزمین میں یہودیوں کی معاشی، معاشرتی و اقتصادی حالت کی تصویر کھینچنے کے بعد اس وقت کے یہودیوں کی فطرت کی موجودہ دور کے یہودیوں سے مطابقت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> یہودیت کے پورے فلسفے کو ذرا غور سے پرکھا جائے تو اس میں عبادات تو بہت نظر آتی ہیں مگر ہر یہودی کے من اندر کا ٹکراؤ خدا کے پیغمبروں سے کہیں زیادہ خود خدائے برحق سے نظر آتا ہے۔ شاید انہوں نے تاریخ کے کسی تلخ موڑ پہ خود کو ایسے موڑ لیا کہ وہ خود خدا بن کے خدا کی خدائی کو اپنی مرضی سے ہانکنا چاہتے ہیں۔ وہ لوگ خود سری میں اتنے بڑھے ہوئے تھے اور ہیں کہ انہیں شاید خدا بھی خود سے کم تر اور چھوٹا لگتا ہے۔ شاید وہ چاہتے ہیں کہ زمانے بھر کے رازق اور مرضی جتانے والے صرف وہ خود ہوں۔ [۵۰]

آغازِ اذان کے واقعے کے بیان کے بعد اپنی طرف سے وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> خواب میں دیکھی گئی جلیل القدر ہستی جنہوں نے اذان بتائی، میرے خیال میں سیدنا ابنِ مریم علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہوں گے۔ جنہوں نے آقا ﷺ کے آنے کی بشارت دی تھی۔ انہوں نے ہی تمام انبیا علیہم السلام میں سے ایک بار پھر واپس آنا ہے اور کہنا ہے وہی جو اذان کا مغز ہے۔
>
> اشھد ان الاالہ اللہ
>
> اشھد ان محمد رسول اللہ [۵۱]

یہاں مصنف اپنی طرف سے واقعے کی وضاحت اپنی سوچ اور بصیرت سے کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ "یہ اس عاجز کا خیال ہے، کوئی مانے یا نہ مانے"۔ [۵۲]

آقا ﷺ کے دشمن عمیر بن وہب کے اسلام لانے کا واقعہ بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> ہے کوئی اور ایسی برادری، ایسا قبیلہ، کوئی قوم، کوئی مذہب، کوئی دین جس میں ایک کلمہ توحید پڑھنے سے قتل کے ارادے سے آیا ہوا دشمن آنِ واحد میں ایسا بدل جاتا ہے کہ پھر وہی ان کا پہرے دار بن جاتا ہے، جسے قتل کرنے کا ارادہ لے کر نکلا ہو اور دونوں بیچ سگے بھائیوں جیسا تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر آقا ﷺ اور غلام کا، جیسے ایک ہی جسم کی دو آنکھیں، ایک ہی بدن کے دو ہاتھ۔ کیمسٹری یوں بدلا کرتی ہے۔ ایک نظر سے۔ جس کے نصیب میں ہو۔ [۵۳]

جنگ بدر میں آقا ﷺ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ رضی اللہ کے قبیلے کا کوئی بھی فرد شامل نہ ہوا۔ مصنف اس بات کی توجیہہ میں لکھتے ہیں کہ "آقا ﷺ کا اپنی ماں سیدہ آمنہ کے قبیلے سے تصادم اللہ کو پسند نہ تھا شاید۔ ایک بھی

اس قبیلے کا فرد جنگ بدر میں نہ تھا۔" [۵۴]

بی بی فاطمہ سلام اللہ علیہا کے جہیز کے سامان کی فہرست بتاتے ہوئے اپنی طرف سے اس سامان کی توجیہہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

> آقا ﷺ کی طرف سے جہیز بھی ضروری تھا، ملا۔ کھجور کے کھردرے سے بان کی اک چارپائی۔ اوپر چمڑے کا بچھونا۔ ساتھ دو پتھر کی چکیاں۔ ایک اپنے لیے آٹا پیسنے کے لیے، دوسری اہلِ صفہ کی روٹی کے لیے۔ مٹی کا گھڑا ایک۔ ایک گدا جس میں کھجور کے چبھنے والے نوکیلے پتوں کو کوٹ کوٹ کے نرم کر کے بھرا گیا تھا۔ ساتھ کنویں سے پانی بھر کے لانے کے لیے ایک چمڑے کی مشک، کہ خاتونِ جنت کو یاد رہے کہ قیامت تک خدا کے رستوں پہ نکلنے والے، آقا ﷺ کے غلاموں کو پیاس کی شدت میں انہی کے در سے دو گھونٹ پانی ملتا ہے۔ یہ الگ بات کہ آقا ﷺ کے ہی بظاہر کلمہ گو اک دن سیدہ کی ساری اولاد کو دریا کنارے پیاسا باندھ کے مار دیں گے۔ [۵۵]

عرب کے خانگی اور عائلی نظام کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

> وہ نظام اتنا سیدھا سادہ اور بغیر کسی پیچیدگی کے ہے کہ وہاں گھروں میں کبھی غیر شادی شدہ بیوہ، مطلقہ یا کنواری نہیں بیٹھی۔ اس زمانے میں لڑکی والوں اور لڑکیوں کو اپنے اپنے نصیب پہ اعتبار ہوتا تھا۔ جب کوئی بلوغت کو لڑکی پہنچتی اس کی شادی کر دی جاتی۔ طلاق ہوتی بخوشی لے لی جاتی بلکہ اکثر تو مانگ لی جاتی اگر نہ بنتی ہو۔ یہ نہیں کہ سلگتی لکڑی کی طرح نہ جلنا، نہ بھڑکنا، نہ بجھنا۔ آج کل یہی ہے۔ نہ جینا نہ جینے دینا، بغض عناد، منافقت، دکھاوا، رسہ کشی، میں میں تو تو، اوپر سے مصنوعی مسکراہٹ، اندر سے میل ہی میل۔ [۵۶]

حضرت خبیب کو سولی دے کر چالیس دن تک ان کو سولی پر لٹکائے رکھا گیا۔ آقا ﷺ نے مدینے سے دور اصحاب کو ان کا جسدِ خاکی لانے کو بھیجا۔ راستے میں ایک مقام پر زمین شق ہوئی اور حضرت خبیب کا جسدِ خاکی اس میں سما گیا۔ اس مقام کی اہمیت واضح کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں کہ:

> یونہی تو نہیں، اتفاقاً ہزاروں سال پہلے، جب خدا نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور سیدنا اسماعیل علیہ السلام سے مکہ میں اپنا گھر بنوایا تو اسی لمحے جبرائیل علیہ السلام نے آکر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو مکہ کے احترام کی حدود کا تعین بھی کرا دیا۔ اسی میں ایک حد یہی جگہ تنعیم بھی تھی۔ یہ حد سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی مانگی ہوئی دعا سے محبت کرنے اور تعظیم کی حد دکھانے کی اک چھوٹی سی تمثیل تھی۔ خدا کے سامنے سارے زمانے ایک ساتھ پڑے ہوتے ہیں۔ ماضی، حال اور مستقبل۔ اس لمحے بھی خدا کا قلم یہ منظر اور وہ آخری کہے شہید پروانوں کے بول لکھ چکا تھا۔
>
> "الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ" [۵۷]

ہر واقعے کے بعد اپنی ذاتی رائے سے وضاحت کرنے کا انداز پوری تصنیف پر حاوی ہے۔ مظلوموں کی ہر ممکن مدد کرنے والے معاہدے "حلف الفضول" کو بیان کرنے کے بعد بحث کے انداز میں لکھتے ہیں کہ :

ہماری زبان اردو کے قدیم سرپنچوں نے نہ جانے کیوں فضل اور رحمت کی جمع فضول کو اپنی لغت میں بے کار اور لغو معنی دے کر رحمت اور برکات کا چہرہ بگاڑ دیا۔ یہ لسانی اور علمی غلطی ہے کہ فضل اور کریم کو ہم نے "فضول" کہہ کے رد کر دیا ہے۔ [۵۸]

واقعے کے بیان کے بعد لفظ "فضول" کے بارے میں اپنے ذہن میں امڈنے والی سوچ، صفحہ قرطاس پہ منتقل کرنے کے بعد اپنی بات کو پھر اسی معاہدے سے منسلک کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

حلف الفضول پہ قسمیں کھانے والے سب عظیم لوگ آج بھی ہر مظلوم کی داد رسی کے لیے پہنچنے کا حلف اٹھائے ہوئے ہیں۔ انہی میں آقا سید البشر ﷺ بھی ہیں جن کی عظمت اور رسائی پہ وقت کی کسی حد کی کوئی قید ہی نہیں۔ یہ حلف، یہ معاہدہ آج بھی قائم ہے۔ کیوں کہ سمندروں میں ابھی پانی ہے اور مکے کے وہ پہاڑ اسی آبرو اور تمکنت سے آج بھی کھڑے ہیں، جو اس معاہدے کے گواہ ہیں۔ اور اللہ بھی ان سب پہ شاہد ہے۔ کسی مظلوم کو شک ہو تو ایک بار آواز دے کر دیکھ لے۔ پکار لے آقا ﷺ کو۔ اس معاہدے کو یاد کرا کے۔ کوئی بھی ظالم ہو، کسی بھی گھمنڈ میں ہو، وہ اپنا انجام سوچ لے۔ ہر مظلوم، مقامی یا غیر مقامی کی ایک پکار کے فاصلے پہ آقا ﷺ کی مدد موجود ہے۔ کوئی مظلوم آزما لے۔ [۵۹]

قریش کی مکے میں حکمرانی کا ذکر کیا تو لفظ "قریش" کی وضاحت بھی کی، کہ کس طرح مکے میں یہ نام رائج ہوا۔ لکھتے ہیں :

قریش کا لفظ تقرش سے مشتق ہے۔ معنی اس کے ہیں بکھرنے کے بعد جمع ہونا۔ قصّی نے ان کو جمع کیا تو ان قبائل کا اجتماعی نام قریش ہو گیا۔ کہنے کو ان قبیلوں کے اپنے اپنے نام بھی رہے۔ تقرش کا لفظ صفاتی لحاظ سے کسب اور تجارت کے معنوں میں بھی آتا ہے۔۔۔۔ تقرش کے ایک معنی تلاش اور جستجو کرنے کے بھی ہیں۔۔۔۔ عربوں میں صحرائی قبائل دوسرے قبیلوں پہ اپنی فوقیت جتانے کے لیے کوئی بہانہ ضائع نہیں کرتے۔ ان کی ڈکشنری میں قریش قرش کی تفسیر بھی تھا۔ اور قرش ایک بڑی سمندری مچھلی کو کہتے ہیں جو چھوٹی مچھلیاں جاتی تھی۔ انہوں نے اپنے قریشی نام سے دوسرے قبائل کو یہ بھی جتا دیا کہ اب تم ہمارا لقمہ بنو ہی بنو۔ یہ تو ہوئیں وہ پانچ وجہیں قریش اصطلاح رائج ہونے کی، ایک چھٹی وجہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ کنانہ بن خزیمہ کے پوتے کا نام قرش تھا۔ اس کا قبیلہ بھی ان قبائل کی جتھہ بندی میں آ گیا۔ یوں یہ نام اور مستحکم ہو گیا۔ [۶۰]

عرب میں رواج تھا کہ وہ لوگ اپنے نومولود بچوں کو کسی صحت افزا مقام پر منتقل کر دیتے تھے۔ مصنف اس

کی وضاحت میں اس کی توجیہہ پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> عرب کے قبائلی خاندانی نظام میں ہر قبیلے اور خاندان کی مجبوری اور ضرورت تھی کہ وہ اپنے لوگوں کا دوسرے قبیلے کے لوگوں سے قریبی تعلق قائم کرے۔ یہ قائم کیا ہوا تعلق ہر قبیلے، خاندان اور فرد کے لیے اس نظام میں ایک اضافی تحفظ کا احساس دیتا۔ قبائل یا افراد کی آپسی چپکلش یا لڑائی کی صورت میں ایسا تعلق بہت کام آتا۔ وہ خون کے رشتے کے بعد جس رشتے کو اہمیت دیتے، وہ دودھ کا رشتہ ہوتا تھا۔ اس رشتے کی عزت اور توقیر نسل کے رشتوں جیسی ہوتی تھی۔ [۱۱]

غارِ ثور کا ذکر کیا تو اس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

> شہرِ مکہ سے ساڑھے چار کلو میٹر کے فاصلے پہ ۷۵۹ میٹر کی بلندی کا ایک پہاڑ ہے۔ جبلِ ثور۔ بلندی کے لحاظ سے مکہ کی دوسری طرف کے پہاڑ جبلِ نور سے بھی ۱۲۰ میٹر بلند۔ اس پہاڑ کی بلندی پہ بھی ایک غار ہے۔ اس وقت بھی وہ اتنی ہی تھی، جتنی آج ہے۔ دہانہ جس کا ایک گز چوڑا، دہانے کے الٹ میں آدھا گز کی درز۔ اندر بس اتنی جگہ کہ دو آدمی بمشکل پاؤں پھیلا کے لیٹ سکیں۔ غارِ حرا کی طرح یہ غارِ ثور بھی خدا کی طرف سے "ٹیلر میڈ" لگتی ہے۔ عین سائز پہ بنی۔ غارِ حرا کے اندر گنجائش ہی ایک کی۔ اور غارِ ثور میں جگہ صرف دو کی۔ [۱۲]

آقاﷺ کے تاریخی بیانیے میں تخیل کی کارفرمائی:

آقاﷺ کے تاریخی بیانیے میں تخیل کے عناصر کا تجزیہ، ڈیوڈ کار کے مباحث کی روشنی میں کیا جارہا ہے۔ انہوں نے اپنی تصنیف میں تاریخ نگاری میں تخیل کی کارفرمائی کے حوالے سے بحث کی ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ایک مورخ کی ذمہ داری ماضی کے بارے میں سچ بتانا ہے۔ یہی چیز تاریخ نگار کو افسانہ نگار سے ممتاز کرتی ہے، جو اس ذمہ داری سے مبرا ہوتا ہے۔ دراصل تاریخ کا تعلق ان واقعات سے ہوتا ہے جو ماضی میں وقوع پذیر ہو چکے ہوتے ہیں، جب کہ افسانے میں تصوراتی واقعات کی تصویر کشی ہوتی ہے، یعنی کہ وہ چیزیں جو کبھی بھی وقوع پذیر نہیں ہوئیں۔ چوں کہ افسانہ نگار بیانیے میں ماہر ہوتا ہے، اس لیے وہ حقیقی دنیا کی منظر کشی کا کوئی دکھاوا نہیں کرتا، لیکن جب بیانیے کو کسی خاص ضابطے کا پابند کیا جائے، جس کا مقصد حقیقت کی تصویر کشی کرنا ہو، تو وہ مشکوک ہو جاتا ہے۔ اگر تاریخ کی طرح اس کا واسطہ اس حقیقت سے ہو جو مزید موجود نہ ہو، جیسا کہ ماضی، تو اس پر شبہ دوگنا ہو جاتا ہے۔ تاریخ نگاروں پر تنقید کی جاتی ہے کہ انہوں نے واقعات کی اس طرح سے نمائندگی نہیں کی جیسا کہ وہ حقیقت میں وقوع پذیر ہوئے، بلکہ واقعات کو، ایک اچھی کہانی بنا کے، اس طرح سے پیش کیا، جیسا کہ انھیں ہونا چاہیے تھا۔ ایسا شاید اس لیے ہے کہ پہلے سے ہی یہ تصور کر لیا گیا ہے، کہ تاریخ جمالیاتی نہیں بلکہ سیاسی اور نظریاتی اصولوں

کی پاسداری کرتی ہے، لیکن اپنے بیانیے کی وجہ سے، تاریخ نگاروں کے اس صداقت کے دعوے کو، کہ وہ تخیل نہیں بلکہ حقیقت ہے، مکمل طور پر ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ڈیوڈ کار زور دیتے ہیں کہ تاریخ تخیل اور حقیقت کے مرکب کی حیثیت سے پہچانی جانی چاہیے۔[۶۳]

ڈیوڈ کار کا یہ نقطہ نظر فرانسیسی پس ساختیات سے منسلک ہے۔ وہ اپنی بات کی توثیق کے لیے رولینڈ بارتھیس(Roland Barthes)، جو کہ پس ساختیات کے بانیوں میں سے ایک ہیں، کے ایک مضمون "Historical Discourse"، کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں، کہ اس میں بھی افسانوی اور تاریخی داستانوں کے متعلق سوال اٹھایا گیا ہے کہ کیا حقیقی اور تصوراتی کہانیوں میں کوئی خاص فرق موجود ہوتا ہے یا کوئی لسانی خصوصیات، جس سے ہم ان دونوں میں فرق کر سکیں؟ ایک طرف تو وہ انداز چاہیے جو تاریخی واقعات کے لیے مناسب ہو اور دوسری طرف وہ انداز جو ایک طویل نظم، ناول یا ڈرامہ کے لئے مختص ہے۔ وہ آخر میں اس نتیجے کا اظہار کرتے ہیں کہ بنیادی طور پر تاریخی گفتگو صرف اپنی ساخت سے ہی، متن کا سہارا لئے بغیر، نظریات کی بجائے تخیل کی پیداوار ہوتی ہے۔[۶۴]

ڈیوڈ کار اسی دور کے ایک اور مریکی نظریہ ساز لوئس او منک(Louis O Mink) کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ بھی مختلف مباحث میں اسی نتیجے پر پہنچے ہیں، کہ تاریخی بیانیہ افسانے کی طرح ہی ایک فن پارہ ہے، جو انفرادی تخیل کی پیداوار ہے۔[۶۵]

ڈیوڈ کار اپنی بات کی توثیق کے لیے ہیڈن وائٹ (Hayden White) کے مقالے "The Value of Narrativity in tha Representation of Reality" کا حوالہ بھی دیتے ہیں، جس میں ہیڈن وائٹ قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ تاریخ میں حقیقی واقعات کو زندگی کے تصور میں مربوط، سالم، بھرپور اور نزدیک سے دکھانا صرف تخیل سے ہی ممکن ہو سکتا ہے۔

تاریخ نگاری کے حوالے سے اکثر ناقدین کا کہنا ہے کہ تاریخی بیانیہ، کہانی سنانے کے عمل کے طور پر، حقیقی واقعات کو پیش کرنے کے لیے موزوں نہیں ہے۔ ایک کہانی انسانی عمل اور تجربات کو (جیسا کہ ارسطو نے کہا) ایک مکمل مربوط طریقے سے آغاز، وسط اور انجام سے ترتیب دیتی ہے۔ اس کا پیمانہ سائنسی نہیں، بلکہ جمالیاتی ہے۔ یہ تخلیق کا تخیلاتی عمل ہے، پہلے سے دی ہوئی کسی چیز کی نمائندگی نہیں۔ ڈیوڈ کار کہتے ہیں کہ جو نقاد تاریخی علم کو ثبوتیت پسندانہ(Positivists) رویے کا حامل بتاتے ہیں، ان کو یہ ماننا ہوگا کہ ثبوتیت پسندوں کے لئے، تاریخ علم کی ایک واجب التعظیم قسم صرف تب ہی ہوتی ہے جب یہ اپنے ادبی پہناوے کو چھوڑ دے، لیکن تاریخ کی ادبی شکل اسے سائنسی ہونے کا دعویٰ کرنے سے روکتی دکھائی دیتی ہے۔ ڈیوڈ کار یہ نتیجہ چند مفروضوں سے اخذ کرتے ہیں۔ ان مفروضوں کا

تعلق ان بنیادی تین تصورات سے ہے جو تاریخ اور تخیل کے درمیان فرق کرتے ہوئے سامنے آتے ہیں۔ یہ تین تصورات بیانیہ، تخیل اور فکشن ہیں۔ان کے خیال میں ان مفروضوں کو حقیقت، علم اور افسانے کے طور پر بھی بیان کیا جاسکتا ہے۔

ڈیوڈ کار اپنے قائم کیے گئے پہلے مفروضے کی وضاحت کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ پہلے مفروضے کا تعلق بیانیے اور اس حقیقت، جس کی منظر کشی کرنا ہوتی ہے کے درمیان مبینہ تضاد سے ہے۔ کہانیاں ان واقعات کی منظر کشی کرتی ہیں جن کا آغاز، وسط اور اختتام ہوتا ہے اور جو پلاٹ کی ہیئت، ارادی و غیر ارادی نتائج، تقدیر کا الٹنا، خوش گوار یا ناخوش گوار انجام اور ایک عمومی ہم آہنگی کو ظاہر کرتے ہیں، جس میں ہر چیز کا ایک خاص مقام ہوتا ہے، لیکن حقیقت جو ہمیں بتائی جاتی ہے وہ اس طرح سے نہیں ہوتی۔ حقیقی دنیا میں واقعات ایک ایک کر کے وقوع پذیر ہوتے ہیں،، اس طرح سے کہ ہمیں وہ بے ترتیب نظر آتے ہیں، جب کہ وہ در حقیقت سختی سے اٹل قانون کے متعین کردہ ہوتے ہیں۔ یقیناً اس طرح کی حقیقت کی بیانیہ سے کوئی مماثلت نہیں ہے، کیوں کہ حقیقت نگاری کے لیے بیانیہ مکمل طور پر نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ حقیقت کے اوپر کوئی اجنبی شکل مسلط کر دی جائے۔ بیانیے کو، اگر اس کی ہیئت کی رو سے سمجھا جائے تو، یہ لازمی طور پر حقیقت کو مسخ کرتا دکھائی دیتا ہے۔[۲۶]

ڈیوڈ کا قائم کردہ دوسرا مفروضہ علم اور تخیل کے درمیان اختلاف کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ علم حقیقت کا غیر فعال عکس ہے، جب کہ اس کے برعکس، تخیل فعال اور تخلیقی ہے۔اور اگر تخیل معرفت کے عمل میں شامل ہو جائے اور اس عمل میں فعالی طور پر کچھ تخلیق بھی کرے تو نتیجہ علم کے معیار پر پورا نہیں اتر سکتا۔[۲۷]

تیسرا مفروضہ یہ ہے کہ فکشن اور جھوٹ یا جعل سازی کے درمیان حقیقت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ الزام جو تاریخ اور پھر انسانیت کے اوپر بھی عائد کیا جاتا ہے کہ وہ دانستہ یا نادانستہ دنیا کی صحیح کے بجائے غلط تصویر پیش کرتے ہیں۔ یہی وہ بنیادی نکتہ ہے، جس کی رو سے انہیں افسانوی یا تخیلاتی کہا جاتا ہے۔[۲۸]

ڈیوڈ ان تینوں مفروضوں کا الٹی ترتیب کے ساتھ تجزیہ کرتے ہیں۔ سب سے پہلے تخیل کو محض افسانوی اور جھوٹ یا جعل سازی سمجھنے کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ فکشن (Fiction) کی اصطلاح کو افسانوی اور جھوٹ یا جعل سازی کے معنی میں استعمال کرنا ایک تصوراتی الجھاؤ پیدا کرتا ہے، جس کو درست کرنے کی ضرورت ہے تاکہ یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ آیا یہ نقطہ معقول بھی ہے یا نہیں۔ جعل سازی ارادی طور پر جھوٹ یا محض ایک غلطی کی توثیق کرنے سے واقع ہو سکتی ہے۔

فکشن چوں کہ حقیقت کی نمائندگی کا کوئی دعویٰ نہیں کرتا، کیوں کہ ناول، ڈرامے اور فلمیں خصوصی طور پر ان اشخاص کی تصویر کشی کرتے ہیں جن کا کوئی وجود نہیں ہوتا، یا وہ امور اور واقعات جو کبھی وقوع پذیر نہیں

ہوتے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس جانکاری کے باوجود، ہم جذباتی طور پر بھی تخیلاتی کرداروں میں محصور ہو جاتے ہیں۔اس طرح، فکشن میں سچائی یا جھوٹ کا کوئی سوال نہیں اٹھتا، لیکن ڈیوڈ کے نزدیک فکشن میں سچائی کا سوال دوسری سطحوں پر یقیناً اٹھایا جا سکتا ہے۔ فکشن اگر زندگی جیسا اور قابل فہم ہو تو زندگی کے قریب ہو سکتا ہے۔ اگر فکشن کو اس مفہوم کے ساتھ حقیقی سمجھا جائے تو یہ مطلب نکلتا ہے کہ یہ ان واقعات کی منظر کشی کرتا ہے، جو شاید اس طرح ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ ہم جانتے ہیں (یا فرض کرتے ہیں) کہ در حقیقت ایسا نہیں تھا۔ یعنی فکشن ان معنوں میں حقیقی ہو سکتا ہے، کہ یہ انسانی حالت، فن کے متعلق، یا عمومی طور پر فطرت کے متعلق سچائیاں پہنچاتا ہے۔

ڈیوڈ زور دیتے ہیں کہ جب یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ تاریخ میں تخیل، یا تخیل کے عناصر ہیں، تو یقینا اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ مورخ وہ بیانات دے رہے ہیں جن امور کے متعلق وہ اور ان کے سامعین جانتے ہیں کہ وہ کبھی وقوع پذیر نہیں ہوئے، اور جن کا سچا اور جھوٹا ہونا اہم نہیں ہوتا۔ مورخ یقیناً حقیقی اشخاص اور واقعات کے بارے میں حقائق بتانے کا ارادہ اور دعوی کرتے ہیں۔ اگر پہلا مفروضہ قابل فہم ہے تو یہ نقطہ لازمی ہے کہ، شعوری یا غیر شعوری طور پر، مورخ کچھ ایسا کر رہے ہیں جو افسانہ نگار کرتے ہیں، یعنی ان امور کو تصور کرنا جو شاید اس طرح ہوتے رہے ہوں، نہ کہ یہ نمائندگی کرنا، کہ جیسے وہ تھے، لیکن اس کے باوجود یہ دعویٰ پھر بھی جائز نہیں ہے کہ ان کے نتائج بالکل غیر حقیقی ہیں۔[۶۹]

اس کے بعد ڈیوڈ علم اور تخیل کے حوالے سے بحث کرتے ہیں۔ تخیل تصور کرنے کی صلاحیت ہے۔ تصور کرنے کی صلاحیت علم کے مخالف ہوتی ہے۔ علم کو حقیقت کی "نمائندگی" کے طور پر، غیر فعال عکاس خیال کیا جاتا ہے۔ یعنی جو کچھ موجود ہے اسے ظاہر کرنا۔ علم کا یہ ایک صاف اور سادہ تصور ہے، لیکن جدید مباحث یہ ظاہر کرتے ہیں کہ علم حقیقت کا غیر فعال عکاس ہونے کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ اس کے نتائج محض بیرونی حقیقت کی نقل نہیں ہوتے۔ یہ ایک ایسی سرگرمی ہے جو بہت سی "صلاحیتوں" کو بروئے کار لاتی ہے جن میں فہم، پرکھ، عقل اور سب سے اہم بات اصل میں موجود چیزوں کو تصور کرنے کی صلاحیت، شامل ہیں۔ شاید یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تخیل کا جو بھی مقصد ہوتا ہے وہ غیر موجود کے معنوں میں تصوراتی ہونا چاہیے۔[۷۰]

مندرجہ بالا مباحث کے بعد تاریخ نگاری میں بیانیے کے حوالے سے ڈیوڈ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تاریخ اپنے وسیع معنوں میں انسان اور برادری جس میں وہ رہتا ہے، کی معاشی، ثقافتی اور جمالیاتی اہمیت سے لیس ہے۔ یہ بذاتِ خود فطرت نہیں ہے بلکہ یہ وہ فطرت ہے، جس کو انسانوں اور ان کے معاشرے کے تجربوں نے دریافت کیا۔ یہ اصل انسانی دنیا ہی ہے۔ بیانیہ بھی اس کے لئے مناسب ہے، کیوں کہ بیانیے کی ساخت، انسانی حقیقت میں، پہلے سے ہی موجود ہے۔ مورخ کو گزرا ہوا وقت فطرتی وقت میں بیانیے کے عمل سے دوبارہ سے نقش نہیں کرنا ہوتا، جیسا کہ ریکور

کہتے ہیں: " گزرا ہوا وقت مورخ کے آنے سے پہلے ہی وہاں موجود ہوتا ہے۔" ماضی کے متعلق کہانیاں سنانے کا مطلب، ماضی پر اجنبی ساخت مسلط کرنا نہیں ہے، بلکہ یہ عمل اسی سرگرمی کو جاری رکھتا ہے جو انسان کا ماضی تشکیل دیتی ہے۔اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمام تاریخی بیانیے سچے ہوتے ہیں یا کچھ بیانیے دیگر بیانیوں سے بہتر نہیں ہوتے ۔مقصد صرف اس بات کا انکار کرنا ہے کہ بیانیے کو محض اس لیے سچ نہ سمجھا جائے کہ وہ بیانیے ہیں ۔اور یہ ماننا بھی ضروری ہے کہ تخیل سے پیدا ہونے ولی ہر چیز کو محض خیالی سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے، کیوں کہ تاریخ اپنے جدید مباحث میں محض ذرائع کی جانچ کرنے سے کچھ آگے کی چیز ہے۔[۱]

ریوزن تاریخ نگاری میں اسی تخیل کے لیے Fictionality کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں، جسے عام طور پر معروضیت کی ضد سمجھا جاتا ہے۔ معروضی حقائق پر مشتمل معلومات سے پتا چلتا ہے کہ ایک خاص وقت پر، کسی خاص جگہ پر، کچھ خاص وجوہات کی بنا پر کسی خاص طریقے سے کچھ وقوع پذیر ہوا ہے۔ حقائق کب، کہاں، کیسے اور کیوں جیسے سوالات کے جوابات فراہم کرتے ہیں۔ یہ حقائق خود میں کوئی مخصوص تاریخی احساس، معنویت یا اہمیت نہیں رکھتے۔ یہ صرف ایک مخصوص وقت اور دوسرے حقائق سے معنوی تعلق کی بنا پر تاریخی احساس حاصل کرتے ہیں۔ یہ معنوی تعلق تاریخی حقائق کی وضاحت کے ذریعے بنتا ہے۔اس تاریخ سازی (Historicism) کا ادراک کرنے کے لیے تاریخی وضاحت، احساس (Sense)، معنویت (Meaning)، اور اہمیت (Importance) کے اصولوں کا استعمال کرتی ہے، جس کی حقائق سے الگ، اپنی کی نظریاتی (Ontological) حیثیت ہے۔[۲]

Fictionality، دراصل تاریخ نگاری میں ان عناصر کی علمی حیثیت کی نشان دہی کرتی ہے، جو حقائق کی اصل حقیقت سے ہٹ کے ہوتے ہیں۔ یہ اصطلاح تاریخی طریقہ کار کے وسیع تصور کی تصدیق کرتی ہے۔ یہ ایک ایسا وقوفی عمل ہے جو مآخذ کی معلومات کے معنوی بیانیے کی ترتیب کو تاریخی بیانیہ میں تبدیل کرتا ہے۔

جدید تاریخی مطالعات کے طریقہ کار اب ان روایتی طریقوں سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ جو معروضیت پر مبنی ہوتے تھے اور علم و بیان و بدیع کا سہارا لے کر تاریخ نگاری کے بیانیے اور تاریخی نمائندگی کے لیے موضوعیت پر توجہ مرکوز کر رہے ہیں۔اب تاریخی شعور کی تشکیل کے اصول جمالیاتی اور لسانیاتی نوعیت کے ہیں ۔ریوزن اس عمل کو Poetization کہتے ہیں۔ان کے خیال میں تاریخی ادراک کی یہ Poetization تاریخی وضاحت کے طریقہ کار کی اہمیت کو کم کر رہی ہے۔[۳]

پہلے یہ شاعرانہ فعل (Poetical act) تاریخی تحقیق کے وقوفی عمل میں کم سے کم شامل ہوتا تھا۔ تاریخی شعور کو بیدار کرنے کی لسانی حکمتِ عملی کے بارے میں نئی آگہی نے تاریخ نگاروں کی توجہ واپس تاریخ لکھنے کی طرف

موڑ دی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ تاریخی مطالعات میں حقائق کو جب بامعنی بیانیے میں شعور کے ساتھ ڈھالا جائے تو یہ عمل لسانی طریقہ کار پر انحصار کرتا ہے۔[۶۴]

تخیل کے بارے میں چوں کہ عام تصور ہے کہ ہم جو کچھ بھی سنتے ہیں یا سوچتے ہیں، ہمارا دماغ پہلے اس کی تصویر بناتا ہے۔ ہر شخص اپنے دماغ پہ بنی ہوئی ان تصاویر کی مدد سے واقعہ بیان کرتا ہے۔ اب یہ ہر انسان کی دماغی صلاحیت اور بیانیے پر قدرت پر منحصر ہے کہ وہ کس قدر گہرائی میں جا کر تصاویر کھینچتا ہے اور اپنے منفرد انداز سے ان کو بیان کرتا ہے۔ ابدال بیلا کی تصنیف کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود کو واقعے کے مناظر میں ایسا گم کر لیتے ہیں کہ ہر منظر زندہ ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ آسمان پر اٹھائے جانے والے واقعے کے بیان کے بعد مصنف اپنے تخیل سے خدائے بزرگ و برتر کے حضرت عیسیٰؑ سے کلام کو سوچتے ہوئے کہتے ہیں:

> ۔۔۔۔اسی لیے خدا نے ان کے دشمنوں کی بد طینت آنکھوں پہ پردہ ڈال کے اپنے اس برگزیدہ معصوم رسول کو کوئی گزند پہنچائے بغیر زمین کے پنجال سے آسمان کی وسعتوں پہ زندہ اٹھالیا تھا اور ان کے کان میں سرگوشی کر دی تھی کہ تم نسلِ انسانی میں سب سے طویل عمر پاؤ گے، کیوں کہ تمہارے ناعاقبت اندیش جاہل یہودی دشمن تمہارے اور میرے تعلق کو سمجھے بغیر تمہیں موت کہ صلیب پر لٹکا کے بغلیں بجا رہے ہیں۔ جیسے انہوں نے تمہارے خدا کو ہرا دیا اور مصلوب کر دیا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ کون ہے جو خدا کے ارادوں کو شکست دے سکتا ہے؟ جتنی جلدی ان بد بختوں نے تمہیں مارنے کی کی، اس سے ہزاروں گنا لمبی زندگی تمہیں عطا کی گئی ہے۔ اب تم ایک مقرر وقت پر آسمان سے اسی عزت و آبرو اور معطر گیلی لمبی سوہنی زلفوں کو اپنے چہرے پہ سجائے اترو گے اور تمہارے حسین مہکتے کندھوں پہ لہراتے بالوں سے تازہ خوشبو بھرے پانی کے قطرے ٹپک رہے ہوں گے۔ اس وقت میرے آخری رسول ﷺ بن عبداللہ کی رسالت ہو گی۔[۶۵]

مصنف نے اپنی تصنیف میں زیادہ تر فطری مناظر کی تصویر کشی کی بجائے سیرتِ نبوی ﷺ کے واقعات کے مناظر کی ہو بہو تصویر کشی کرنے کی کوشش کی ہے۔ مصنف کی طرف سے کی گئی منظر کشی میں ان کے تخیل کا عمل دخل ہوتا ہے۔ حضرت امیر حمزہ رضی اللہ کا جب ابو جہل کے بارے میں پتا چلا کہ اس نے آپ ﷺ کی شان میں گستاخی کی ہے، تو گھوڑے پر سوار ابو جہل کی سمت دوڑے، جو کعبہ میں حطیم کے پاس بیٹھا تھا۔ مصنف نے حضرت حمزہ کے وہاں پہنچنے کا جوز کر کیا ہے، وہ اس حد تک فطری معلوم ہوتا ہے کہ شاید چشم دید گواہ بھی اس طرح نہ بتا پاتا۔ مصنف لکھتے ہیں:

> گھوڑا حرم کی طرف بجلی کی سرعت سے مڑا۔ راہ کے پتھروں سے گھوڑے کے سموں سے چنگاریاں نکلیں، پلک جھپکنے میں حمزہ صحنِ کعبہ میں تھا۔ دیکھا، کعبے کے صحن میں، خانہ خدا کی دیوار

> کے سائے میں حطیم کے پاس منڈلی لگائے ابو جہل بیٹھا ہوا ہے۔ منڈلی میں بیٹھے سبھی قریشیوں نے سرپٹ بھاگے چلے آئے گھوڑے پر حمزہ کو دیکھا اور حیرانی سے اپنی گردنیں لمبی کر کے اس کی طرف تکنے لگے کسی اندرونی خوف سے ابو جہل بیٹھا بیٹھا اٹھ کھڑا ہوا، اگلے ہی لمحے حمزہ گھوڑے پہ سوار ابو جہل کے سر پہ پہنچ گیا۔ کمر پہ ہاتھ بڑھا کے کمان اتاری اور ابو جہل کو للکار کے قریب بلایا۔ ابو جہل ڈگمگاتے قدموں سے ہونق چہرہ لیے حمزہ کی طرف آیا تو حمزہ نے بائیں ہاتھ سے بھاگتے گھوڑے کی لگامیں کھینچیں، گھوڑے نے اگلے دونوں سم اوپر اٹھائے اور حمزہ نے دائیں ہاتھ میں پکڑی کمان پورے زور سے گھما کے ابو جہل کے سر پر دے ماری۔ [۶]

رکانہ نامی پہلوان نے حضور اکرم ﷺ سے کہا کہ اگر درخت خود چل کر آئے تو میں تب ایمان لاؤں گا۔ آقا ﷺ نے اللہ کی رضا سے درخت کو حکم دیا کہ تو وہ اپنی جگہ سے چل پڑا۔ مصنف نے اس واقعے کو اپنے تخیل سے یوں بیان کیا:

> رکانہ چیخیں مارتا ہوا، کیکر کو آتا دیکھ کے بھاگنے لگا۔ کیکر چل کے آقا ﷺ کے قریب آ گیا۔ اس کے چلنے سے ریت راہ میں ایک گہری کھائی بن گئی۔ لگتا تھا کیکر کا وہ درخت اپنے سارے پتے اور شاخیں لے کر سجدہ شکر کرتے ہوئے آتا آقا ﷺ سے نورِ ہدایت لے رہا ہو۔ آقا ﷺ کی رسالت کی گواہی دے رہا ہو۔ بتا رہا ہو کہ کیسے تپتے ہوئے صحرا میں اکیلے سال ہا سال دھوپ سہہ کے اوروں کے لیے سایہ کرنے کے لیے جینا ہے۔ [۷]

ام معبد کی کمزور اور لاغر بکری کو نبی کریم ﷺ نے اپنی برکت سے توانا کر دیا۔ مصنف نے اپنی چشمِ تخیل سے اس بکری کو توانا ہوتے نہ صرف خود دیکھا، بلکہ قاری کو بھی دکھایا:

> آقا ﷺ نے بکری کی کمر کو شفقت سے سہلایا۔ بکری اپنے قد سے اونچی دکھنے لگی۔ آقا ﷺ نے پھر خدائے واحد کا نام لیا۔ فرمایا؛ "اے اللہ، ام معبد کو اس کی بکری سے برکت دے۔" اور بکری کے سوکھے جھریوں بھرے تھنوں پہ ہاتھ پھیرا۔ بکری نے پچھلی دونوں ٹانگیں پھیلا دیں۔ اس کے پچکے چھچھڑا تھنوں میں ابال آیا۔ تھنوں کی ڈھیلی لٹکتی کھال کپکپانے لگی۔ ہولے ہولے پچکے ہوئے غبارے جیسے اس کے تھن پھول گئے اور ان کی کنیوں پہ دودھ کے قطرے چمک اٹھے۔ [۸]

اپنے تصور سے ابوسفیان کی حرکات و سکنات کی ایک جھلک یوں دکھائی کہ "ابوسفیان اپنے موٹے پیٹ کے دونوں طرف سے ہاتھ اٹھا کے اپنی چندیا کو ملتے ہوئے بولا۔" [۹] پہلی وحی کے بعد حضور اکرم ﷺ اور ان کی محبوب ترین زوجہ بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہ کی باہمی گفتگو بیان کرنے کے بعد ان ہستیوں کا ذکر اس انداز سے کرتے ہیں :

سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہ نے آقاﷺ کے کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنی پیشانی محبت سے اِن پہ رکھ دی۔ آقاﷺ اور سیدہ دونوں کی آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی تھے۔[80]

شبِ ہجرت نبیﷺ کی جگہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر ابو جہل اور اس کے ساتھیوں کی حالت کا نقشہ مصنف نے یوں کھینچا:

ابو جہل اور اس کے کرائے کے قاتل ٹولے کے منہ سے جھاگ نکلنے لگی۔ آنکھوں میں سارے جہان کے شیطان آکر ناچنے لگے۔ ان کے ہاتھوں کی مٹھیاں کھل بند ہونے لگیں اور ان کے منہ اول فول بکنے لگے۔[81]

مکہ سے ہجرت کے بعد جب نبی پاکﷺ مدینہ پہنچے، تو ہر کسی کی خواہش تھی کہ آقاﷺ اس کے مہمان بنیں، مگر آقاﷺ نے فرمایا کہ میری اونٹنی اللہ کے حکم کی تابع ہے۔ اس واقعہ کو مصنف نے تمام جزئیات کے ساتھ اس طرح بیان کیا کہ قاری بارہا اس واقعے کو سننے کے باوجود ایک ان دیکھے تجسس میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ مصنف اونٹنی کو کس مقام پہ اور کس انداز سے رکواتے ہیں۔ اس حوالے سے درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

آقاﷺ کی اونٹنی مدینہ کی کھلی گلیوں سے گزر کے جب اسی محلے کی طرف مڑی تو آقاﷺ کے دھیان میں وہ چھ سال کی عمر میں گزری دوہری یتیمی کے دکھی دنوں کی کوئی تیکھی نوک چبھی ہو گی۔ مگر ناقہ اس مقام پہ نہ ٹھہری، جہاں آقاﷺ کی ماں رکی تھی۔ ساتھ ہی آقاﷺ کے والد کی قبر والا گھر تھا۔ ناقہ اس مکان کے آگے سے بھی گردن جھکا کے گزر گئی۔ اب آگے آقاﷺ کے دادا سیدنا عبدالمطلب کی باتمکنت خوش آہنگ ماں کا گھر تھا۔ ناقہ قدم قدم بانکپن سے چلتی اس مقام سے بھی آگے بڑھ گئی۔ جدھر بچپن میں آقاﷺ کھیلے تھے، انہی رستوں پہ قصوا چل رہی تھی۔ ساتھ پروانوں کا ہجوم چل رہا تھا۔ ناقہ ابھی تک اسی محلے سے گزر رہی تھی۔ اس کے دھیرے دھیرج سے اٹھائے ایک ایک قدم سے راہ روک کے قدم لینے والے پرستار پروانوں کے پرے جلے جا رہے تھے۔ ساتھ تلواروں کو بلند کیے محافظوں کا جلوس چل رہا تھا۔[82]

مندرجہ بالا اقتباس میں ہم دیکھتے ہیں کہ مصنف نے کتنی باریک بینی سے اپنے تخیل کی مدد سے آقاﷺ کی اونٹنی کو مدینے کے ان رستوں پہ چلتا دیکھ رہے ہیں۔ ہجرتِ مدینہ کے موقع پر آقاﷺ کی اونٹنی کے رکنے والا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ناقہ رکی، ساتھ چلتے لوگوں کا سانس رکا۔ خوشی سے خشک ہوئے سانسوں سے خوش خیال باقرینہ چیخ نکلی۔ رکی ناقہ نے گردن اٹھا کے پیچھے چھوڑ آئے تینوں گھروں کی سمت دیکھا، جیسے فاصلہ ماپا ہو۔ پھر چاروں طرف سر موڑا، جیسے پوری دنیا کے کناروں کو جانچا ہو۔ پھر دھیرج سے گردن

جھکائی اور اپنے پچھلے گھٹنے موڑ کے بیٹھ گئی۔ آقاﷺ نے مہار تو چھوڑ رکھی تھی۔ چھوڑے رکھی۔ لوگوں نے خوشی سے چیخا۔ بھاگے، لپکے۔ ناقہ نے پھر گردن اٹھائی، گھٹنے سیدھے کیے، اٹھ کے کھڑی ہوگئی، پھر چلنے لگی۔ کچھ قدم آگے گئی، پھر رکی، مڑی، پلٹی۔ جہاں پہلے رکی تھی وہاں آ کے بھی پیچھے گئی۔ پھر رکی، چاروں طرف نتھنے کھول کے جیسے ہوا کو سونگھا، اپنے چھدرے کانوں کو ہلا کے جیسے کچھ سنا۔ پھر پلٹی، جہاں پہلی بار رک کے بیٹھی تھی۔ عین اسی جگہ رک کے دھم سے بیٹھ گئی۔ چاروں ٹانگوں کو زمیں پہ لپیٹ کے اپنا پیٹ دھرتی سے چھو لیا۔ بنو نجار ہی کے کے محلے میں ماہ کامل اتر آیا۔ ساتھ چلتے لوگوں کی خوشی سے چیخیں نکل آئیں۔ آقاﷺ کے اترتے ہی سب سے قریب گھر کے اکتیس سالہ خوش خصال ابوایوب انصاری کی لاٹری نکل آئی۔ [۵۳]

جارن ریوزن اور ڈیوڈ کار کے تنقیدی مباحث کی روشنی میں آقاﷺ کے متن میں معروضی حقائق کی موضوعی وضاحت اور تاریخی بیانیے میں تخیل کی کارفرمائی کا تنقیدی تجزیہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ آقاﷺ کے متن میں تاریخی بیانیے کی چاروں اقسام؛ روایتی، تنقیدی، مثالی اور جینیاتی، اگرچہ ایک دوسرے سے منفرد ہیں، مگر یہ ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتیں، بلکہ ان کا ایک باہم تعلقِ مسلسل ہے۔ روایتی بیانیے کے طور پر آقاﷺ کے مصنف نے سیرت کی روایات کو من و عن ہم تک پہنچایا ہے۔ اگرچہ واقعاتِ سیرت کی روایات کو مصنف نے اپنے انداز سے بیان کیا ہے، لیکن جہاں انہوں نے ضروری سمجھا، مختلف کتبِ سیرت یا احادیث کی کتب سے اپنی بات کی توثیق کے لیے اقتباسات بھی نقل کیے ہیں۔

انہوں نے بہت سی جگہوں پر اخلاقیات کو بھی روایت کے طور پر بھی بیان کیا ہے۔ مثالی بیانیے کو اپناتے ہوئے وہ صرف روایات کے بیان پر ہی اکتفا نہیں کرتے، بلکہ جگہ جگہ عقلی استدلال سے کام لیتے ہیں۔ وہ اپنے تاریخی شعور سے مختلف روایات کے بیان کے بعد، ان روایات سے عام اصول اخذ کر لیتے ہیں اور ان اصولوں کو موجودہ حالات پر لاگو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

تنقیدی تاریخی شعور بھی ان کے ہاں دیکھا جا سکتا ہے۔ سیرت نگاروں کی بیان کردہ اکثر روایات کی نہ صرف نفی کرتے ہیں، بلکہ اپنے تدبر سے دلائل بھی دیتے ہیں۔ جینیاتی بیانیے کی رو سے مصنف اکثر واقعات کے بیان کے بعد روایات کو مان تو لیتے ہیں، لیکن متحرک ارتقا کی اس قسم کے مطابق واقعے کی وضاحت بھی بیان کرتے ہیں۔

تاریخی ادراک جو دراصل ایک وقوفی عمل ہے، اس کے دونوں پہلوؤں؛ معروضی اور موضوعی، کی وضاحت آقاﷺ کے متن سے کی جا سکتی ہے۔ معروضی پہلو، جو کہ ماضی کے تجربے سے متعلق ہے اور موضوعی پہلو، جو زندگی کے مسائل کی نشان دہی اور ان کے حل سے متعلق ہے۔ دونوں پہلو ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ ان دونوں پہلوؤں

کی مدد سے مصنف ہر واقعے کی وضاحت کرتے ہیں۔ہر واقعے کے بیان کے بعد اپنی ذاتی رائے سے وضاحت کرنے کا انداز پوری تصنیف پر حاوی ہے۔

تخیل کے بارے میں عام تصور ہے کہ ہم جو کچھ بھی سنتے ہیں یا سوچتے ہیں، ہمارا دماغ پہلے اس کی تصویر بناتا ہے۔ ہر شخص اپنے دماغ پہ بنی ہوئی ان تصاویر کی مدد سے واقعہ بیان کرتا ہے۔اب یہ ہر انسان کی دماغی صلاحیت اور بیانیے پر قدرت پر منحصر ہے کہ وہ کس قدر گہرائی میں جا کر تصاویر کھینچتا ہے اور اپنے منفرد انداز سے ان کو بیان کرتا ہے۔ابدال بیلا کی تصنیف کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود کو واقعے کے مناظر میں ایسا گم کر لیتے ہیں کہ ہر منظر زندہ ہو کر سامنے آجاتا ہے۔

مصنف نے اپنی تصنیف میں زیادہ تر فطری مناظر کی تصویر کشی کی بجائے سیرتِ نبوی ﷺ کے واقعات کے مناظر کی ہو بہو تصویر کشی کرنے کی کوشش کی ہے۔ مصنف کی طرف سے کی گئی منظر کشی میں ان کے تخیل کا عمل دخل ہوتا ہے۔ یہ تو واضح ہے کہ تاریخی حقائق کے بیانیے میں حقیقت کے علاوہ بھی کچھ ہوتا ہے، جو ان حقائق کو تاریخی معیار فراہم کرتا ہے۔ معروضی حقائق کی موضوعی وضاحت اور واقعات کے بیان میں تخیل کی کارفرمائی کی وجہ سے بیانیے اور حقیقت میں تعلق استوار ہوتا ہے۔اسی لیے بیانیہ داستانی انداز کا حامل ہو جاتا ہے، لیکن جہاں تک سیرت نگاری کا تعلق ہے تو اس صنف میں جب تخیل کے کار منصبی کی بات کی جائے تو یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ اس صنف میں تخیل کا استعمال ہر طرح سے جائز ہے یہ موضوع سیرت نگار سے عام تاریخ نگاری کے معاملے میں زیادہ احتیاط کا تقاضا کرتا ہے۔ چودہ سو سال پہلے کے واقعات کے بیان میں حد سے زیادہ تخیل مبالغے کو جنم دیتا ہے، جو حقیقت کو مسخ کرنے کا باعث ہو سکتا ہے۔ اس سے تصنیف کا علمی و تحقیقی معیار بھی متاثر ہوتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ریپینا، لورینا پی(Repina, Lorina P)، “Historians in Search of new ways at the border of the centuries” مشمولہ *Codrul Cosminului*، جلد ۱۹، طبع دوم، (دسمبر ۲۰۱۳ء): ص ۲۵۷۔۲۶۸۔

۲۔ جارن ریوزن(Jorn Rusen)، دیباچہ *History: Narration, Interpretation, Orientation*، (نیویارک: برگ ہان بکس، ۲۰۰۵ء)۔

۳۔ ایضاً، ص ۲۷۔

۴۔ مبارک علی، ”اُردو میں تاریخ نویسی“، مشمولہ تاریخ سہ ماہی، شمارہ نمبر ۳۲، تاریخ نویسی نمبر (جنوری ۲۰۰۷ء)، ص ۱۰۸۔

۵۔ جارن ریوزن(Jorn Rusen)، دیباچہ *History: Narration, Interpretation, Orientation*، ص ۳۴،۳۵۔

۶۔ ایضاً، ص ۱۲۔

۷۔ ایضاً، ص ۲۷۔

۸۔ ابدال بیلا، آقاﷺ (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء)، ص ۴۱۸۔

۹۔ ایضاً، ص ۶۴۸۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۶۹۹۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۷۲۶۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۷۷۹۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۷۸۶۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۷۹۴۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۸۱۷۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۸۸۳۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۹۵۲۔

۱۸۔ جارن ریوزن(Jorn Rusen)، دیباچہ *History: Narration, Interpretation, Orientation*، ص ۱۴۔

۱۹۔ ایضاً، ص ۳۰۔

۲۰۔ ابدال بیلا، آقاﷺ، ص ۵۳۶۔

۲۱۔ ایضاً، ص۳۰۔

۲۲۔ ایضاً، ص۶۸۱۔

۲۳۔ ایضاً، ص۹۹۰۔

۲۴۔ ایضاً، ص۶۹۲۔

۲۵۔ ایضاً، ص۶۹۲۔

۲۶۔ ایضاً، ص۸۰۵۔

۲۷۔ ایضاً، ص۸۰۵۔

۲۸۔ ایضاً، ص۸۰۶۔

۲۹۔ ایضاً، ص۶۵۵۔

۳۰۔ ایضاً، ص۳۲۔

۳۱۔ ایضاً، ص۴۴۷۔

۳۲۔ ایضاً، ص۸۰۲، ۸۰۳۔

۳۳۔ ایضاً، ص۶۱۶، ۶۱۷۔

۳۴۔ ایضاً، ص۱۵۔

۳۵۔ ایضاً، ص۴۴۷۔

۳۶۔ ایضاً، ص۳۳۔

۳۷۔ ایضاً، ص۴۵۷۔۴۶۷۔

۳۸۔ ایضاً، ص۹۲۷۔

۳۹۔ ایضاً، ص۱۰۳۰۔

۴۰۔ ایضاً، ص۲۹۔

۴۱۔ ایضاً، ص۶۱۔

۴۲۔ ایضاً، ص۶۰۔

۴۳۔ ایضاً، ص۶۰۔

۴۴۔ ایضاً، ص۶۱۔

۴۵۔ ایضاً، ص۶۳۔

۴۶۔ ایضاً، ص۶۳۔

۴۷۔ ایضاً، ص۶۴۔

۴۸۔ ایضاً، ص۶۶۔

۴۹۔ ایضاً۔

۵۰۔ ایضاً، ص۴۸۹۔

۵۱۔ ایضاً، ص۶۰۸۔

۵۲۔ ایضاً۔

۵۳۔ ایضاً، ص۶۱۷۔

۵۴۔ ایضاً، ص۶۸۲۔

۵۵۔ ایضاً، ص۷۴۹۔

۵۶۔ ایضاً، ص۸۰۴۔

۵۷۔ ایضاً، ص۸۱۸۔

۵۸۔ ایضاً، ص۲۵۶۔

۵۹۔ ایضاً۔

۶۰۔ ایضاً، ص۹۵،۹۶۔

۶۱۔ ایضاً، ص۲۱۳۔

۶۲۔ ایضاً، ص۵۴۱۔

۶۳۔ ڈیوڈ کار، "History, Fiction and Human Time: Historical Imagination and Historical Responsbility"، مشمولہ *Ethics of History* (۲۰۰۴ء): ص۲۵۱۔

۶۴۔ ابدال بیلا، آقاﷺ، ص ۲۴۸۔

۶۵۔ ایضاً۔

۶۶۔ ایضاً، ص۲۵۲۔

۶۷۔ ایضاً۔

۶۸۔ ایضاً۔

۶۹۔ ایضاً، ص۲۵۷۔

۷۰۔ ایضاً۔

۷۱۔ ایضاً، ص۲۵۸۔

۷۲۔ جارن ریوزن (Jorn Rusen)، دیباچہ *History: Narration, Interpretation, Orientation*، ص۶۷۔

۷۳۔ ایضاً، ص۶۸۔

۷۴۔ ایضاً۔

۷۵۔ ابدال بیلا، آقاﷺ، ص۴۵۸۔

۷۶۔ ایضاً، ص۳۸۱۔

۷۷۔ ایضاً، ص ۴۸۴۔

۷۸۔ ایضاً، ص۵۵۸۔

۷۹۔ ایضاً، ص ۶۳۔

۸۰۔ ایضاً، ص۳۱۷۔

۸۱۔ ایضاً، ص۵۴۵۔

۸۲۔ ایضاً، ص۵۷۶۔

۸۳۔ ایضاً، ص۵۷۷۔

باب پنجم

آقا ﷺ میں ادبی حربوں کا استعمال :

تحقیقی و تنقیدی تجزیہ

باب پنجم:

آقا ﷺ میں ادبی حربوں کا استعمال: تحقیقی و تنقیدی تجزیہ

ادبی تجزیے یا ادبی تنقید کا مطلب ہے کہ ادبی کام کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے۔اس میں کسی مرکزی مسئلے کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ سوالات اٹھائے جا سکتے ہیں۔ نظریاتی اور تجزیاتی طریقوں سے نتائج کی اہمیت کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ادبی تجزیہ مثبت یا منفی ہو سکتا ہے۔ یہ ادب کے انفرادی ٹکڑے یا کسی مصنف کے پورے ادبی کام کے مطالعے پر مبنی ہو سکتا ہے۔ادبی تجزیے کا مطلب صرف ایک ادبی کام کا خلاصہ درج کرنا نہیں،اور نہ ہی مصنف کی اغلاط ڈھونڈنے کو ہی ادبی تجزیے کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔ادبی تجزیہ ادبی کاموں کی تشریح و تعبیر،ان کے موازنے اور ان کے تجزیے پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ بنیادی طور ہر ادبی کام کے موضوع کے انداز، ترتیب یا تاریخی سیاق و سباق کے متعلق ایک رائے ہے۔ یہ عام طور پر نقاد کے اپنے خیالات کو تحقیق کے نتیجے میں حاصل ہونے والی بصیرت کے ساتھ ضم کرتا ہے۔ ادبی تجزیہ ادبی کاموں کا بہتر ادراک کرنے، ادب کے بارے میں فیصلہ کن رائے پر پہنچنے اور انفرادی سطح پر اس بات کا تعین کرنے میں مدد دیتا ہے کہ نقاد کس حد تک ادبی کام کو سمجھنے کے قابل ہیں؟

ادبی تجزیے کے دوران دیگر پہلوؤں کے ساتھ ساتھ درج ذیل دو باتوں کا خاص خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔

۱۔ الفاظ کے مطالب کیا ہیں؟

۲۔ یہ الفاظ کس مفہوم اور سیاق و سباق میں استعمال ہوئے ہیں؟

ادبی تجزیے میں تعبیر و وضاحت کا مقصد متن کو مخصوص معنی عطا کرنا ہے۔ادبی کام ہمیشہ حقیقت اور تخیل کا امتزاج ہوتا ہے۔ایک تخلیقی کام وسیع نوعیت کا حامل ہوتا ہے۔ مختلف قارئین اپنے اپنے ادراک اور اقدار کے مطابق اس سے معنی اخذ کرتے ہیں۔ادبی کام کے حوالے سے ان کا ردِ عمل موضوعی ہوتا ہے۔ متن کے معنی زمانے کے ساتھ ساتھ تبدیل ہو جاتے ہیں۔ قاری ادبی کام کو دوبارہ تحریر کرتا ہے۔اس کی نئی تعبیر کرتا ہے۔ شاید اسی لیے ادبی تجزیے کو مختلف اذہان کی جنگ کہا جاتا ہے۔[1]

یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ مندرجہ بالا مباحث کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ قاری متن کو اپنی مرضی کے معنی عطا کر دینے میں مکمل آزاد ہے۔ کسی بھی ادبی تحریر کا متن حقیقی مظہر کی حیثیت سے اس وقت تک وجود میں نہیں آسکتا، جب تک قاری اسے حقیقت میں محسوس نہ کرے۔ متن کو زندگی بخشنے کے لیے قاری کی ذہنی سرگرمی ضروری ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ ادیب پر بھی یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے، کہ وہ جب بھی ادب تخلیق کرے تو اپنی بصیرت کو قاری کے ذہن تک پہنچانے کی سعی کرے۔ایک باصلاحیت ادبی کام ہمیشہ پڑھنے والے کو متاثر کرتا ہے اور اس کے جذبات کو ابھارنے کے ساتھ ساتھ اس کی عقل کو چھوتا ہے۔اسی لیے ادبی متن ایسا ہونا چاہیے کہ مصنف کے خیالات قاری کے ذہن میں متحرک محسوس ہوں۔اس کا مقصد مصنف کے ارادی پیغام کی تعمیر نو ہونا چاہیے، اسی لیے کروچے نے نقاد کا صاحبِ ذوق سلیم ہونا ضروری قرار دیا ہے تاکہ وہ اپنے آپ کو مصنف سے ذہنی سطح پر ہم آہنگ کرنے کے قابل ہو سکے اور اس کے تجربے کا تخلیقی اعادہ کر سکے۔

ادب کی دیگر اصناف کی طرح سیرت نگاری کا ادبی تجزیہ بھی اسی محنت اور باریک بینی کا متقاضی ہے۔ اگر سیرت نگار خود ادیب بھی ہو تو سوانح و سیرت نگاری میں ادبی حربوں کے استعمال سے قائم ہونے والی ادبیت کے تجزیے کے حوالے سے تجزیہ نگار کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے۔دراصل مسئلہ یہ ہے کہ ادب میں کبھی بھی کہانی بیان کرنے کے لیے کوئی باقاعدہ اصول وضع نہیں کیے گئے۔اس حوالے سے کلفرڈ بایو گرفر اور ناول نگار کی مشترکہ ذمہ داریوں اور مسائل کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ دونوں ہی زندگی کو وسیع معنوں میں پیش کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ایک واقعات کو دریافت کرتا ہے، جب کہ دوسرا ان واقعات کو تخیل کے ذریعے استعمال کرتا ہے۔دونوں کو ایک طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، کہ کس طرح حقائق، نظریات اور الفاظ سے زندگی تخلیق کی جاتی ہے۔ایک ناول نگار عام طور پر مختلف ادبی حربوں کے ذریعے گہرائی اور ابہام کی نشان دہی کرتا ہے۔ لیکن یہ دیکھا جانا ضروری ہے کہ ایک سوانح نگار اس تکنیک کو کس انداز میں استعمال کر سکتا ہے؟[۲] -

ادبی حربوں کی جانچ پرکھ کے لیے نظری ڈھانچہ:

اس باب میں آقا ﷺ کے متن میں ادبی عناصر کا جائزہ، معروف محقق اور مصنف ڈیوڈ جولف (۱۹۳۹ء، David Jolliffe) کی طرف سے دیے گئے Rhetorical Framework کی روشنی میں لیا جائے گا، تاکہ اس تصنیف میں مصنف کی زبان کے کردار اور علامات کے استعمال کو اچھی طرح سمجھا جا سکے۔ اس فریم ورک کے ذریعے مصنف کے انداز و اسلوب کے بارے میں جاننے کی کوشش کی جائے گی اور مصنف کے لہجے سے موضوع اور قاری کے متعلق مصنف کے رویے کی نشان دہی ممکن ہو پائے گی۔

ذیل میں مذکورہ بالا فریم ورک کا خاکہ پیش کیا جا رہا ہے۔[۳]

ڈیوڈ جولف کے اس فریم ورک کے دو حصے ہیں۔

حصہ اول: بلاغت(Rhetorical Situation)

پہلے حصے کو بلاغت(Rhetorical Situation)کا نام دیا گیا ہے۔ اس حصے کا تعلق ان اندرونی و بیرونی محرکات سے ہے، جن کی ترغیب سے مصنف نے اپنی تصنیف لکھی۔اس میں ضرورت، قارئین اور مقصد کے حوالے سے بحث کی جاتی ہے۔

ضرورت(Exigence)

اس تصنیف کی ضرورت کیوں پیش آئی؟اصل مسئلہ کیا ہے، جس نے مصنف کو تحریک دی؟ہمیں کس تناظر میں یا کن عوامل کے تحت اس تصنیف پر غور کرنے کی ضرورت ہے؟

قارئین(Audience)

مصنف کس سے مخاطب ہے؟ قارئین کی جماعت کا کون سا طبقہ اس تصنیف کے متن کے پیغام پر عمل کے حوالے سے دیگر تصانیف کے مقابلے میں فرق کرنے کی پوزیشن میں ہے؟

مقصد(Purpose)

مصنف نے یہ تصنیف کیوں لکھی؟اس کا مقصد کیا ہے؟مصنف اپنے قارئین سے کیا چاہتا ہے؟ قارئین کو کس لطیف عقیدے کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے؟

حصہ دوم: کشش انگیزی(Appeals)

بلاغت کے تینوں مراحل مکمل ہونے کے بعد مصنف کے عمل کی باری آتی ہے۔اسی حصے کو کشش انگیزی(Appeals) سے موسوم کیا گیا ہے، جو اس فریم ورک کا دوسرا حصہ ہے۔ اس میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ مصنف کی طرف سے منطقی استدلال کا استعمال کس انداز سے کیا گیا ہے؟ مصنف نے کس نقطہ نظر کا پرچار کیا؟اس کا اندازِ بیان کیسا تھا؟اس نے اسلوب کیسا اختیار کیا؟وغیرہ۔

عقلی اصول/طرزِ استدلال کا استعمال(Logos)

کیا دلیل پیش کی گئی ہے ؟اہم نکات کیا ہیں؟مصنف نے حقائق کے علاوہ منطقی استدلال کا استعمال کیسے کیا ہے؟

جذبات نگاری(Pathos)

جذبات نگاری میں مصنف کس طرح قارئین کے خصوصی جذبات یا دلچسپیوں کو بڑھاتا ہے؟مصنف قارئین کے جذبات کس طرح ابھارتا ہے؟

مزاج یا اخلاق(Ethos)

مصنف اپنی تصنیف کے ذریعے قارئین میں کیسے اچھا احساس پیدا کرتا ہے؟وہ کس طرح قارئین میں اخلاقی اقدار کو فروغ دیتا ہے؟

ترتیب(Arrangements)

کیا یہ تصنیف تاریخ وار ہے؟کیا مخصوص نکات کو حکمتِ عملی کے تحت اس متن کی ترتیب میں رکھا گیا ہے، تاکہ قارئین پر زیادہ اثر پڑے؟

اسلوب(Style)

مصنف اپنی بات کو سمجھانے کے لیے کون سی ادبی تکنیکیں اور ادبی حربے استعمال کرتا ہے؟اس نے زبان اور جملوں کی ساخت کا استعمال کس طرح کیا ہے؟اس نے متن کو کس طریقے سے متاثر کن بنایا ہے؟یہ تصنیف قارئین کے لیے کس طرح یاد رکھے جانے کے قابل ہے؟

اسلوب

ادبی حربے (Figurative Devices)	علمِ نحو (Syntax)	ڈکشن (Diction)
امیجری (Imagery) تلمیح (Allusion)	فعال جملے/طورِ معروف (Active Voice)	رسمی بمقابلہ غیر رسمی زبان (Formal versus informal language)
تکرار (Repetition) مبالغہ (Hyperbole)	غیر فعال جملے/طورِ مجہول (Passive Voice)	تعبیر/دلالت (Denotation/Connotation)
تشبیہ (Similes) استعارہ (Metaphor)	جملوں میں حروفِ عطف کا تواتر سے استعمال (Polysyndenton)	دیگر زبانوں کے الفاظ (Words of other languages)
بیان بازی میں سوالات (Rhetorical Question)	غیر معطوف جملے (Asyndeton)	جذبات کو ہوا دینے والے الفاظ (Words that evoke emotions)

نظری ڈھانچے کے اجزا اور ان کا اطلاق: Rhetorical Question

ذیل میں آقاﷺ کے متن کا بلاغت اور کشش انگیزی کے اجزا کے حوالے سے تجزیہ پیش کیا جارہا ہے۔

ضرورت (Exigence:)

آقاﷺ کا موضوع سیرتِ نبویﷺ ہے۔اس حوالے سے یہ بات واضح ہے کہ مصنف نبی آخرالزماںﷺ کی سیرتِ پاک سے لوگوں کو آشنا کروانا چاہتے ہیں اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حضرت محمدﷺ تمام انسانوں کے لیے بہترین نمونہ ہیں اور آپﷺ نے بہترین انسانی اقدار کی نمائندگی کی۔ آج دنیا کی تقریباً ایک چوتھائی آبادی آپﷺ کی تعلیمات کی پیروکار ہے۔آپﷺ کی تعلیمات کے زیرِ پا اثرات کے باوجود آپﷺ کی شخصیت کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں آپﷺ کی ذاتِ مبارکہ اور آپﷺ کی تعلیمات کو محدود کرنے کے مترادف ہیں۔ان ہی وجوہات کی بنا پر مصنف کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ حضور اکرمﷺ کی حیاتِ طیبہ کو واضح اور نمایاں کر کے منظرِ عام پر لائیں۔ مصنف بتاتے ہیں کہ کچھ عرصہ وہ ایسی منسٹری میں رہے، جہاں انہیں دیگر مذاہب کو جاننے کا موقع ملا۔انہوں نے سب کو آقاﷺ کی زندگی متعارف کروائی۔ لکھتے ہیں:

> سب نے مانا کہ وہ عظیم ترین ہیں۔ان کا صرف ایک شکوہ تھا، ایسے رحمتہ اللعالمین آقاﷺ کے ماننے والے اتنے متشدد اور برداشت کی قوت کم رکھنے والے کیوں ہیں؟ میرا ایک ہی جواب ہوتا، آپ ہمیں نہیں، ہمارے آقاﷺ کو دیکھیں۔آپ نے اتنے بڑے لوگوں کی بایو گرافیز پڑھی

ہیں، ایک بار میرے آقاﷺ کی سیرت بھی پڑھ لیں۔ پھر فیصلہ کریں کہ انسان کی توقیر کسی انسان نے ان سے زیادہ کی ہو تو میرے سامنے لائیں۔ یہ میرا چیلنج ہے۔ کوئی ان سے رحیم ہو تو دکھائیں۔[۳]

مصنف کے نزدیک آپﷺ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی دریافت کرنا واقعتاً انسانیت کی اصل قدر دریافت کرنا ہے، اسی لیے وہ دنیا کو بتانا چاہتے ہیں کہ آپﷺ نے قرآن پاک کی تعلیمات کے مطابق جو مذہبی معاشی، ، معاشرتی اور سیاسی اصول قائم کیے وہ اسلام اور مسلم دنیا کی پہچان ہیں۔اپنی تصنیف میں مصنف نے ان اصولوں کو متعارف بھی کروایا ہے۔

قارئین(Audience):

ہر تصنیف میں مصنف کے پیشِ نظر قارئین کی ایک مخصوص جماعت ہوتی ہے، جن تک وہ اپنا پیغام پہنچانا چاہتا ہے ویسے تو وقائع سیرتِ پاک سے رہنمائی کوئی بھی انسان کسی بھی دور میں لے سکتا ہے، تاہم آقاﷺ کے حوالے سے دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ مصنف کا مخاطب عام قاری ہے۔ مصنف نے قاری کو متوجہ اور متاثر کرنے کے لیے اپنی تصنیف کو ادبی تصنیف بنا کر پیش کیا ہے۔ تمام واقعات ناول یا کہانی کے انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ افسانہ نگار اور ناول نگار ہونے کے ناطے، ابدال بیلا نے آقاﷺ کی سوانح پاک کے اہم واقعات کے انتخاب اور ان کے بیان کو آسان اور سہل بنا کے مختلف اکائیوں میں پیش کیا ہے۔ ان کی تصنیف ادبی پیرائے میں سیرتِ رسولﷺ کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ مصنف نبی اکرمﷺ کا پیغام تمام بنی نوع انسان تک پہنچانا چاہتے ہیں، بالخصوص مغربی دنیا میں آقاﷺ کی تعلیمات کا پرچار کرنا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے اپنی تصنیف میں جہاں بھی ممکن ہوا، وہ اسلام اور عیسائیت کو قریب لانے کی کوشش کرتے ہیں۔

مقصد(Purpose):

آقاﷺ کے متن میں مصنف نے اپنی تصنیف کے درج ذیل مقاصد بیان کیے ہیں:

۱۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں ایسی ادبی کتاب تحریر کرنا، جو حضرت ابراہیمؑ کے دور سے شروع ہو اور آقاﷺ کے وصال پہ ختم ہو۔

۲۔ آقاﷺ کی محبت و مودت قاری کے دل میں موجزن کرنا۔

۳۔ آقاﷺ کی تعلیمات سے قاری کو روشناس کروانا۔

۴۔ عیسائیت کو اسلام کے قریب لانے کی کوشش کرنا۔

۵۔ فرقہ پرستی کو فروغ دینے کے بجائے لوگوں کو جوڑنا۔

۶۔ زمانی ترتیب سے واقعات کی تفصیل اس طرح بیان کرنا کہ قاری خود کو اس کا شاہد سمجھے، جیسے خود دیکھ رہا ہو۔

عقلی اصول/طرزِ استدلال کا استعمال (Logos):

اس حصے میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ مصنف کی طرف سے اپنی تصنیف میں کیا دلیل پیش کی گئی ہے؟ اس کے اہم نکات کیا ہیں؟ مصنف نے اپنی تحریر میں حقائق کے علاوہ منطقی استدلال کا استعمال کیسے کیا ہے؟ اس کو درج ذیل دو پہلوؤں سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

۱۔ مزاج یا اخلاق (Ethos)

۲۔ جذبات نگاری (Pathos)

مزاج یا اخلاق (Ethos):

آقا ﷺ کے مطالعے سے قاری کو مصنف کے اس انداز کا بخوبی علم ہو جاتا ہے کہ وہ واقعاتِ سیرت کے بیان کے دوران باتوں باتوں میں اخلاقیات کا پرچار بھی کرتے چلے جاتے ہیں۔ اپنی تحریر کے دوران قاری کی اخلاقی تربیت کا کوئی موقع ضائع نہیں ہونے دیتے۔

مکے سے مدینے ہجرت کے دوران عبداللہ بن اریقط نے راستے کی رہنمائی کی تھی، حالاں کہ انہوں نے اس وقت تک سلام قبول نہیں کیا تھا، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ نے ان سے راستے کی رہنمائی لی۔ مصنف اس واقعے سے حاصل ہونے والے اخلاقی سبق سے قاری کو آگاہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> اس کی پیروی میں کیا ہوا وہ عظیم ترین سفر شاید آقا ﷺ نے یہ اصول رائج کرنے کے لیے کیا ہو کہ تمام تر انسانی قدروں میں سے سب سے بڑی قدر انسانیت ہے۔ مذہب، دنیا داری اور دینی معمولات سے بھی بڑھ کر۔ جس کی اساس امانت داری، سچ، وعدے کی پاس داری اور اندر کے نفس کے ہر لالچ سے بلند ہو کے کسی انسان کی اس کے فن اور پیشہ ورانہ مہارت کی قدر شناسی سے وابستہ ہے۔ چاہے وہ کوئی بھی ہو، وہ قابلِ عزت ہے۔ آگے چلنے کے قابل ہے۔[۵]

آخرت کا ذکر کرتے ہوئے بات کا رخ ان اوصاف کی طرف موڑ دیتے ہیں، جو دنیا و آخرت کی کامیابی کی ضمانت ہیں۔ باتوں ہی باتوں میں ان اوصاف کی پوری فہرست گنوا دیتے ہیں:

> دوسروں کے لیے نفع آور بننا۔ کم نہ تولنا۔ سچ بولنا۔ امانتوں کو لوٹانا۔ والدین کا ادب کرنا۔ پڑوسیوں کا خیال رکھنا۔ مسافروں کی آؤ بھگت کرنا۔ مسکینوں اور مسافروں کو کھانا کھلانا۔ اللہ کی ساری مخلوق کا بھلا چاہنا۔ ہر دوسرے کو خود پر ترجیح دینا۔ اکڑ کے نہ چلنا۔ تکبر اور غرور سے بچنا۔ اپنے اسلاف پہ فخر نہ کرنا۔ کسی کو کم تر اور حقیر نہ سمجھنا۔ پیٹھ پیچھے کسی کی برائی نہ کرنا۔ فساد اور فتنے سے بچنا۔ دل میں کسی کے لیے کدورت اور عناد نہ پلنے دینا۔ اس لیے کہ یہ سب اللہ کا حکم ہے۔ جو یکتا، واحد اور

احد ہے۔ صرف وہ ہے اکیلا عبادت کے لائق اور آقاﷺ رسول اللہ ﷺ، اللہ کے آخری رسول ہیں۔[۶]

اسلام میں شراب نوشی کی ممانعت کی گئی ہے۔ کسی بھی معاشرے میں شراب نوشی اور جوئے کے برے اثرات مرتب ہونے اور اسلام کے ہی سیدھا اور سچا راستہ ہونے کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ :

اب مہذب دنیا جانتی ہے کہ سزا واجب ہے۔ جو قرآن کی دلیل ہے وہ ہی سچ ہے۔ شراب پی کے دنیا میں ٹریفک کے حادثے، خانگی زندگی کا فساد، جسم و جان کی توڑ پھوڑ، جگر کی بیماریاں،۔ ذہن کا فتور، کوئی ایسی سزا ہے، جو بنی نوع انسان اس مصیبتوں کی جڑ سے نہ پالتا ہو۔ جوئے کی خرابیاں بھی نسلِ انسانی کا ناسور ہیں۔ خدا کا بنایا ہوا راستہ پاک اور پاکیزہ ہے۔ اور خدا دھیرے دھیرے سمجھا کے، دلیل سے عقل کو اپیل کرتا ہے۔ یہی صراطِ مستقیم کی نشانی ہے۔ موٹر وے کی طرح یہ راستہ مسافر کو بھٹکنے نہیں دیتا۔ ہر کچھ فاصلے پہ کدھر جانا ہے، کتنا فاصلہ رہ گیا، کتنا کٹ گیا، کہاں سے اترنا ہے، کہاں چڑھنا ہے، سب ایسے ہی سوہنے راستوں پہ لکھا ہوتا ہے۔ یہ سلامتی کی راہ ہے۔ یہ سوہنا راستہ ہے۔[۷]

آقاﷺ میں مصنف پوری تصنیف میں ہمیں اسی انداز کے حامل نظر آتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ابدال بیلا سیرت کے واقعات کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ وہ اخلاقی نقطہ بھی تشکیل دے رہے ہیں، جس سے ان کی تصویروں کو دیکھنا ہے۔

جذبات نگاری (Pathos):

آقاﷺ میں مصنف، جابجا قاری کو آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس سے والہانہ عقیدت اور محبت کی طرف راغب کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نبی پاک ﷺ کے ذکر میں لکھتے ہیں :

ذکرِ آقاﷺ پہ دل دھڑکتا ہے، دھڑکن آنسو ابلتی ہے، اندر ہی اندر آقاﷺ کے نورِ سرمدی سے آنسوؤں کی ندیاں دریا بنتی ہیں اور انہی کی رحمت کے بے کنار سمندر میں جا ملتی ہیں۔ پھر اسی رحمۃ للعالمین ﷺ کے میٹھے سمندر سے برکت بھرے بادل جھوم کے اٹھتے ہیں اور ساری دھرتی پہ رم جھم کر کے روح کے کونے کونے کو بھگو دیں تو یہ اسی پڑھنے والے کے دل کا اجلا پن ہے۔ روشنی شیشے سے منعکس ہوتی ہے۔ تحریر کتنی بھی جاذب نظر ہو، یہ قاری کی ریشمی سندر بے داغ چمکتی روح پہ ماہ کامل کی چمکتی چاندنی ہے جو آپ جیسی خوش نصیب روح کو وجد میں لا کر سرمدی سُر میں سنسناتی، عشقِ رسول ﷺ کے رنگ میں ڈھل جاتی ہے۔ جس سے سوہنا زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے اور کوئی رنگ نہیں۔[۸]

سیرت بھی تاریخ ہی ہے اور تاریخ نگاری کے جدید نظریات بھی تاریخ نگار سے مطالبہ کرتے ہیں کہ تاریخی علم میں توجہ اور وزن پیدا کرنے کے لیے لوگوں کی ضروریات ان امور کی طرف راغب کرنے کی ضرورت ہے، جو تاریخی سوچ کے لیے فیصلہ کن ہیں۔ابدال بیلا جب قاری کو عشقِ نبی ﷺ کے ثمرات گنواتے ہیں یا موجودہ زندگی کے معاشرتی مسائل کے حل کے لیے واقعاتِ سیرت سے رجوع کرتے ہیں تو ان کی تصنیف میں ان کا یہی انداز حاوی ہے۔ قاری کو مدحِ نبی پاک ﷺ کے ثمرات بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ "یہ ہو نہیں سکتا کہ کوئی مدحِ رسولِ آخر ﷺ لکھے اور آقا ﷺ کی نظرِ کرم سے اوجھل رہے۔"[9] اہلِ دنیا کو آقا ﷺ کا اصل مشن بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> آقا ﷺ کو زندگی بھر کے لیے خدائے واحد کی طرف سے کائنات کی ہر کومل کنی کی طرح ستاروں اور زمینوں کی ہر کھردری چبھتی نکر کو انسانیت کے لیے ایسے گول ملائم اور نرم خو کرنے کی ذمہ داری ملی ہوئی تھی کہ نوکیلی نوک کسی کی زبان، ہاتھ یا آنکھ کے بد راہ اشارے سے بھی نہ چبھے۔اللہ کی بنائی ہوئی ہر شے اپنے حسین تناسب میں رہے۔اوروں سے رواداری اور حسنِ اخلاق سے جیے اور جینے دے۔۔۔۔۔اسی خدائے مہربان کا پیغامِ فلاح اور درسِ محبت ہر ذی روح کے لیے ہے۔اسی مقدس پیغام کی ترویج اور تکمیل آقا ﷺ کا مشن تھا اور ہے۔[10]

حضرت سلمان فارسی جب آقا ﷺ کی تلاش میں مدینہ آئے تو آقا ﷺ کی پہچان کے لیے آپ ﷺ کی مہرِ نبوت کو دیکھنا چاہتے تھے۔اس زمانے میں جو بھی آپ ﷺ کا ذکر سن کے پہلی بار مدینے آتا، تو آپ ﷺ کی مہرِ نبوت سے ہی آپؐ کو پہچان کے آپؐ کی تصدیق کرتا تھا۔ مصنف حضرت سلمان فارسی کی کیفیت کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> آقا ﷺ سمجھ گئے، نووارد کیا چاہتا ہے۔آقا ﷺ نے کمر سے اپنی اوڑھی ہوئی چادر کا ایک پلو ہٹا دیا۔ پیچھے کھڑے پروانے کے حلق سے بلبلاتے بچے جیسی عجیب سی محبت بھری سسکیاں ابھریں۔آقا ﷺ کو محسوس ہوا کہ وہ آقا ﷺ کی طرف جھکا ہے۔اس کے ہاتھ سرسراتے ہوئے آقا ﷺ کے کندھوں کے پاس ادب سے چھونے نہ چھونے کے تذبذب میں جھولنے لگے۔ پھر اس کے ہونٹوں کا لمس آقا ﷺ کو عین اپنے کندھوں کے بیچ "مہرِ نبوت" پہ محسوس ہوا۔ ہونٹوں کے ساتھ نووارد کی آنکھوں سے نکلتے محبت کے سرمدی، بے قابو ہوئے خوش خصال بلند بخت آنسوؤں سے بھرا، اس کی روح میں خدا جانے کب سے ٹھہرا ہوا بادل، ایک دم سے سارے کا سارا نچڑ گیا۔ اس کے آنسوؤں نے آقا ﷺ کی کمر مبارک پر جل تھل کر دی۔آقا ﷺ نے کہا، "سامنے آؤ۔" نووارد سے مہرِ نبوی سے ہونٹ نہ اٹھائے جائیں۔اس کا جسم اکڑ گیا۔ گردن کے پٹھے ایک دوسرے پہ چڑھ گئے۔آنکھوں میں آنسوؤں کا دریا۔ حکم کی

تعمیل ضروری تھی۔ وہ مٹی پتھروں پہ گھٹنوں کے بل رینگتا ہوا عجب وارفتگی کے عالم میں جلے پروں والے پروانے کی طرح پھڑ پھڑاتا، روتا ہوا آقا ﷺ کے روبرو دوزانو ہو کے بیٹھ گیا۔ [۱۱]

مصنف کسی شخصیت کے بعض پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں تو ان کے الفاظ کے چناؤ سے ہی اُس شخصیت کا خاص تاثر پڑھنے والے کے ذہن میں خود ہی جلوہ گر ہو جاتا ہے۔ جب نبی کریم ﷺ کے اصحاب کا ذکر کرتے ہیں تو لہجہ احترام کا حامل ہوتا ہے، لیکن جب دشمنانِ اسلام کا ذکر کرتے ہیں تو ان کے لہجے سے ہی دشمنانِ اسلام سے ان کی نفرت محسوس کی جاسکتی ہے۔ ابو جہل کے ذکر پر مصنف نے اس کے حلیے کا جو نقشہ کھینچا ہے، اس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

> ابو جہل کے مکروہ چہرے پہ شیطان کے چہرے سے بھی غلیظ پھٹکار سرسرائی۔ اس کی تیز تیز ادھر ادھر کو تکتی سازشوں کو جنم دیتی آنکھوں میں اندھیرے کی پرچھائیاں ملیں۔ بات کرنے سے پہلے ہی اس کی تھرتھراتی نوکیلی زبان سے گندے تھوک کے چھینٹے اڑے۔ اس نے بیٹھے بیٹھے سرک کے اپنی جگہ بدلی۔ پھر ہر ایک کی طرف دیکھ کے رعونت سے اپنی داڑھی پہ ہاتھ پھیرا، اپنے گندے ہونٹوں پہ تیزی سے ہاتھ گھمایا اور آنکھیں نچا کے بولا۔۔۔ [۱۲]

آقا ﷺ کو اول سے آخر تک جذبات نگاری کا مرقع کہا جاسکتا ہے۔ مصنف نے اپنے انداز، طرزِ تحریر اور الفاظ کے چناؤ کے علاوہ اپنے تخیل سے بھی قاری کے جذبات کو ابھارنے کی کوشش کی ہے، لیکن بعض مقامات پر ان کی جذبات نگاری میں مبالغے کی اس حد تک آمیزش ہو جاتی ہے، جو قاری کے جذبات کو بوجھل کر دیتی ہے۔ سیرت جیسے اہم موضوع پر قلم اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ مصنف واقعات کے بیان میں صداقت اور خلوص سے کام لیں، محض اپنے تخیل کا سہارا نہ لیں۔ جذبات نگاری میں تخیل کی فراوانی سے بیان کا سارا حسن ماند پڑ جاتا ہے اور حقائق کے بیان پر مبالغے کا گماں ہوتا ہے، نیز اس سے تحریر کی تاثیر میں بھی کمی واقع ہو سکتی ہے۔

ترتیب(Arrangements):

آقا ﷺ کا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ مصنف نے اس تصنیف میں سیرتِ پاک کے واقعات زمانی ترتیب سے بیان کیے ہیں اور دستیاب شواہد کو کہانی کی طرح ترتیب وار بیان کیا ہے۔ مصنف نے اپنی تصنیف کو افسانے کی طرح مختلف اکائیوں کی صورت میں پیش کیا ہے اور ایک مربوط کہانی کی طرح یکجا بھی رکھا ہے۔ انہوں نے اپنی تصنیف کو مختلف ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ کبھی کبھی کسی باب کی آخری سطر کو اگلے باب کی ابتدا سے جوڑ دیتے ہیں۔ آقا ﷺ پر وحی کے ابتدائی زمانے میں کچھ عرصہ کے لیے وحی کا سلسلہ رکا تو آقا ﷺ اداس ہو گئے۔ باب کے آخر میں کہتے ہیں

کہ ''ہجر تو وصال کی شدت بڑھانے کے لیے ہوتا ہے۔آ قاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سیدنا جبرائیل علیہ السلام سے آتے خدا کے سندیس کا انتظار تھا۔ مقدس پریم پتر کا۔''[۵۳]

اپنی تصنیف میں تسلسل برقرار رکھنے کے لیے اگلے باب کا عنوان ہی "پریم پتر" ہے۔ جس میں آ قاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتظار کی کیفیت بتاتے ہیں۔ تقریباً ہر باب کی ابتدا میں وہ اگلے واقعے کی تمہید بیان کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر آقا ﷺ کتاب کے ایک باب کا عنوان "محفوظ کیے گئے قدم" ہے۔ اس باب کی ابتدا میں بتاتے ہیں کہ ''جن قدموں کو محفوظ کیا جاتا ہے، وہ بڑے نصیب والے ہوتے ہیں۔ جب ایسا ہوتا ہے تو وہ راستے بھی محفوظ ہو جاتے ہیں، جن پہ وہ قدم چلا کرتے تھے۔۔۔'' [۵۴]

اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ کے قدموں کا، حرم پاک میں خدائے بزرگ و برتر کی جانب سے محفوظ کیے جانے والے واقعے کی تفصیل کا بیان ہے۔ پہلی وحی کا ذکر کیا تو باب کا نام "غارِ حرا" رکھا۔ اس باب کی ابتدا میں بتاتے ہیں کہ:

> مکہ کے معزز اور صالح لوگوں میں رواج تھا کہ وہ اپنی سیانی عمر میں بچوں کی کمال تربیت اور پرورش کے بعد شہرِ مکہ سے نکل کے کبھی صحرا کی وسعتوں میں جا بسیرا لگاتے، کبھی مکہ کے گرداگرد کے چار پہاڑوں میں سے کسی پہ چڑھ کے، پہاڑ کی کسی غار میں ہفتوں، مہینوں کسی نکھری سوچ میں ڈوب کے زندگی کے اسرار سوچنے لگتے۔ وہ جانتے تھے کہ تمام تر جانے اور سیکھے علوم کا مغز اور اصل کشید کیا علم "سوچنا" ہے۔[۵۵]

مصنف کا یہ انداز ان کی پوری تصنیف میں نمایاں ہے۔

اسلوب(Style):

اسلوب کسی بھی مصنف کے ذہن کا عکاس ہوتا ہے۔ اسلوب لکھنے والے کی انفرادی کوشش ہوتی ہے، جس کی بنا پر اس کی تحریر کو دوسروں سے ممیز کیا جا سکتا ہے۔ تخلیق کار چاہنے کے باوجود بھی اپنی ذات کو اپنی تحریر سے الگ نہیں رکھ سکتا۔ قاری ادیب کے الفاظ کے ذریعے ہی اس کے ذہن تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اسلوب تخلیق کار ہی کا دوسرا نام ہے۔ اسے عام طور پر زبان کی زینت سمجھا جاتا ہے۔ یہ اظہار کی تکنیک ہے۔ زبان کی مخصوص خصوصیات اور لسانی امکانات میں انفرادی انتخاب کا نام طرز یا Style ہے۔ یہ کسی بھی تصنیف کی ہیئت اور اس کے مواد کے مابین توازن کا نام ہے۔ مناسب موقع پر مناسب الفاظ کا استعمال طرز یا اسلوب کہلاتا ہے۔

سیرت نگاری کا تجزیہ کرنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف دستیاب مواد میں سے مصنف کے ذاتی انتخاب میں دلچسپی لیں، بلکہ وہ وجوہات جاننے کی بھی کوشش کریں کہ مصنف کی طرف سے کوئی بھی مخصوص

ہیئت کیوں استعمال کی گئی ہے؟ کسی بھی سیرت نگار کے اسلوب کا تجزیہ کرنے کے لیے اس کے انتخاب، اس کی آواز، الفاظ، گفتگو کے انداز اور بیان و بدیع کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے فریم ورک کے اس حصے میں یہ جائزہ لینا مقصود ہے کہ:

۱۔ مصنف اپنی بات کو سمجھانے کے لیے کون سی ادبی تکنیکیں اور ادبی حربے استعمال کرتا ہے؟

۲۔ اس کے جملوں کی ساخت اس کے مفہوم کے ابلاغ میں کیا کردار ادا کر رہی ہے؟

۳۔ اس نے متن کو کس طریقے سے متاثر کن بنایا ہے؟

۴۔ یہ تصنیف قارئین کے لیے کس طرح یاد رکھے جانے کے قابل ہے؟

محقق نے آقاﷺ کے اسلوب میں مندرجہ بالا نکات کا جائزہ لینے کے لیے ڈیوڈ جولف کے تجویز کردہ تین نکات کو مدِ نظر رکھا ہے۔

۱۔ ڈکشن(Diction)

۲۔ نحویات(Syntax)

۳۔ ادبی حربے(Figurative devices)

ذیل میں ان اجزا کی وضاحت آقاﷺ کے تناظر میں پیش کی جا رہی ہے۔

۱۔ڈکشن(Diction):

کسی بھی مصنف کے الفاظ کا انتخاب اس کی شعوری اور غیر شعوری ترجیحات کا اظہار کرتا ہے۔ ڈکشن وہ الفاظ ہیں جو مصنف کسی خاص معنی کو بیان کرنے کے لیے منتخب کرتا ہے۔ کسی بھی تصنیف میں ڈکشن کا تجزیہ کرتے وقت مخصوص الفاظ اور ان کی ساخت دیکھی جاتی ہے۔ اس میں پورے جملے کا تجزیہ نہیں کیا جاتا۔ اس میں یہ جائزہ لیا جاتا ہے کہ کیا مصنف کے الفاظ کسی خاص جذبے مثلاً اداسی، خوشی، جوش، نفرت یا غصے وغیرہ کو ظاہر کرتے ہیں؟ موثر ڈکشن کی تشکیل ایسے الفاظ سے ہوتی ہے، جو واضح اور درست ہوں۔ ایک اچھے اور منجھے ہوئے مصنف کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنی بات میں مخصوص تاثر پیدا کرنے کے لیے الفاظ کے ذریعے حتمی رائے نہیں دیتا۔ اس کے بجائے وہ ایسے الفاظ کا استعمال کرتا ہے، جو خود ہی خاص تاثر قاری تک پہنچاتے ہیں۔ مصنف گویا پنے الفاظ کے ذریعے اپنے متن کی زبان تخلیق کرتا ہے۔

ڈیوڈ جولف نے کسی بھی تحریر کے اسلوب میں ڈکشن کا جائزہ لینے کے لیے زبان کے دو پہلوؤں رسمی زبان اور غیر رسمی زبان کی پرکھ بات کی ہے۔ ان کے خیال میں اسلوب کو جانچنے کے لیے مصنف کی زبان پہچاننا ضروری ہے، کہ

مصنف کی اپنی تصنیف میں زبان رسمی ہے یا غیر رسمی؟ رسمی زبان سنجیدہ تحریروں کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ یعنی ایسی تحریروں میں، جو تعلیمی، پیشہ ورانہ یا قانونی مقاصد کے لیے لکھی جائیں۔ رسمی زبان کو برتنے میں احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ رسمی زبان کے لیے درج ذیل نکات بطورِ خاص پیشِ نظر ہونے چاہییں:

١۔ زبان واضح، مثبت اور لغوی ہو۔ پیشہ ورانہ لہجے میں لمبے اور پیچیدہ جملے استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

٢۔ الفاظ کا انتخاب اور مصنف کا لہجہ موزوں ہو اور تکرار سے گریز کیا جائے۔

٣۔ جذباتی اظہار اور حتمی رائے دینے والے الفاظ سے اجتناب کیا جائے۔

٤۔ رموزِ اوقاف کا درست استعمال کیا جائے۔

٥۔ مخففات کے استعمال سے گریز کیا جائے۔

٦۔ زیادہ تر جملوں میں فعل مجہول استعمال کیا جاتا ہے۔[٦]

غیر رسمی زبان بے ساختہ ہوتی ہے۔ دوستوں یا خاندان وغیرہ کے ساتھ تحریری طور پر یا بات چیت کے دوران اور اکثر بیانیہ مضامین اور اخباری اداریوں وغیرہ میں استعمال ہوتی ہے۔ غیر رسمی زبان کے لیے درج ذیل نکات مدِ نظر رکھنا ضروری ہیں:

١۔ ان تحریروں میں جذباتی لہجہ استعمال کیا جا سکتا ہے۔

٢۔ مخففات استعمال کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔

٣۔ عام، مختصر اور آسان جملوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔

٤۔ زیادہ تر جملوں میں فعل معروف استعمال کیا جاتا ہے۔[٧]

آقاﷺ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ مصنف نے یہ تصنیف سیرتِ پاک ﷺ جیسے اہم اور سنجیدہ موضوع پر لکھی ہے، لیکن ان کی زبان غیر رسمی اور بے ساختہ ہے۔ انہوں نے اپنی تصنیف میں جذباتی زبان بھی استعمال کی ہے، جس کی مدد سے قاری کے جذبات کو اس حد تک ابھارنے کی کوشش کی ہے کہ ان کی تصنیف جذبات نگاری کا مرقع معلوم ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنی تصنیف میں الفاظ کو ان کے لغوی معنوں کے بجائے مجازی معنوں میں بھی استعمال کیا ہے اور اپنی عقیدت اور محبت کے اظہار کے لیے مخصوص الفاظ استعمال کیے ہیں۔ دراصل الفاظ اور معنی کا تعلق انتہائی پیچیدہ ہے اور اس کا تعلق معنیات (Sementic) کے شعبے سے ہے۔ الفاظ کے ایک ہی معنی نہیں ہوتے، بلکہ مسلسل بدلتے رہتے ہیں اور ہمیشہ سیاق وسباق کے مطابق ہوتے ہیں۔ کسی بھی لفظ کا کسی خاص سیاق و سباق میں استعمال، اس کے معنی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ للٰذا لفظ کے معنی کو سمجھنے کے لیے محض لغوی مفہوم سے آگاہ ہونا

ضروری نہیں، بلکہ لفظ کو جس سیاق و سباق میں استعمال کیا گیا ہو، اس سے واقف ہونا ضروری ہوتا ہے۔ گرامر کے ماہرین کے مطابق الفاظ دو طرح سے استعمال ہوتے ہیں۔ عابد علی عابد اپنی تصنیف، البیان میں لکھتے ہیں:

> کلمات والفاظ دو طرح استعمال ہوتے ہیں۔ ایک تو اپنے لغوی معنوں میں، یعنی لغت بتاتی ہے کہ یہ کلمات اور الفاظ کس معنی پر دلالت کرتے ہیں' اور ایک غیر لغوی یا غیر وضعی معانی میں 'یعنی لغت ان کے معنی پر دلالت نہیں کرتی۔ نہ وہ ان معانی کے لیے وضع ہوتے ہیں جن کے لیے وہ استعمال کیے جاتے ہیں' بلکہ ہم دلالتِ عقلی سے حکم لگاتے ہیں کہ سیاق و سباق پر غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس جملے میں بعض الفاظ اپنے لغوی معنی یا وضعی معنی میں استعمال نہیں کیے گئے۔ [۱۸]

ان الفاظ کو دلالت (Denotation) اور تعبیر (Connotation) سے موسوم کیا جاتا ہے۔ دلالت سے مراد کسی لفظ کی درست اور لغوی تعریف ہے، جو کسی بھی لغت میں پائی جاتی ہے۔ جب کہ تعبیر کسی بھی لفظ کا وہ مفہوم ہے جو اس کے سیاق و سباق سے متعین ہوتا ہے۔

آقاﷺ کے مصنف ابدال بیلا نے بھی مختلف جگہوں پر الفاظ کو ان کے لغوی معنوں کے بجائے مجازی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ بہت سے مقامات پر حضور اکرم ﷺ کے اصحاب کا ذکر کیا تو ان کا نام لینے کے بجائے لفظ "پروانہ" استعمال کیا اور آپ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ کے لیے "شمع" کا لفظ استعمال کیا۔ پروانہ چوں کہ شمع کا متوالا ہوتا ہے اور شمع کے روشن الاؤ کے سامنے اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، لیکن شمع کے معاملے میں اس کا شوق اور وارفتگی کم نہیں ہو پاتی۔ آقا ﷺ کے جان نثار ساتھیوں کے آقا ﷺ سے والہانہ عشق کی وجہ سے مصنف نے جب بھی کسی صحابی کی آپ ﷺ سے محبت کا ذکر کیا تو لفظ "پروانہ" ہی استعمال کیا۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

یہی مقام تو خانہ کعبہ سے ساڑھے سات سو کلو میٹر شمال مغرب میں مسجد تنعیم کے برابر میں جلے پروانے کی کہانی کا وقوعہ ہے۔ [۱۹]

شمع اپنے پروانے کی پرواز دیکھ چکی تھی۔ [۲۰]

احرام کی چادروں میں لپٹے پروانے اپنی شمع نور کے منتظر تھے۔ [۲۱]

گھاٹی میں موجود پروانوں میں عجیب طرح کی ہل چل ہوئی۔ [۲۲]

گھاٹی میں موجود ہر پروانے کا سر اپنی مقدس شمع پہ نثار ہونے کو اثبات میں ہل رہا تھا۔ [۲۳]

پروانوں کے ہجوم کے پر جیسے یک بار گی ایک ساتھ جلے۔ [۲۴]

پروانے، پروانوں کے پاس پہنچ چکے تھے۔ [۲۵]

کوئی پروانہ اینٹوں کے سانچے میں گندھی ریت مٹی میں ڈال کے اینٹوں کے بلاک بناتا۔ [۲۶]

ایک پروانہ آنکھوں میں چاند سجائے، آقاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پشت پہ نظریں گاڑے کھڑا تھا۔[۲۷]

ان مثالوں کے علاوہ بھی بہت سے الفاظ کو ان کے مجازی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

موت کو تسلیم کیے چہروں پہ زندگی کی لہر آئی۔[۲۸]

بغیر چراغ جلائے ہم دونوں میاں بیوی کی آنکھوں کے چراغ جل رہے تھے۔[۲۹]

اس کی آنکھوں میں ایکا ایکی خوشی کا پٹاخہ چلتا ہے۔ آنکھیں شدتِ جذبات سے ابل پڑتی ہیں۔[۳۰]

آقاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور سیدہ دونوں کی آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی تھے۔[۳۱]

آنکھوں میں بظاہر زندگی کا نور بجھتا محسوس ہوتا مگر خدا جانے کس آسمانی نور کو بلال کی آنکھیں بسا بیٹھی تھیں کہ اس کی آنکھوں کی بتیاں نہ بجھیں۔[۳۲]

چند گھڑی پہلے جو چراغ بجھانے والی آندھی بن کے نکلا تھا، اب وہ اسی چراغ کا پروانہ بنا جھکا کھڑا تھا۔[۳۳]

دوسرا ناک چڑھا کے آنکھوں میں طنز کا زہر بھر کے بولا۔[۳۴]

ابو جہل منہ پھاڑ کے ہنسا۔[۳۵]

پھولوں سے باتوں کی پتیاں سر سراتی تو سننے والوں کے دلوں پہ اثر پذیری کی بوندا باندی ہونے لگتی۔[۳۶]

نبض نبض ان کی شریانوں میں گونج رہی تھی۔[۳۷]

آسمان پہ چودھویں کا پورا چاند اپنی کروڑہا سال کی ساری چاندنی کا دودھیا نور بھرا دریا لیے آسمان سے اترا زمین پہ ننگے پاؤں رینگ رہا تھا۔[۳۸]

مکہ کے روساء کی معاشی زندگی کی شہ رگ یثرب تھا۔[۳۹]

نظروں سے اوجھل ہو جانے کے بعد بھی کتنی دیر تک وہ مبہوت ہوئی پتھر بنی اسی سمت دیکھے گئی۔[۴۰]

سیدنا سلمان فارسی کی آنکھوں کا دریا روتے روتے سمندر بن گیا۔[۴۱]

آقاﷺ میں درج بالا مثالوں کے علاوہ اور بھی بہت سی ایسی مثالیں تلاش کی جا سکتی ہیں جن میں مصنف نے اپنے جذبات و احساسات اور اثر انگیزی پیدا کرنے کے الفاظ کو ان کے لغوی معنی کے بجائے ان کے مجازی معنی میں استعمال کیا ہے۔

ابدال بیلا کے ہاں ہمیں لفظیات کے استعمال میں تنوع ملتا ہے۔ انہوں نے اپنی بات کی مکمل تفہیم کے لیے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جو ان کے خیال میں کسی بھی غیر جانب دار لفظ سے زیادہ قائل کرنے والے ہیں۔ کبھی تو ہندی زبان کے الفاظ کا سہارا لیا ہے تو کبھی اردو عبارت کی روانی میں انگریزی زبان کے ان الفاظ کا بے دریغ استعمال کیا

ہے، جو ہماری عام بول چال کا حصہ ہیں اور کبھی ایسے جذباتی الفاظ اپنی تحریر میں استعمال کیے ہیں، جن کو پڑھ کے فوراً قاری کے اندر الفاظ سے متعلقہ مثبت یا منفی جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ذیل میں آقاﷺ میں استعمال ہونے والے انگریزی الفاظ کی فہرست پیش کی جارہی ہے:

ریکی۔ماڈرن۔فزیکل فیچر۔کمانڈ۔ سیکورٹی انچارج۔ریسرچ۔ امبریو۔کراس چیک۔ہیپناٹائز۔ گارڈ آف آنر۔ فنگر پرنٹ،رٹ آف اتھارٹی۔انشورنس۔ کامن روم۔ ٹیلر میڈ۔آل کیئر۔فلیگ ٹیگ۔ سپر پاور۔ سروائیل۔ لاجسٹک۔ٹارگٹ کلنگ۔کمانڈ ہیڈ کواٹر۔سرپرائز۔ کمانڈ پوسٹ۔ کاؤنٹر اٹیک۔سائیکلوجیکل وار۔پروپیگنڈا سیل۔بیالوجیکل۔ان سیکوئر۔ کلچر۔ لیڈر۔ واک اوور۔ ریپڈ ڈیپلائمنٹ۔ گارنٹی۔ سیکرٹری۔پرائیویٹ چینلز۔ بریکنگ نیوز۔ایڈوانس۔مائنڈ سیٹ۔ باڈی گارڈ۔لمف نوڈ۔کیمسٹری۔ میڈیا۔کولڈ سپانجنگ وغیرہ۔

آقاﷺ میں استعمال ہونے والے ہندی الفاظ ملاحظہ ہوں:

ادیکار۔جنم بھومی۔بنتی۔پورن ماشی۔چانن۔چناؤتی۔پرانتی۔پرجاوغیرہ۔

انگریزی اور ہندی الفاظ کے علاوہ مصنف نے اپنی تصنیف میں الفاظ کے انتخاب میں اس بات کو خاص اہمیت دی ہے کہ ایسے الفاظ منتخب کیے جائیں جو قاری کے جذبات کو ابھارنے کا کام کر سکیں۔یہ جذبات خواہ محبت کے ہوں یا نفرت کے، مصنف الفاظ کے چناؤ سے قاری کے جذبات کو ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً قاری کے منفی جذبات ابھارنے کے لیے مصنف نے سوچ کو شیطانی، چہرے کو مکروہ، تک بندیوں کو غلیظ، آنکھوں کو سازشی، عورت کو زہریلی اور جسم کی جلد کو گندی کہا۔وغیرہ وغیرہ۔ان کے علاوہ بھی آقاﷺ سے ایسے الفاظ تلاش کیے جا سکتے ہیں جو منفی جذبات ابھارتے ہیں مثال کے طور پر درج ذیل الفاظ پیش کیے جا سکتے ہیں:

منحوس۔ وحشت۔ غضب۔ بے ڈول ۔موٹا۔ تندیل۔ بھینگا۔ جہنم۔۔ گرد آلود۔ گھناؤنی۔کٹھور۔ گستاخانہ۔ تھرڈلا۔ ذلیل ۔شوشہ۔بدحواس۔ بدخواہ۔خبیث۔ چھچھورا۔ چڑیل۔رعونت۔نخوت۔ حسد۔ چنگاریاں۔ ناپاک۔اول فول۔خشونت۔بدنیتی۔ناسور وغیرہ۔ان کے علاوہ اور کچھ الفاظ ایسے ہیں، جو قاری میں مثبت جذبات ابھارتے ہیں۔ مثلاً:

شمع۔ماہِ کامل(یہ دونوں الفاظ مصنف نے بہت بار نبی پاک ﷺ کی ذاتِ اقدس کے لیے استعمال کیے ہیں۔)چاندنی۔ پروانے۔اجلی روح۔شفاف۔لطیف۔شیریں وغیرہ۔

آقاﷺ میں جہاں الفاظ کے چناؤ سے تحریر میں تنوّع، زور اور جوش پیدا کیا گیا ہے، وہاں قاری کو اس تصنیف کے متن میں بہت سے مقامات پر غلط املا کے مسائل سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔مثال کے طور پر مصنف نے طلاق یافتہ

عورت کے لیے لفظ مطلقہ لکھنے کے بجائے صفحہ نمبر 804 پر متعلقہ لکھ دیا ہے۔[42] یہ لفظ متن کی عبارت سے بالکل مطابقت نہیں رکھتا۔ آقاﷺ کے متن سے غلط املا کی مزید مثالیں ملاحظہ ہوں:

کن فیکون کو "کن فیا کن" لکھا ہے۔[43]

مصنف کو "تیاریاں شروع ہو جاتیں"، لکھنا تھا، لیکن "تیاریاں شروع ہو جاتی" لکھا ہے۔[44]

دودھ دوہنے کو چار مقامات پر "دودھ دھونا" لکھا ہے۔[45]

آقاصلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پیروکاروں کو "پیرو قاروں" لکھا ہے۔[46]

بے ہودہ کو "بہودہ" لکھا ہے۔[47]

جن کی ننگی تلوار لکھنے کے بجائے "جنگ کی ننگی تلوار" لکھا ہے۔[48]

گلی کی نکڑ کو "نکر" لکھا ہے۔[49]

دو مقامات پر کسی بچے کے بجائے "کس بچے" لکھا ہے۔[50]

بھڑکنے کو "بڑھکنا" لکھا ہے۔[51]

جہالت کو "جہات" لکھ دیا ہے۔[52]

آقاﷺ میں مصنف نے واقعاتِ سیرت کو ادبی پیرائے میں بیان کر کے اپنی تصنیف کو ادبی تصانیف کی صف میں لا کھڑا کیا ہے، لیکن کسی ادبی تصنیف میں املا کی اغلاط سے مصنف کے بارے میں کچھ اچھا تاثر قائم نہیں ہوتا۔ کسی بھی ادیب کی تصنیف کی زبان اس کی اپنی ذات کی ترجمان ہوتی ہے، اس لیے ادبا کے لیے ضروری ہے کہ زبان و املا پر ان کی مکمل دسترس ہو، کیوں کہ املا کی اغلاط سے بعض اوقات متن کے معنی بھی بدل جاتے ہیں، جو قاری کے لیے الجھن کا باعث بن سکتے ہیں۔ آقاﷺ کے متن میں املا کی اغلاط مصنف کے غیر سنجیدہ رویے کا ثبوت ہیں۔

نحویات(Syntax):

سادہ الفاظ میں علمِ نحو جملے کی ساخت ہے۔ یہ لسانیات کا وہ حصہ ہے جس میں جملوں کی ساخت اور تشکیل کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کسی بھی جملے کا تجزیہ کرنے کا ایک منظم طریقہ ہوتا ہے۔ اس تجزیے میں جملے کے تمام عناصر یا اجزا کو ٹکڑوں میں توڑ کر فعل، فاعل، مفعول اور صفت وغیرہ میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ کسی بھی جملے کی تمام تہوں کو نمایاں کیا جاتا ہے اور جملے میں ان کے مقام کا تعین کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ نحویات ہی ادب بناتا ہے نہ کہ الفاظ۔ یعنی الفاظ کی نحوی ترتیب جملے کو حسن بخشتی ہے۔ جملوں کی ساخت میں تنوّع کے ذریعے مصنفین اپنی تحریر میں جذبات اور زور پیدا کرتے

ہیں اور متن میں کسی خاص معنی کو آگے بڑھانے کے ساتھ ساتھ کسی خاص حوالے سے جذبات کو ابھارنے کے لیے جملے کے مختلف ڈھانچے استعمال کرتے ہیں۔ نحویات کے مطالعے سے مصنف کے لہجے کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔[53]

ڈیوڈ جولف نے اپنے فریم ورک میں کسی بھی تصنیف میں جملوں کی اقسام، تنوّع اور ترتیب کا جائزہ لینے کے لیے درج ذیل نکات بتائے ہیں:

۱۔ فعال جملے/طورِ معروف(Active Voice)

۲۔ غیر فعال جملے/طورِ مجہول(Passive Voice)

۳۔ جملوں میں حروفِ عطف کا تواتر سے استعمال(Polysyndenton)

۴۔ غیر معطوف جملے(Asyndeton)

ذیل میں ان نکات کی وضاحت پیش کی جارہی ہے اور ان کی روشنی میں آقاﷺ کے جملوں کی اقسام اور جملوں کی ترتیب کا جائزہ لیا جارہا ہے۔

آقاﷺ میں جملوں کی اقسام، تنوّع اور ان کی ترتیب کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اپنی نثر میں طویل جملے بھی استعمال کیے ہیں اور مختصر جملے بھی۔ ان جملوں میں مصنف نے رموزِ اوقاف کی علامتوں کے ذریعے جملوں کو ایک دوسرے سے الگ کیا ہے اور ان میں تنوّع پیدا کیا ہے۔ ذیل میں آقاﷺ کے متن میں جملوں کی نحوی ترکیب کا تنقیدی تجزیہ پیش کیا جارہا ہے، تاکہ دیکھا جائے کہ مصنف نے کس طرح کے جملے استعمال کیے ہیں؟ ان کی عبارتوں میں یہ نحوی ترکیب کیسے کام کرتی ہے؟ کیا اثر پیدا کرتی ہے؟

فعال جملے/طورِ معروف(Active Voice):

مصنف کی طرف سے فعال جملے اس وقت ادا کیے جاتے ہیں، جب فاعل کسی بھی حوالے سے مفعول کو متاثر کرتا ہے۔ عام طور پر یہ جملے پیچیدہ ہونے کے بجائے مختصر ہوتے ہیں۔ ان جملوں میں فاعل معلوم ہوتا ہے، اس لیے یہ جملے واضح اور قاری کے لیے آسان فہم ہوتے ہیں۔ اگر ان جملوں کی درست نحوی ترتیب کا خیال رکھا جائے، تو ان جملوں سے تحریر زیادہ جامع ہو سکتی ہے۔[۵۴]

آقاﷺ میں بھی مصنف نے اپنی تحریر کو زیادہ موثر اور جامع بنانے کے لیے فعال جملے استعمال کیے ہیں۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

سوا مہینے کی دھول یک لخت ان کے چہرے سے سرک گئی۔[۵۵]

وہ سسکتی ہرنی کی طرح گھبرائی ہوئی دوڑتی پھرنے لگیں۔[۵۶]

پتھر ادب سے دوہرا ہو کے ان کے پیروں میں سمٹ گیا۔[۵۷]

سیدنا عبدالمطلب اپنا بچھونا پھر حطیم کے اندر بچھا کے بیٹھ گئے۔[۵۸]

سیدنا نے تلوار نکال کے چاروں طرف لہرائی۔[۵۹]

غلامی ہر آقا کو جیت لیتی ہے۔[۶۰]

خدا نے اپنا حرم بناتے سمے کبھی ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کو فرشتوں کے ہاتھ بھیجی ہوا سے لکیر بنوائی تھی۔[۶۱]

مسلمانوں کو بھی ترغیب دی کہ اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کرو۔[۶۲]

آقاﷺ میں استعمال کیے گئے فعال جملوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے ان جملوں میں سے کچھ کی بنت میں فاعل کی نشان دہی کروائے بغیر جملے کو مکمل کیا ہے۔ اپنی تحریر میں مصنف نے جملوں کے تنوّع سے یکسانیت سے بچنے کی کوشش کی ہے۔

غیر فعال جملے/ طورِ مجہول(Passive Voice):

یہ جملے اس وقت ادا کیے جاتے ہیں جب فاعل معلوم نہ ہو یا خاص طور پر اس کا ذکر نہ کیا جائے۔[۶۳] جب کسی جملے میں عامل کے حوالے کے بغیر کوئی بات کہی جائے یا عامل کو وہ مقام ملے جو مفعول معمول کے لیے مختص ہے، تو ایسے جملے کو مجہول جملہ کہتے ہیں۔ ان جملوں میں فعل اپنی ہیئت بدل کر صیغہ معروف سے صیغہ مجہول میں آ جاتا ہے۔[۶۴] ان جملوں کے لیے عام طور پر زیادہ الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے۔ عام طور پر ان جملوں کا ڈھانچہ پیچیدہ ہوتا ہے۔ چوں کہ ان جملوں میں فاعل کا ذکر نہیں ہوتا، اس لیے قاری فوری طور پر یہ سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے کہ فعل سرانجام کون دے رہا ہے۔ مجہول جملوں کی نحوی ترتیب میں ذرا سی غلطی بھی ان جملوں کو مبہم بنا سکتی ہے۔[۶۵]

ذیل میں آقاﷺ سے غیر فعال جملوں کی چند مثالیں پیش کی جا رہی ہیں:

اسی راستے سے دو اونٹوں پر سوار ہو کے وہ میاں بیوی اپنے ایک شیر خوار بچے کو لیے ہوئے ادھر لائے گئے تھے۔[۶۶]

ان کا گھر سکون اور خوشیوں سے بھر دیا گیا۔[۶۷]

عالم بشریت میں رسول ﷺ کو کائنات کی ہر تخلیق کا آقا ﷺ بنا کے بھیجا گیا تھا۔[۶۸]

جہاں تک کوئی نبی، کوئی رسول پہلے کبھی نہ گیا، وہاں آقا ﷺ کو نوازا گیا۔[۶۹]

آقا ﷺ کے جسم اقدس کو اسی کنویں کے پانی سے آخری غسل دیا گیا۔[۷۰]

آج یہ تینوں کنویں وقت کے ہاتھوں گم کر دیے گئے ہیں۔[۷۱]

اس کا فدیہ واپس کر دیا گیا۔[۷۲]

گردن کا پھندا کھینچ دیا گیا۔ [۷۳]

ان جملوں میں دیکھا جا سکتا ہے کہ معمول کی نمائندگی ہو رہی ہے۔ اس لیے یہاں فاعل عامل کے بجائے فاعل معمول کی بات ہوئی ہے۔

جملوں میں حروفِ عطف کا تواتر سے استعمال(Polysyndenton):

"جو حروف دو الفاظ کو جوڑیں یا دو سے زائد مرکب یا پیچیدہ جملوں کو جوڑیں، حروفِ عطف کہلاتے ہیں۔" [۷۴] اور، بھی، لیکن، اس لیے، تاکہ، پھر بھی، سو، پس، تو، پھر، بلکہ وغیرہ حروفِ عطف کی مثالیں ہیں۔

جملوں میں ادبی اثر حاصل کرنے کے لیے یکے بعد دیگرے کئی ایسے الفاظ کا استعمال کیے جاتے ہیں، جو جملے کے مختلف حصوں کو آپس میں جوڑ سکیں۔ جملے کے مختلف حصوں کو جوڑنے کے لیے علامتِ سکتہ بھی برتی جا سکتی ہے، خواہ یہ وقفہ تال اور آہنگ میں ہو یا جملے کی لمبائی میں یا پھر جملے کے پہلے یا آخری لفظ میں ہو۔ اردو قواعد میں ایسے جملوں کو مرکب جملے اور پیچیدہ جملے بھی کہا جاتا ہے۔ جب دو یا دو سے زیادہ جملے کسی ایک خیال یا مفہوم کو ادا کریں تو وہ مرکب جملہ کہلائے گا۔ [۷۵] جب کہ پیچیدہ جملہ وہ جملہ ہوتا ہے جس میں دو یا دو سے زیادہ فقروں میں ایک فقرہ تو معنوی سطح پر آزاد ہو اور باقی فقرے ساخت کے اعتبار سے اس کے تابع ہوں۔

آقاﷺ میں بھی بہت سے ایسے جملوں کا استعمال ملتا ہے، جن میں حروفِ عطف کا استعمال کیا گیا ہے۔ ان میں سے کچھ تو مرکب جملے ہیں اور کچھ پیچیدہ جملے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل جملے ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں:

> اپنا سگا باپ اور اس کی سیاہ چھوڑ کے تلوار اٹھائے اٹھائے سہیل بن عمرو کا وہ جری، جوان اور جانثار بیٹا، اپنا قبیلہ، اپنی قوم، اپنی ہر پہچان، چھوڑ کے عین میدان میں نا ماننے والوں کی صفیں توڑ کے اپنے ماننے والوں، سلامتی والوں، مسلمانوں میں آ گیا۔ [76]

مندرجہ بالا جملے میں حروف عطف کے علاوہ الفاظ کی تکرار سے زور اور جوش پیدا کیا ہے۔

- پہاڑ ہو وہ، بیابان ہو، جنگل ہو، صحرا ہو، سمندر ہو، دریا ہو، ندی نالہ ہو، ہوا ہو، بادل ہو، بارش ہو، کوئی ذی روح ہو، کوئی بھی شے ہو، ہر چیز اس کے ہی ارادے سے بندھی ہے۔ [77]
- ایک دوسرے کو آوازیں دے دے کے بلاتے، مسکراتے، دل کی کلیوں کے پھول بناتے، روحوں کو مہکاتے وہ "قبا" کی کنی پہ آ گئے۔ [78]
- جلدی باہر تشریف لائے اور اپنی اونٹنی قصویٰ پہ سوار ہوئے اور مہاجرین اور انصار کے جلو میں خدا کے گھر مسجد حرام تشریف لائے۔ [79]
- ان سب خدائی شانوں میں ان کی انفرادی، ذاتی صلاحیت جو لوگوں کے علم میں ہوتی جنہوں نے انہیں پیدا ہونے کے بعد اپنی بستی میں ایک ایک دن بڑا ہوتے اور زندگی جیتے دیکھا تھا، ویسی کوئی سند نہ بتائی گئی۔ [80]

- کیا مکے کے ہم اشرافیہ اتنے گئے گزرے ہو گئے ہیں، اتنے مفلس ہو گئے کہ ہمارے لیے اس نے ایک واحد خدا، اللہ چنا۔[81]
- آ قاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیغامِ خدا میں جہاں مکے کے مساکین اور غلاموں کے لیے ایک حیرت انگیز کشش تھی، وہیں مکہ کے شرفا میں سے سلیم الفطرت نیک سیرت، سچے اور نکھرے روحوں والے لوگوں کو بھی ایک ذہنی ہم آہنگی بھری توجہ اور انسانیت کے اعلیٰ ترین معیار کے حصول کا راستہ ملا اور وہ آقاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیغام پہ لبیک کہنے لگے۔[82]
- ایسے میں مکہ کے غصیلے لوگوں میں ایک سب سے غصیلا شخص عمر بن خطاب غصے سے اپنے ہوش کھو بیٹھا، ساچھ فٹ کے اس اونچے مضبوط ستائیس سالہ نوجوان کے من میں جب کوئی خیال آ کے بس جاتا تو پھر اسے کوئی نہ نکال سکتا تھا۔[83]
- ابنِ اسحاق اور ابنِ کثیر لکھتے ہیں کہ:

جب سیدنا ابو طالب کو قریش کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہ حملے کا خطرہ پیدا ہوا تو آپ نے ایک قصیدہ لامیہ کہا، جس میں حرم مکہ کے ساتھ پناہ مانگی اور قوم کے روسا کے ساتھ دوستی اور گلے شکوے کا اظہار کرتے ہوئے یہ صاف واضح کر دیا کہ کسی طرح کا بھی چیلنج ہو، قیمت خواہ کچھ بھی دینا پڑے، وہ اپنی آخری سانس تک رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تحفظ کریں گے اور کبھی ان کی مدد اور نصرت سے دست بردار نہیں ہوں گے۔[84]

- پہلا صدمہ آقاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پچاس سال کی اس عمر میں اپنے اس عظیم سرپرست محبی چچا سیدنا ابو طالب کی وفات کی صورت میں جھیلنا پڑا، جنھوں نے بیالیس سال آقاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگہداشت، سرپرستی، فداکاری ایسے انداز سے کی کہ نبوت کے اعلان کے بعد بھی دس سال ان کی زیر سرپرستی قریش کے کسی بد خواہ، بد طینت دشمن کو آقاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بال بھی بیکا کرنے کی ہمت نہ پڑی۔[85]
- شعب ابی طالب میں سیدنا ابو طالب کو اپنے بھتیجے کی سلامتی اور زندگی کی اتنی فکر رہتی تھی کہ رات کو سونے کے وقت وہ اپنے کنبے کے سب لوگوں کو سلا کے رات کے پہلے پہر آقاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پہ آتے اور چپکے سے آقاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پہ کبھی اپنے بیٹے علی کو، کبھی عقیل کو سلا دیتے، کبھی خود اس بستر پہ سو جاتے اور آقاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دوسرے بستر پہ لٹا جاتے، پھر رات کے دوسرے پہر ان کا بستر بدلتے، ایک رات میں تین تین بار وہ آقاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بستر بدلتے۔[86]
- کسی کو کیا پتہ، زندگی کے اس دردناک ترین لمحے میں آقاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ دعا ہمارے برصغیر پاک و ہند میں بعد میں آنے والے مسلمانوں کے لیے مانگی ہو، جہاں کچھ سالوں بعد اسی بستی کے لوگوں کے ایک نوجوان فرزند محمد بن قاسم نے دیبل کو فتح کر کے پاک و ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں کے لیے فلاح کا دروازہ کھولنا تھا، وہ خوش بخت جواں جرنیل بد بخت اہل طائف کے ثقفی سرداروں کا بیٹا تھا۔[87]
- آقاصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو زندگی بھر کے لیے خدائے واحد کی طرف سے کائنات کی ہر کومل کنی کی طرح، ستاروں اور زمینوں کی ہر کھردری چبھتی نکر کو انسانیت کے لیے ایسے گول، ملائم اور نرم خو کرنے کی ذمہ داری ملی ہوئی تھی کہ کوئی نوکیلی نوک کسی کی زبان، ہاتھ یا آنکھ کے بد راہ اشارے سے بھی نہ چبھے۔[88]

مندرجہ بالا جملوں کے اقتباس کے علاوہ آقاصلی اللہ علیہ وسلم میں ایسے جملوں کی اور بھی بہت سی مثالیں پیش کی سکتی ہیں۔ان جملوں میں دیکھا جا سکتا ہے کہ ان میں سے کچھ جملے بہت زیادہ ہی طویل ہیں۔ مصنف نے ان جملوں میں حروفِ عطف کے استعمال سے طویل جملوں میں وقفہ پیدا کیا ہے اور جملوں کے مفہوم پر توجہ مرکوز کرنے کی کوشش

کی ہے۔ لیکن مصنف نے ان میں بہت کم حروفِ عطف کا استعمال کیا ہے حتیٰ کہ علامتِ سکتہ کے علاوہ رموزِ او قاف کی دوسری علامتیں بھی بہت کم استعمال کی ہیں۔ مندرجہ بالا تمام جملوں میں مخصوص الفاظ پر زور دینے کے لیے اور جملے کے کسی حصے کو پر جوش بنانے کے لیے وقفے کے لیے زیادہ تر صرف علامتِ سکتہ (،) کا استعمال کیا گیا ہے، جو کہ ذرا سے توقف کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ بہت کم حروفِ عطف کے استعمال سے جملے زیادہ پیچیدہ اور مبہم ہو گئے ہیں، ان کی تفہیم میں بعض اوقات دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

غیر معطوف جملے(Asyndeton):

اس کا مطلب ہے کہ جملے میں حروفِ عطف کو چھوڑ دیا جائے، لیکن جملے کی درستی کو برقرار رکھا جائے اور مربوط جملے ادا کیے جائیں۔ حروفِ عطف مثلاً "اور"، "یا"، "لیکن" وغیرہ جیسی علامتوں کے استعمال کے بغیر جملہ مکمل کیا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی تکنیک ہے، جس سے پورے فقرے کے مضمر مفہوم کو مختصر کرنے اور اسے مستقل شکل میں پیش کرنے میں مدد ملتی ہے۔ غیر معطوف جملوں میں جو مختلف افعال یا واقعات بیان کیے جاتے ہیں، وہ لگاتار اور مکمل ہوتے ہیں اور بے ساختہ ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوتے ہیں۔ ان جملوں کی مدد سے تحریر کی روانی کو برقرار رکھا جاسکتا ہے اور بات کو مؤثر بنانے کے لیے اس میں وزن یا زور پیدا کیا جاسکتا ہے۔[89]

ذیل میں آقاﷺ سے غیر معطوف جملوں کی مثالیں پیش کی جارہی ہیں:

- چاروں رئیسوں کے غلام کعبے کی دیواروں کے پاس ننگ دھڑنگ میلے اپنے بوسیدہ شکستہ جسموں پہ اونٹ کی اون سے بنی کھدر کی لونگیاں پہنے اپنے اپنے آقاؤں کی ایک ایک جنبش آنکھ پہ ٹکٹکی لگائے پنجوں کے بل ادب سے کھڑے تھے۔[۹۰]
- سیدنا ابو طالب کی آزمائش اس وقت شروع ہوئی جب آقاﷺ پہ اترے ہوئے آسمانی پیغامِ حق کے ردِ عمل میں قریش کے روسانے دشمنی دکھائی۔[۹۱]
- صدیوں سے انتظار میں کھڑی چٹیل پتھریلی چٹانیں جس لمحے کی راہ تکتے تکتے خاک رنگ خاکستری ہو گئی تھیں۔[۹۲]
- جب وہ واپسی کے لیے اپنے خیموں میں تیار ہو رہے تھے تو قریش کے کئی ستمگر بے وفا قریش قرابت دار سرداران کے خیموں میں پہنچ گئے۔[۹۳]
- آج سر جھکائے عجیب سکون وانبساط سے ایک نئی انسانی تہذیب میں بھائی چارے کی محبت میں لبریز ایک دوسرے کے دست و بازو بنے ہوئے تھے۔[۹۴]
- آقاﷺ نے اسی لیے اسلام کی پہلی اذان کے لفظ سیدنا بلال بن رباح کے انہی ہونٹوں سے ادا کرائے جنہوں نے زندگی اور موت کے دوراہے پہ اپنی تمام تر سانسوں بھری زندگی سے بے نیاز ہو کے خدا کی عظمت منوائی تھی۔[۹۵]

آقاﷺ کے مصنف نے اس تکنیک کی مدد سے جملوں کو بغیر کسی وقفے کے مکمل کیا ہے۔ زیادہ تر جملے بغیر کسی علامت کے ہیں۔

آقاﷺ کے جملوں کی ترتیب اور ترکیب کے مطالعے سے جہاں مصنف کے استعمال کیے گئے طویل، مختصر، فعال، غیر فعال، حروفِ عطف والے اور غیر معطوف جملوں کی اقسام اور ان کے ادبی اثرات کا پتا چلتا ہے، وہیں کچھ جملوں میں ان کی نحوی ترتیب بدل کر عام بول چال کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ جملہ ملاحظہ ہو:

سوچا آقاﷺ نے کچھ اور حل ہونا چاہیے۔[96]

شام سے یمن کی طرف آتے تو پھر راہ وہی۔[97]

اڑھائی لاکھ اشرفی دینار کی سالانہ تجارت تھی اس راستے میں۔[98]

جانا سب کو مدینہ تھا۔[99]

دخل نہیں دیا اس کی کسی بات میں۔[100]

ہر قبیلے سے محافظ لیے گئے تھے قافلے کے لیے۔[101]

کسی سے کہنا نہ۔[102]

ابھی دو شریر قبیلے باقی تھے مدینے میں۔[103]

مسلمانوں کا وہ دشمن تھا۔[104]

صدیوں سے چلی آئی ریت ہے یہ۔[105]

قدم قدم بڑھنے کی بھی طاقت نہ رہی ان میں۔[106]

غلط رموزِ اوقاف کا استعمال بھی ملتا ہے۔ غلط رموزِ اوقاف کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

جیسے جیسے بندے بندے کا نصیب ہوتا ہے۔ ایسے ہی جگہ جگہ کی بھی اپنی تقدیر ہوتی ہے۔[107]

اس جملے کے پہلے حصے میں علامتِ ختمہ کے باجود جملے کو جاری رکھا گیا ہے۔ مصنف کو اس جملے میں ختمے کی جگہ سکتے کی علامت استعمال کرنی چاہیے تھی، تاکہ جملے کی خوب صورتی برقرار رہتی۔

ایک اور مثال دیکھیے:

ان کے دائیں طرف، بائیں طرف، آگے، پیچھے، ہر طرف، ہمارا بچہ بچہ کٹ کے مرے گا۔ مارے گا، مگر کسی کو محمد بن عبداللہ کی طرف میلی آنکھ سے نہ دیکھنے دے گا۔[108]

مندرجہ بالا جملے میں بھی ختمے کی علامت کا استعمال غلط ہے۔

۔۔۔ان کا ہم شہری ان کے پاس آیا۔ اور بولا۔[109]

اس جملے میں لفظ "آیا" کے بعد ختمہ ہے اور اس کے بعد حرفِ عطف "اور" ہے۔ جملے میں حرف عطف سے پہلے ختمہ نہیں لگایا جاتا۔

۔۔۔۔ساتھ ساتھ جوڑ کے پتھر رکھے۔پھر گارے مٹی سے بھری کنالیاں ان پہ گرتی رہیں۔[۱۱۰]

اس جملے میں بھی حرف عطف "پھر" سے پہلے ختمہ لگایا ہے۔

بنو جر ہم نے ہار مان لی۔اور نکل گئے۔[۱۱۱]

حرف عطف سے پہلے ختمہ لگایا ہے۔

مگر دیکھو بد عہدی نہ کرنا۔[۱۱۲]

اس جملے میں "دیکھو" حرفِ ندائیہ ہے۔اس کے ساتھ علامتِ ندائیہ آنی چاہیے تھی۔

کئی بار ہمیں اندازہ ہوا جیسے یتیم قریشی بچے کی والدہ، انعام واکرام دے کر شکریے کے ساتھ ہمیں رخصت ہونے کا اشارہ کر رہی ہیں۔ مگر میں مسلسل یتیم قریشی بچے کی والدہ کی منتیں کرتی رہی، کہ بچے کو کچھ دیر اور ہمارے پاس رہنے دیں۔[۱۱۳]

مندرجہ بالا جملے میں بھی حرفِ عطف "مگر" سے پہلے ختمہ لگایا گیا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ رموزِ اوقاف کا استعمال تحریر میں حسن اور نکھار پیدا کرنے کے لیے اور ابلاغ کے ایک مؤثر ذریعے کے طور پر کیا جاتا ہے،تاکہ تحریر سمجھنے کے قابل ہو سکے اور اس کی خوب صورتی میں اضافہ ہو۔غلط رموزِ اوقاف سے نہ صرف تصنیف کا ادبی معیار کم ہوتا ہے، بلکہ قاری کو بھی ذہنی کوفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ادبی حربے(Figurative devices):

ادبی حربہ ، ادب یا کسی خاص ادبی کام کا کوئی مخصوص پہلو ہے جسے ہم پہچان سکتے ہیں ،شناخت کر سکتے ہیں، تشریح کر سکتے ہیں اور تجزیہ کر سکتے ہیں۔ادبی عناصر اور ادبی تکنیکیں دونوں ہی ادبی حربے کہلاتے ہیں۔ادبی تکنیکیں زبان کی مخصوص تعمیرات ہیں جو مصنف اپنی تصنیف میں معنی ظاہر کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ایک مصنف،ادبی تکنیک کا استعمال عام طور پر ایک لفظ، فقرے، یا پھر مختلف الفاظ اور فقرات کے ساتھ کرتا ہے۔ مصنف ان تکنیکوں کو متن کے کسی ایک ہی نقطے پر بھی استعمال کرتا ہے۔ادبی عناصر کے برعکس، ہر متن میں ادبی تکنیک کا موجود ہونا ضروری نہیں۔ڈیوڈ جولف نے کسی بھی متن میں زبان اور حربوں کے تجزیے کے لیے درج ذیل تکنیکیں پیش کی ہیں:

۱۔ امیجری(Imagery)

۲۔ تلمیح(Allusion)

۳۔ تکرار(Repetition)

۴۔ مبالغہ(Hyperbole)

۵۔ تشبیہ(Similes)

۶۔ استعارہ(Metaphor)

۷۔ بیان میں سوالات(Rhetorical Question)

ذیل میں ان تکنیکوں کی وضاحت پیش کی جارہی ہے اور ان کی روشنی میں آقاﷺ کے اسلوب کا جائزہ لیا جارہا ہے۔

امیجری(Imagery):

امیجری متن میں استعمال ہونے والی مؤثر ترین تکنیکوں میں سے ایک ہے۔ یہ قاری کے لیے ان تاثرات اور خیالات کی وضاحت کرتی ہے، جن کی نمائندگی مصنف کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مصنف امیجری کے ذریعے الفاظ اور فقروں کا بخوبی استعمال کر کے اپنی ذہنی تصویر کو قاری کے لیے قابلِ فہم بناتا ہے اور پیچیدہ خیالات اور تجربات قاری تک پہنچانے کے لیے اس حربے کو ایک ذریعے کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ مصنفین اپنے متن کے مزاج کو ترتیب دینے کے لیے اس تکنیک کو استعمال کرتے ہیں۔اس کی مدد سے جو احساس اور کیفیت پیدا کرتے ہیں، قاری سے امید کرتے ہیں کہ وہ بھی اس احساس کو اسی طرح محسوس کریں۔اس تکنیک سے قارئین کو متن کے کرداروں سے جڑنے اور ان کے بارے میں مزید جاننے مدد ملتی ہے۔ امیجری مصنف کی وہ زبان ہے، جو قاری کے حواسِ خمسہ (بصری، لمس پذیر، سمعی، شامی اور ذائقے کی حس) میں سے کسی ایک کو ابھارتی ہے، کیوں کہ امیجری میں یہ حواس شامل ہوتے ہیں۔ [۱۱۳]

مصنف نے اپنی تصیف میں اپنے خیالات، جذبات اور احساسات کو قاری تک پہنچانے کے لیے اس تکنیک سے بہت کام لیا ہے۔چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

آقاﷺ کے غلام حضرت زید رضی اللہ عنہ کے والد اور چچا کو ان کی بابت پتا چلا کہ وہ نبی پاکﷺ کے پاس ہیں، تو وہ انہیں لینے آئے۔ مصنف اس واقعے کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

> زید کے والد اور چچا اٹھتے اٹھتے وہیں اپنے کھلے بازوؤں میں زید کو لپیٹے اور ہاتھوں میں میٹھے مشروب کے پیالے پکڑے ایک لمحے کے لیے ہوا میں منجمد ہوئے، زید کے چہرے پہ بدلتے ہوئے رنگ کو ٹکٹکی لگا کے تکتے ہیں، زید بڑی محبت اور عقیدت سے اپنے باپ اور چچا کو جی بھر کے دیکھتا ہے اور پھر ادب سے سر جھکا کے آقاﷺ کے سامنے دوزانو ہو کے بیٹھ کے کپکپانے لگتا ہے۔اس کے ہونٹوں پہ آئی بات کہی نہیں جاتی۔کچھ دیر تک اس کے ہونٹ تھرتھراتے رہتے ہیں۔اس کی آنکھوں سے دو آنسو بھی ڈھلک کے ہونٹوں پہ لرزنے لگتے ہیں اور وہ آقاﷺ کے گھٹنے پکڑ کر

ان پہ ماتھا رکھ کے بلبلا کے بول پڑتا ہے۔ آقاﷺ میں نے آپ کے پاس رہنا ہے۔ میں نے کہیں نہیں جانا۔ آقاﷺ مجھے دور نہ کیجیے گا۔[۱۱۵]

مندرجہ بالا اقتباس میں مصنف نے امیجری کی تکنیک سے مطلوبہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں امیجری کی ایک سے زیادہ قسموں کا استعمال ملتا ہے۔ ایک تو بصری امیجری استعمال ہوئی ہے۔ مصنف کا انداز ایسا ہے، جیسے پورا واقعہ قاری کی آنکھوں کے سامنے بیت رہا ہو۔ مصنف نے ان کی جس کپکپاہٹ کا ذکر کیا ہے، قاری حضرت زید رضی اللہ عنہ کی اس کپکپاہٹ اور جذباتی کیفیت کو محسوس کر سکتا ہے۔ میٹھے مشروب کا ذکر کر کے قاری کی ذائقے کی حس کو ابھارا گیا ہے۔ حضرت زید کے بول پڑنے کے بعد ان کے کہے الفاظ کی گونج قاری کو بھی سنائی دیتی ہے۔ یعنی سمعی امیجری کا استعمال بھی ملتا ہے۔

غارِ حرا کے ذکر میں بھی امیجری کے ذریعے، مصنف اپنے جذبات اور تجربات قاری تک پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لکھتے ہیں:

اس درز کے ننگے پتھر آج بھی وہیں ہیں۔ ویسے ہی ہیں۔ جیسے آقاﷺ کے زمانے میں تھے۔ ان پتھروں کی درز سے یوں پھسلتے ہوئے گمان ہوتا ہے جیسے پتھر کی قبر کی درز سے پھسل کے مردہ جسم لحد میں اترتا ہے۔ ان مقدس پتھروں کا لمس بہت متبرک ہے۔ وہ لمس وہی ہے جو پندرہ سو سال پہلے آقاﷺ کے مقدس جسم کو سر سے پیر تک چھو کے آج تک معطر ہوا ہوا ہے۔ اس پتھر کی درز سے گزرتے ہوئے عجیب احساس روح میں جاگتا ہے کہ جن پتھروں نے آقاﷺ کو چھوا تھا وہی آج ہمیں چھو رہے ہیں اور اس قربت بھرے انداز میں اس درز سے گزر کے پتھر کی سلوں کے صحن میں پہلا قدم چل کے کعبہ کے رخ پہ مغرب میں غارِ حرا کی تکونی غار ہے۔[۱۱۶]

مصنف نے لمس کا احساس قاری کے اندر، لمس پذیر امیجری کے ذریعے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جنگ بدر میں کفار کو بری طرح شکست ہوئی، جب یہ خبر مکے کے لوگوں تک پہنچی تو ان کے لیے یقین کرنا مشکل تھا۔ مصنف نے ان کے اس تحیر کو اس طرح بیان کیا:

مکہ کی ہاری ہوئی فوج تتر بتر ہوئی، شرمندہ حزن و ملال سے بھری، بے بس ہوئی چوروں کی طرح چھپ چھپا کے منہ لپیٹے اپنے گھروں کی طرف جانے سے بھی گریزاں۔ پہلا شخص جو مکے والوں نے اپنے لشکر کا دیکھا، وہ حیسمان بن عبداللہ خزاعی تھا۔ چہرہ لٹکا، خاک آلود پیشانی، آنکھیں بجھی ہوئی، ہونٹوں پہ پپڑی جمی ہوئی، چپ۔ لوگ جمع ہو گئے۔ خدا کے حرم کا مقام۔ لوگ پوچھیں۔ بولو۔ کیا خبر لائے۔ وہ خاموش۔ کچھ بولا نہ جائے اس سے۔ ایک دو نے اس کے کندھے ہلائے۔ اس کے ناک کے نتھنوں میں ایک مکھی گھسی اسے اڑانے کے لیے اس نے ہاتھ ہلایا پھر اسی

ہاتھ کو اپنی گردن پہ چھری کی طرح پھیر کے بولا۔ سب بڑے سردار ہمارے مارے گئے۔ ہجوم سے ایک حیرت زدہ "ہائیں" کی آواز نکلی۔ کون کون۔ اس نے خشک ہونٹوں کو داہنے ہاتھ سے ملا۔ خشک گلے میں تھوک کھینچا۔ ایک دو لمحے گردن کے اس کے پٹھے اکڑتے سکڑتے رہے۔ ایک لمبا گہرا سانس اس نے اپنے سینے میں بھرا پھر مرنے والوں کے نام لینے لگا۔ [۱۱۷]

مصنف نے یہاں بھی قاری کی حسِ باصرہ، حسِ لامسہ اور حسِ ذائقہ کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔

تلمیح (Allusion):

اس صنعت کے ذریعے کسی مانوس چیز کا اشارہ دے کر ادب کے کسی ٹکڑے کو گہری تفہیم فراہم کی جاتی ہے۔ یعنی کسی دوسرے کام کا حوالہ دے کر متن کو گہرے معنی دینا۔ یہ بہت عام اور مؤثر حربہ ہے۔ اس کے معنی مختلف ہوتے ہیں۔ اس کی مختلف قسمیں ہیں۔ سب سے عام قسم، مذہبی اشارہ ہے، لیکن تاریخی، افسانوی، ثقافتی اور ادبی اشارے بھی ہوتے ہیں۔ [۱۱۸]

آقاﷺ میں صنعتِ تلمیح کا بہت زیادہ استعمال تو نہیں ملتا، لیکن چیدہ چیدہ مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

حضرت عبدالمطلب نے اپنے بیٹوں میں سے کسی ایک بیٹے کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے کا اللہ پاک سے عہد کیا تھا۔ جب قربانی کرنے کی باری آئی، تو قرعہ فال حضور پاک ﷺ کے والد ماجد حضرت عبداللہ کے نام نکلی۔ حضرت عبداللہ نے اپنے والد سے کہا کہ آپ اپنا عہد پورا کریں۔ یہاں مصنف اس واقعے کو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے واقعے سے جوڑتے ہیں۔ ساتھ ہی علامہ اقبال کے شعر کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

سیدنا ابراہیمؑ اور سیدنا اسماعیلؑ کی کہانی میں بڑا فرق تھا۔ وہ دونوں جلیل القدر انبیا تھے۔ ایک خلیل اللہؑ اور دوسرا ذبیح اللہؑ۔ تبھی تو اقبال نے کہا:

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی

سکھائے کس نے اسماعیلؑ کو آدابِ فرزندی

وہاں باپ سیدنا حضرت ابراہیمؑ کی نظرِ کرم کا فیض تھا۔ مکتب وہی تھے، مگر ادھر شاید اس پیدا ہونے والے جلیل القدر نبی آخر ﷺ کی نظر کرم کا فیض تھا۔ [۱۱۹]

حضرت بی بی فاطمہ سلام اللہ علیہا کی عظمت کا ذکر کیا تو ان کے بارے میں علامہ اقبال کے ایک فارسی شعر کی طرف اشارہ کیا۔ مصنف نے شعر تو درج نہیں کیا، لیکن اس کا مفہوم بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

علامہ اقبال نے تو سیدہ فاطمہ رضی اللہ کی منقبت میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ اگر میرے رسول ﷺ نے مجھے کسی قبر کو سجدہ کرنے سے نہ روکا ہوتا تو میں سیدنا فاطمہ کی قبر کو سجدہ کرتا۔ [۱۲۰]

مصنف آقاﷺ کے پیش لفظ میں بتاتے ہیں کہ ان کی پوسٹنگ ملتان سے اسلام آباد ہو گئی، سامان بھی بھجوا دیا، لیکن کچھ وجوہات کی بنا پر دس مہینے تک وہ خود نہ جا سکے۔اس واقعے کا تعلق مولانا روم کے واقعے سے جوڑتے ہوئے مولانا روم کے مرشد کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ:

> جیسے مولانا روم کا سارا بستہ شاہ شمس نے دریا برد کر دیا تھا، میری ساری ادبی، تاریخی، ڈاکٹری، قانوں، سوشیالوجی، ہر طرح کی کتابیں پیک کر وکے دور بھجوا دیں۔[۲۱]

یہاں وہ ایک تاریخی واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جب مولانا روم کی ان کے مرشد شاہ شمس تبریز سے پہلی ملاقات ہوئی تھی اور شاہ شمس نے ان کی ساری کتابیں دریا برد کر دی تھیں، لیکن یہاں یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ مولانا کے مرشد شاہ شمس اور ہیں اور ملتان والے شاہ شمس اور، لیکن مصنف کے جملے سے یوں احساس ہوتا ہے، جیسے وہ مولانا کے مرشد، ملتان والے شمس تبریز کو ہی سمجھ رہے ہوں۔

تکرار:

یہ وہ حربہ ہے جس کی مدد سے مصنف اپنی تحریر کے کسی جملے میں دو ایسے الفاظ کا استعمال کرے، جو ایک ہی معنی رکھتے ہوں۔یعنی کسی سطر میں ایک لفظ کی تکرار ہو اور بار بار آئے۔اس کا مقصد تحریر میں زور اور حسن پیدا کرنا اور قاری کی توجہ متن کے کسی خاص حصے کی طرف مرکوز کرنا ہے۔کسی بھی جملے میں حروفِ ربط اور حروفِ عطف کے علاوہ باقی تمام حصے میں الفاظ یا آواز کی تکرار پیدا کی جا سکتی ہے۔الفاظ کے دہرانے سے ہر لفظ کے الگ معنی ظاہر ہوتے ہیں، نیز اختلاف، زور، تاکید یا مبالغے کا بھی اظہار ہوتا ہے۔[۲۲] متن میں ایسے الفاظ قاری کے لیے متاثر کن ہوتے ہیں۔تحریر میں الفاظ کی تکرار کے علاوہ آوازوں کی تکرار سے بھی نغمگی اور ترنم پیدا ہوتا ہے۔ڈیوڈ جولف نے اسلوب کا جائزہ لینے کے لیے تکرار کی مندرجہ ذیل صورتیں بتائی ہیں۔

۱۔ تجنیس صوتی(Alliteration)

۲۔ حوالیہ(Anaphora)

۳۔ کلمہ تکرار(Epistrophe)

ذیل میں تکرار کی مندرجہ بالا صورتوں کی روشنی میں آقاﷺ کے متن کا تجزیہ پیش کیا جا رہا ہے۔

تجنیس صوتی(Alliteration):

جملے میں ایک ہی آواز کا بار بار آنا تجنیسِ صوتی کہلاتا ہے۔آوازوں کی تکرار، خواہ وہ جملے کے شروع کے الفاظ ہوں، درمیان میں ہوں یا آخر میں۔[۲۳] اس صنعت کی مدد سے مصنفین نے اپنی بات میں زور پید کرنے کی کوشش

کرتے ہیں، کیوں کہ آوازوں کی تکرار اس تکنیک کا اہم پہلو ہے۔اس تکنیک کا استعمال مصنف کے ارادوں کو تقویت دیتا ہے۔آوازوں کی یہ تکرار نرم، حسین اور قبیح وغیرہ ہو سکتی ہے

آقا ﷺ میں مصنف نے بارہا اس حربے کی مدد سے اپنی بات کی تاثیر میں اضافہ کیا ہے۔مصنف نے اپنی نثر میں حسن پیدا کرنے کے لیے آوازوں کی تکرار سے ترنم اور نغمگی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ذیل میں آقاﷺ کے متن سے تجنیسِ صوتی کی چند مثالیں پیش کی جارہی ہیں،تاکہ یہ جائزہ لیا جاسکے کہ مصنف نے اس صنعت کے استعمال سے کس طرح مناسب لہجہ پیدا کیا ہے اور قاری کے لیے ان کا انداز کس حد تک متاثر کن ہے۔

سیدنا ابراہیمؑ سے وہ بت تونہ بکتے،ان نہ بکتے بتوں کا شہرہ بہت ہوتا۔[۱۲۴]

وہ بہت بڑا کہانی کار ہے۔ایسا کہ کوئی کام نہیں کرتا جس میں کوئی کہانی نہ ہو۔کوئی راز نہ ہو، کوئی بشارت نہ ہو۔کوئی خبر نہ ہو۔[۱۲۵]

مندرجہ بالا مثال کو کلمہ تکرار میں بھی شامل کیا جاسکتا ہے، لیکن یہ تجنیسِ صوتی کی بھی بہترین مثال ہے۔"ک" کی آواز کی تکرار سے مصنف نے جملے میں ایک تال اور آہنگ پیدا کر دیا ہے۔

سرخ محل کی دیواروں سے ٹکراتی ساحل پہ سمندر کی لہروں میں موج و مستی تھی۔[۱۲۶]

اور کچھ نہ ہوا، جو سوچا، وہ نہ ہوا۔ جو ہوا، وہ سوچا ہی نہ تھا۔[۱۲۷]

وہ ردا جس پہ کائنات کی ہر حسین ادا نثار۔[۱۲۸]

"ہ" اور "ح" کی آوازوں میں تکرار ہے۔

آنکھوں سے نیر، دل میں محبت کے تیر، اس سے بڑھ کے کیا ہو سکتی تھی ایمان کی تاثیر۔[۱۲۹]

وہ جن کے دوست ہوتے دوستی نبھاتے۔ جس سے خفا ہوتے اس سے موت تک لڑتے۔وعدہ کرتے تو پورا کرتے۔لڑنا ہوتا تو سامنے سے لڑتے پیٹھ پیچھے سے وار نہ کرتے۔[۱۳۰]

جن کے طفیل خدا نے یہ کائنات بنائی تھی۔[۱۳۱]

یہاں "ط" اور "ت" کی آوازوں میں تکرار ہے۔

گڑگڑایا مگر اس کی نہ سنی گئی۔[۱۳۲]

جیسے کوئی انتہائی انہونی سن لی ہو۔[۱۳۳]

بس ابوسفیان کی پگڑی کے سوا کچھ نہ گرا، نہ گرایا گیا۔[۱۳۴]

لوگوں کا جذبہ، خوشی، اور جوش و خروش دیدنی تھا۔[۱۳۵]

حوالیہ(Anaphora):

کسی جملے یا فقرے کی ابتدا میں کسی خاص لفظ یا الفاظ کی تکرار حوالیہ کہلاتی ہے۔[136] مصنفین اس تکنیک کو قاری کو قائل کرنے کے لیے اور ان تک خاص قسم کا تاثر پہنچانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ متن میں کسی لفظ یا فقرے کو دہرانے سے قارئین اگلی سطر کا اندازہ لگانا شروع کر دیتے ہیں۔الفاظ کی تکرار قاری کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔اس طرح قاری کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا ہے۔ حوالیہ کے استعمال سے بہت سے احساسات و جذبات کو جنم دیا جا سکتا ہے۔ جیسے: غصہ، خوف، نفرت، جوش وغیرہ۔

ذیل میں آقاﷺ سے حوالیہ کی مثالیں پیش کی جارہی ہیں،تالہ یہ جائزہ لیا جا سکے کہ مصنف نے اس حربے کے ذریعے اپنے متن میں کس طرح زور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور کس طرح اپنے اندازِ تحریر کو قاری کے لیے اثر پذیر بنایا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہ کو نبی کریم ﷺ نے ابو تراب کہا۔ابو تراب کی وضاحت کے لیے مصنف نے حوالیے کی تکنیک استعمال کی ہے۔:

- (تراب مٹی کو کہتے ہیں اور ابو باپ کو) آقا ﷺ نے اسی رات سیدنا علی کو مٹی کا باپ قرار دے دیا۔
وہ مٹی جسے گوندھ کے کبھی خدا نے ہمارا باپ آدم علیہ السلام بنایا تھا۔
وہی مٹی جس کے اندر ہر ذی روح جا کے اپنا آپ گم کر دیتی ہے۔
وہی مٹی جس کے اندر سے ہر باغ، ہر پھول، ہر پھل کی ہری کونپل نکلتی ہے۔
وہ مٹی جس میں وہ سارے نمکیات اور اجزا ہیں جو ہمارے یا اس دھرتی کی کسی بھی تخلیق میں پائے جاتے ہیں اور جو جو جس میں ہے وہی جا کے اس مٹی کا حصہ بن جاتا ہے۔اس مٹی کا باپ، ابو تراب علی کو کہا گیا۔[137]

یہاں "وہ مٹی" کی تکرار سے جملے میں زور پیدا کیا گیا ہے۔

- کس لمحے نے کب پیدا ہونا ہے۔
کب گزرنا ہے۔ کب مرنا ہے۔[138]

ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

- صرف اس کا نور تھا۔
صرف اس کا علم تھا۔[139]

- کون اس کائنات کا نور ہوگا؟

کون کائنات کی سواری کا سوار ہوگا۔

کون اُسے پہچانے گا۔[140]

- کوئی خطرناک موڑ

کوئی اونچا پہاڑ

کوئی موذی جانور

کوئی فالتو مند پسو

کوئی نیک چلن انسان[141]

جملے میں لفظ "کوئی" کی تکرار سے بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

- انا سے انا ٹکرانے لگی۔

"انا" سے بڑا لوہا کوئی نہیں۔

انا سے انا ٹکرائے تو بڑا فساد ہوتا ہے۔[142]

- انعام کیا ہوتا ہے؟

انعام کیا انعام یافتہ لوگ ہی دیتے ہیں؟

یہ انعام یافتہ لوگ کون ہیں؟[143]

- ایسا ہی ہوا تھا۔

ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔[144]

مصنف نے یہ تکنیک کبھی تو قاری کو قائل کرنے کے لیے استعمال کی ہے، تو کبھی اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کے لیے اس تکنیک کا استعمال کیا ہے۔

کلمہ تکرار(Epistrophe):

یہ ایک ایسی تکنیک ہے، جس میں لگاتار فقروں میں یا جملوں کے آخر میں ایک یا زیادہ الفاظ کی تکرار ہوتی ہے۔اسے حوالیہ کی ضد کہا جاتا ہے، کیوں کہ حوالیہ میں جملے کے شروع میں الفاظ کی تکرار ہوتی ہے۔[145] کلمہ تکرار کسی خیال پر زور دینے یا جذبات بیان کرنے کا ایک آسان اور مؤثر ذریعہ ہے۔یہ ضروری نہیں کہ کلمہ تکرار میں بار بار کے دہرائے ہوئے الفاظ ایک جیسے ہوں، وہ مختلف بھی ہو سکتے ہیں۔ متن میں کلمہ تکرار کا استعمال زیادہ مؤثر ہو سکتا ہے،

اگر دہرائے جانے والے الفاظ ہر بار تھوڑے مختلف ہوں۔آقاﷺ کے مصنف نے اپنی تصنیف میں اثر اور زور پیدا کرنے کے لیے کلمہ تکرار کی تکنیک سے کام لیا ہے۔ذیل میں چند مثالیں پیش کی جا رہی ہیں:

اب خدا جانے، خدا نے پہلا فیصلہ کون سا کیا؟[۱۴۶]

کچھ نہ کچھ، کبھی نہ کبھی طے ہوا ہو گا۔[۱۴۷]

دور دور تک نہ پانی، نہ پانی کا نشان۔نہ کوئی پودا نہ کوئی پیڑ۔نہ کوئی نسان، نہ کوئی انسانوں کی بستی۔[۱۴۸]

مگر وہ بس گئیں، ٹھر گئیں اور ہمیشہ کے لیے قائم کر دی گئیں۔[۱۴۹]

چنے ہوئے لوگوں کے لیے وقت کا بھی چناؤ ہوتا ہے۔[۱۵۰]

جانتی ہو وہ بزرگ کون تھے؟ مجھے کیا پتہ! مجھے پتہ ہے۔کون تھے؟[۱۵۱]

فیصلہ ہو گیا۔فیصلہ پہلے بھی ہوا تھا۔[۱۵۲]

نورِ کائنات ﷺ کی زندگی میں بڑے دکھ کا آغاز لکھا گیا تھا۔لکھا یہ گیا تھا۔[۱۵۳]

اللہ نے ہر قوم، ہر بستی، ہر قریہ میں ڈرانے والے اور خوشخبری دینے والے بھیجے۔[۱۵۴]

ظاہر ہے ہر دور میں انسان کمزور رہا ہے۔آج کا انسان بھی کمزور ہے۔کہنے کو اس کی زندگی میں کمزور لمحے کم آتے ہوں گے۔مگر آتے ہیں۔[۱۵۵]

یاد رکھنا میرے اس بچے کی بڑی شان ہو گی۔ایسی شان جو کسی شان والے کی پہلے کبھی نہ ہوئی ہو گی۔[۱۵۶]

آخر سیدہ نے اپنے سر پہ ڈالی ہوئی چادر اتار دی۔وہ چادر جس کی قسمت پہ آسمان ناز کرے۔[۱۵۷]

مکہ کے سب غلام دل ہی دل میں اپنے نصیب سیدنا زید جیسے سوچا کرتے تھے۔وہ سوچتے تھے کاش ہمارا آقا بھی آقا ﷺ ہی ہوتے، ہمیں غلامی سے نکال کے اپنا بناتے، ہمارے محافظ اور وارث بنتے، ہمیں اپنا وارث کہتے۔پھر ہم کتنے خوش نصیب غلام ہوتے۔ایسے غلام جس پہ ہزاروں آزادی کی زندگیاں قربان۔[158]

یوں تو مندرجہ بالا اقتباس میں بہت سے الفاظ کی تکرار ہوئی ہے، لیکن مصنف نے "آقا" لفظ کی تکرار سے جملے میں حسن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

مبالغہ (Hyperbole):

اس کا مطلب ہے "حد سے بڑھنا"۔یہ ایک ادبی تکنیک ہے، جس میں مصنف جان بوجھ کر اپنی تحریر میں زور اور اثر پیدا کرنے کے لیے ایسے مخصوص الفاظ اور فقرے استعمال کرتا ہے، جو بڑھا چڑھا کر اس کی بات کو بیان کریں۔[159] مصنفین یہ تکنیک اپنی تحریر کو دلچسپ بنانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ایک نقطہ نظر پر زور دینے کے

لیے بھی اس تکنیک کو برتا جاتا ہے۔ اگر مبالغہ کی تکنیک کا درست استعمال کیا جائے تو تحریر کے حسن میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

آقاﷺ میں مصنف نے مبالغے کے استعمال سے اپنی تحریر میں حسن اور اثر پیدا کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

سخت پتھر کی چٹان کے سینے پہ ان کے بخت آور پاؤں آئے، تو وہ ادب سے دہرا ہو کے ان کے پیروں میں سمٹ گیا۔ وہ پتھر جو اپنی نوکیلی پتھریلی زبان سے پیروں کو چاٹنے کا عادی تھا، وہ ان کے بابرکت پیروں کے لمس سے مکھن کی ڈلی بن گیا۔ ان کے پیروں کا نشان اپنے دل پہ رکھ کے ہمیشہ کے لیے امر ہو گیا۔ اپنے جیسے ہزارہا پتھروں کے قبیلے سے نکل گیا۔[160]

آقاﷺ نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے ایک تنکے کی طرح ہوا میں اچھالا، وہ کٹی لکڑی کی طرح ہوا میں اچھلا اور ایک دھب سے روئی کے گٹھے کی طرح بے سدھ ہو کے چاروں شانوں زمین پہ جا گرا۔[161]

پہاڑ سا اس کا جسم روئی کے گال کی طرح اڑا اور دھب سے پھر زمین پہ وہ تھا۔[162]

ہر ایک کی روح وجد میں آ گئی۔ لوگ حلف اٹھانے کے لیے اپنے ہاتھ کٹی گردن کی طرح ہتھیلی پہ رکھے آقاﷺ کی طرف لپکے۔[163]

چاند اپنی پوری چاندنی لٹا کے سجدے میں گر گیا۔[164]

آقاﷺ کے کہے ان الفاظ نے پھیلی ہوئی شفاف چاندنی کے تھال پہ جیسے پروانوں کو محوِ رقص کر دیا۔[165]

ماہِ کامل اور چاندِ اکمل کی مجسم چاندنی اور آسمان کے خورشید کی ہر سنہری کرن نقرئی تاروں سے عروسی ہار میں راہ میں منتظر دیدہ ور پروانوں کی دید کی ترسی نگاہوں کے موتی پروئے مسکرا رہی تھی۔[166]

پھر اس کے گالوں پہ اس کے آنسو ایسی بے تابی سے پھیلے جیسے آقاﷺ کے قدم دھونے نکلے ہوں۔[167]

اس کے دل میں سانپ لہرایا۔[168]

ابوسفیان کی آنکھیں غصے اور حیرت سے ابلنے لگیں۔[169]

اور عثمان بن طلحہ کا چہرہ بدل جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں ستارے جھلملا جاتے ہیں۔ جھلملاتے ستاروں سے آقاﷺ کا رخِ روشن ماہِ کامل کی طرح سج کے اسے سجا جاتا ہے۔[170]

آقاﷺ سیرت کی تصنیف ہے اور سیرت کا موضوع سیرت نگار سے بہت احتیاط کا تقاضا کرتا ہے۔ سیرت کی تصنیف میں مبالغے کا استعمال بذاتِ خود ایک سوال ہے، لیکن اس کے باوجود ابدال بیلا نے اپنی تصنیف میں صنعتِ مبالغہ کا دل کھول کے استعمال کیا ہے۔ مندرجہ بالا مثالوں سے ضح ہوتا ہے کہ مصنف نے اس صنعت کے استعمال سے سے کہیں بھی آقاﷺ کی حرمت کو پامال نہیں ہونے دیا۔

تشبیہ(Similes):

یہ دو غیر متعلق اور متفرق چیزوں، لوگوں، انسانوں، مقامات اور تصورات کے مابین موازنہ کرنے کی مشق ہے۔[171] ابدال بیلا نے برجستہ تشبیہات سے اپنی تحریر میں حسن پیدا کیا ہے۔ ذیل میں مصنف کی استعمال کی گئی تشبیہات کی چند مثالیں پیش کی جارہی ہیں:

تھپ سے پھٹی ہوئی بوری کی طرح گر گیا۔[172]

سب خوشی سے ابلتے ہوئے دودھ کی طرح اچھل رہے تھے۔[173]

پھر اپنی زعفران رنگی قبا میں لپٹا لپٹایا اپنے دونوں ہاتھوں اور کہنیوں سے بیٹھے بیٹھے مور کی طرح پھڑ پھڑاتا ہے۔[174]

۔۔۔وہی سیدنا عباس آقا ﷺ کے پہلو میں اپنے قوی ڈیل ڈول کے ساتھ اس چاندنی میں نہائی گھاٹی میں سنگِ مرمر کے ستون کی طرح کھڑے تھے۔[175]

بھاگتے آئے سبھی سوار سیخ میں کبابوں کی طرح پرو دیے گئے۔[176]

اشارہ پاتے ہی دونوں نوخیز عقاب کی طرح جھپٹے۔[177]

ابو لہب تھپڑ کھا کے چیتے کی طرح غرایا۔[178]

غصیلے جلبی سانپ کی طرح صفوان اپنے اندر ہی اندر زہر کی پوٹلی اپنے تالو سے چپکائے خود ہی کو ڈسے۔۔۔[179]

خوف سے اپنے گھروں میں پڑے ہلدی کی طرح پیلے ہو گئے۔[180]

۔۔۔آنکھیں حیا بار ہوئی پکے پھلوں کی طرح جھکی ہوئی ہیں۔[181]

۔۔۔جو اس کی گردن میں ایسا پرو دیا گیا، جیسے اون کے گولے میں سویٹر بننے والی سلائی۔[182]

وہ جس نے مدینے میں اپنی خوش آہنگی، دلیل اور خوش بختی سے لوگوں کے دلوں میں ایمان کے بیج بوئے تھے، کٹے ہوئے دیودار کی طرح گر گیا[183]

جیسے ماہِ کامل پہ زخم آیا ہو اور خورشید کا جگر کٹے، خون مقدس سے چہرہ سرخ ہو گیا۔[184]

ریت میں کٹی ہوئی لاش نگینے کی طرح چمک رہی تھی۔[185]

روح آنکھوں میں ستاروں کی طرح چمکی۔۔[186]

خون خون ہوا جسم جلتی موم بتی پہ پروانے کے جلے پروں کی طرح کپکپایا۔۔۔[187]

خیبر مسلمانوں کے قدموں میں قالین کی طرح بچھ گیا۔[188]

اور وہ اپنا پہاڑ جیسا جسم لے کر دھڑام سے ریزہ ریزہ ہو کے زمین پہ گر پڑے۔[189]

ابدال بیلا نے اس صنعت سے ہر جگہ پر واقعے کے ہر منظر اور کردار کی صحیح کیفیات کو پیش کرنے میں بھرپور مدد لی ہے۔ان کی استعمال کردہ تشبیہات میں سے کسی کو بھی بلاجواز اور کمزور نہیں کہا جا سکتا ، بلکہ ہر تشبیہ ،ان کے موضوع اور مختلف کرداروں کی نفسیات اور کیفیات کو پوری طرح سے پیش کرتی ہے۔

استعارہ(Metaphor):

استعارہ عام طور پر سب سے زیادہ استعمال ہونے والا ادبی حربہ ہے۔استعارہ کسی خاص معنی یا شناخت کو کسی دوسرے موضوع سے منسلک کرتا ہے۔استعارہ میں ایک لفظ کے ظاہری معنی کو مجازی معنوں میں لیا جاتا ہے،تاکہ ان کی مماثلتوں اور مشترکہ خصلتوں کے مابین موازنہ کیا جا سکے۔ ظاہری معنی، جو جملے کی توجہ کا مرکز ہوتا ہے، دراصل دوسرے مجازی مفہوم سے تعلق رکھتا ہے۔استعارہ کے استعمال کا مقصد ایک ایسی شناخت یا تصور بنانا ہے، جس کو واضح طور پر سمجھا جا سکے۔ [190] ابدال بیلا کے ہاں ہمیں استعارات کا بکثرت استعمال ملتا ہے۔

چند مثالیں درج ذیل ہیں:

مکہ کی خوش بخت سیدہ خدیجہ بھی اپنے دو منزلہ پر وقار اونچے گھر کی بالکونی میں مغرب میں ڈوبتے سورج کے رخ پہ کھڑی اپنے نصیبوں میں طلوع ہونے والے مہتاب کی راہ تکنے لگیں۔ [191]

سورج مغرب میں جھک رہا تھا، جیسے وہ مشرق سے طلوع ہونے والے ماہِ کامل کے حضور سجدہ کرنے کی جگہ ڈھونڈ رہا ہو۔ [192]

گھاٹی میں موجود پروانوں میں عجیب طرح کی ہل چل ہوئی۔ [193]

گھاٹی میں موجود ہر پروانے کا سر اپنی مقدس شمع پہ نثار ہونے کو اثبات میں ہل رہا تھا۔ [194]

بچھڑا ہوا پنچھی اپنی ڈال پہ آ گیا۔ [195]

یہ استعارہ مصنف نے عبداللہ بن سہیل عمرو کے لیے استعمال کیا، جو کافی عرصے کے بعد جنگ بدر میں آقا ﷺ سے جا ملے۔

ان کے پروانے پھر اپنے محبت کے پر اتارے سونڈیاں بنے ایک دوسرے کو نفرت سے گھور رہے تھے۔ [196]

ماہِ کمال اپنی اجلی چاندنی سمیت مٹی مٹی ہو گیا۔ [197]

خطیبانہ سوالات(Rhetorical Question):

کسی بھی بیانیے میں خطیبانہ سوالات اٹھانے سے مراد مصنف کی طرف سے ایسے سوالات پوچھنا ہے، جن کے جوابات کی مصنف کو توقع نہیں ہوتی۔اس کے بجائے مصنف ان سوالات کو اپنا نقطہ نظر سمجھانے کے لیے استعمال کرتا

ہے۔اس تکنیک میں مصنف سوال پوچھ کر خود ہی اس کا جواب بھی دے دیتے ہیں۔بیانیے میں سوالات پوچھنا، قاری کو قائل کرنے والے حربے کے طور پر بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔اسے براہِ راست قاری سے بات کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔یہ قاری کو متن کی روانی میں ایک لمحے کے لیے روکنے اور سوال کے بارے میں سوچنے پر اکساتا ہے۔یہ سوالات قاری کی دلچسپی بڑھانے کا باعث بنتے ہیں۔[۱۹۸]

ابدال بیلا نے بھی بارہا اپنی تصنیف میں اس تکنیک سے کام لیا ہے۔چند مثالیں درج ذیل ہیں:

- ۔۔۔۔انتہائی برگزیدہ نبی سیدنا ابراہیمؑ اپنی بیوی ہاجرہؑ اور اسماعیلؑ کو فلسطین سے لے کر سوا مہینے تک چلتے چلتے کہاں جا کے رکتے ہیں؟

  کہاں بیوی اور بچے کو چھوڑتے ہیں؟ وہ کون سی جگہ تھی؟

  وہ جگہ کس نے طے کی تھی؟[۱۹۹]

- جس کی قیمت شروع دن سے ایک مشکیزہ شراب رہی ہو، وہاں بیٹھ کے ہوش مندی کے فیصلوں کے بجائے سازشیں نہ ہوتیں تو کیا ہوتا؟

  مشرکین کی ساری بدراہ، دشمنی بھری چالیں الٹ ہو گئی تھیں۔[۲۰۰]

- آسمان کی آنکھ نے ایسا نظارہ اس سے پہلے یا اس کے بعد کہیں دیکھا؟

  دکھایا؟[۲۰۱]

- یہ مواخات یا بھائی چارہ کیا تھا؟

  دو الگ تہذیبوں، تمدنوں، شہروں، مختلف، مزاجوں، مختلف قبیلوں، مختلف علوم و فنون کے لوگوں کو نگینوں کی طرح ایک ساتھ جوڑ دینا، جیسے انگوٹھی میں ہیرا۔[۲۰۲]

- گھر میں آقا ﷺ کے کیا سامان تھا؟

  ایک آدھ پیالہ۔

  ایک دو چٹائیاں۔

  اور ایک چکی، آٹا اور جو پیسنے والی۔[۲۰۳]

- کوئی میرے آقا ﷺ سے بہتر سپہ سالار دکھائے؟

  ان کی شخصیت کا ہر رخ ہی اعلیٰ ترین تھا۔[۲۰۴]

- اب خود فیصلہ کر لیں، جیتا کون؟ ہارا کون؟

  مگر ٹھہریں۔ایک سال انتظار کریں۔[۲۰۵]

- وہ کون سا جرم تھا، جو آقاﷺ نے سہہ کے معاف نہ کر دیا ہو؟[۲۰۶]
- معاملات اللہ نے خود سلجھا دیے۔

بیویوں کے معاملات خدا کے علاوہ سلجھا بھی کون سکتا ہے؟[۲۰۷]

مندرجہ بالا مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے اس تکنیک کے استعمال سے قاری کی توجہ متن پر نئے سرے سے مرکوز کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اپنے بیانیے میں، جس جگہ رک کر قاری کو توقف کروانا چاہتے ہیں، اسے قائل کرنا چاہتے ہیں تو اس حربے کے استعمال سے براہِ راست قاری سے گفتگو شروع کر دیتے ہیں۔ اس سے قاری کی دلچسپی میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور اسے مصنف کا نقطہ نظر سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

اس باب میں ڈیوڈ جولف کے پیش کردہ فریم ورک کی روشنی میں آقاﷺ کے متن کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ ڈیوڈ جولف کے اس فریم ورک کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے کو بلاغت (Rhetorical Situation) کا نام دیا گیا ہے۔ اس حصے میں ان اندرونی و بیرونی محرکات کا جائزہ لیا گیا ہے، جن کی ترغیب سے مصنف نے اپنی تصنیف لکھی۔ اس میں تصنیف کی ضرورت، قارئین اور مقصد کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔ فریم ورک کے دوسرے حصے کو کشش انگیزی (Appeals) سے موسوم کیا گیا ہے، اس میں یہ دیکھا گیا ہے کہ مصنف کی طرف سے منطقی استدلال کا استعمال کس انداز سے کیا گیا ہے؟ مصنف نے اپنی تصنیف میں کس نقطہ نظر کا پرچار کیا ہے؟ ان کا اندازِ بیان کیسا ہے؟ انھوں نے اسلوب کیسا اختیار کیا؟ وغیرہ۔

اس فریم ورک کی روشنی میں آقاﷺ کے مصنف کی زبان و بیان کا تجزیہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ مصنف نے اس تصنیف میں سیرتِ پاک کے واقعات زمانی ترتیب سے بیان کیے ہیں۔ ان کا مخاطب عام قاری ہے۔ انھوں نے قاری کو متوجہ اور متاثر کرنے کے لیے اپنی تصنیف کو ادبی تصنیف بنا کر پیش کیا ہے۔ تمام واقعات ناول یا کہانی کے انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ افسانہ نگار اور ناول نگار ہونے کے ناطے، ابدال بیلا نے آقاﷺ کی سوانح پاک کے اہم واقعات کے انتخاب اور ان کے بیان کو آسان اور سہل بنا کے مختلف اکائیوں میں پیش کیا ہے۔ مصنف نے اپنے بیانیے کو ان محاسن سے مزّین کرنے کی کوشش کی ہے، جو دراصل شاعری کا خاصہ سمجھے جاتے ہیں۔ آقاﷺ کے بیانیے میں امیجری، تلمیح، تکرار، مبالغہ، تشبیہ، استعارہ اور خطیبانہ سوالات جیسی تکنیکوں اور حربوں کے استعمال کو محض لفظی بازی گری اور تصنع نہیں کہا جا سکتا، بلکہ ان کی تمام تکنیکیں ان کی تصنیف کا حصہ بن کر سامنے آتی ہیں۔

مصنف نبی اکرمﷺ کا پیغام تمام بنی نوع انسان تک پہنچانا چاہتے ہیں، بالخصوص مغربی دنیا میں آقاﷺ کی تعلیمات کا پرچار کرنا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے اپنی تصنیف میں جہاں بھی ممکن ہوا، وہ اسلام اور عیسائیت کو قریب لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنی تحریر کے دوران قاری کی اخلاقی تربیت کا کوئی موقع ضائع نہیں ہونے دیتے۔

اگرچہ مصنف نے یہ تصنیف سیرتِ پاک ﷺ جیسے اہم اور سنجیدہ موضوع پر لکھی ہے، لیکن ان کی زبان غیر رسمی اور بے ساختہ ہے۔ انہوں نے اپنی تصنیف میں جذباتی زبان بھی استعمال کی ہے۔ آقاﷺ کے مصنف ابدال بیلانے مختلف جگہوں پر الفاظ کو ان کے لغوی معنوں کے بجائے مجازی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ بہت سے مقامات پر حضور اکرم ﷺ کے اصحاب کا ذکر کیا تو ان کا نام لینے کے بجائے لفظ "پروانہ" استعمال کیا اور آپ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ کے لیے "شمع" کا لفظ استعمال کیا۔ پروانہ چوں کہ شمع کا متوالا ہوتا ہے اور شمع کے روشن الاؤ کے سامنے اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، لیکن شمع کے معاملے میں اس کا شوق اور وارفتگی کم نہیں ہو پاتی۔ آقا ﷺ کے جان نثار ساتھیوں کے آقا ﷺ سے والہانہ عشق کی وجہ سے مصنف نے جب بھی کسی صحابی کی آپ ﷺ سے محبت کا ذکر کیا تو لفظ "پروانہ" ہی استعمال کیا۔

ابدال بیلا کے ہاں ہمیں لفظیات کے استعمال میں تنوع ملتا ہے۔ انہوں نے اپنی بات کی مکمل تفہیم کے لیے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جو ان کے خیال میں کسی بھی غیر جانب دار لفظ سے زیادہ قائل کرنے والے ہیں۔ کبھی تو ہندی زبان کے الفاظ کا سہارا لیا ہے تو کبھی اردو عبارت کی روانی میں انگریزی زبان کے ان الفاظ کا بے دریغ استعمال کیا ہے، جو ہماری عام بول چال کا حصہ ہیں اور کبھی ایسے جذباتی الفاظ اپنی تحریر میں استعمال کیے ہیں، جن کو پڑھ کے فوراً قاری کے اندر الفاظ سے متعلقہ مثبت یا منفی جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ آقاﷺ میں جہاں الفاظ کے چناؤ سے تحریر میں تنوّع، زور اور جوش پیدا کیا گیا ہے، وہاں قاری کو اس تصنیف کے متن میں بہت سے مقامات پر غلط املا اور غلط رموزِ اوقاف کے مسائل سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مصنف نے واقعاتِ سیرت کو ادبی پیرائے میں بیان کر کے اپنی تصنیف کو ادبی تصانیف کی صف میں لا کھڑا کیا ہے، لیکن کسی ادبی تصنیف میں املا اور رموزِ اوقاف کی اغلاط سے مصنف کے بارے میں کچھ اچھا تاثر قائم نہیں ہوتا۔ بہت سے مقامات پر رموزِ اوقاف اور املا کی اغلاط کی موجودگی ان کی تصنیف کا ادبی حسن ماند کر رہی ہے۔ کسی بھی ادیب کی تصنیف کی زبان اس کی اپنی ذات کی ترجمان ہوتی ہے، اس لیے ادبا کے لیے ضروری ہے کہ زبان و املا پر ان کی مکمل دسترس ہو، کیوں کہ املا اور رموزِ اوقاف کی اغلاط سے بعض اوقات متن کے معنی بھی بدل جاتے ہیں، جو قاری کے لیے الجھن کا باعث بن سکتے ہیں۔ آقاﷺ کے متن میں یہ اغلاط مصنف کے غیر سنجیدہ رویے کا ثبوت ہیں۔

آقاﷺ میں جملوں کی اقسام، تنوّع اور ان کی ترتیب کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اپنی نثر میں طویل جملے بھی استعمال کیے ہیں اور مختصر جملے بھی۔ مصنف نے ان جملوں میں بہت کم حروفِ عطف کا استعمال کیا ہے حتیٰ کہ رموزِ اوقاف کی دوسری علامتیں بھی بہت کم استعمال کی ہیں۔ مخصوص الفاظ پر زور دینے کے لیے اور جملے کے کسی حصے کو پرجوش بنانے کے لیے وقفے کے لیے زیادہ تر صرف علامتِ سکتہ (،) کا استعمال کیا گیا ہے، جو کہ ذرا سے

توقف کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ بہت کم حروفِ عطف کے استعمال سے جملے زیادہ پیچیدہ اور مبہم ہو گئے ہیں، ان کی تفہیم میں بعض اوقات دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

آقاﷺ میں مصنف، جابجا قاری کو آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس سے والہانہ عقیدت اور محبت کی طرف راغب کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آقاﷺ کو اول سے آخر تک جذبات نگاری کا مرقع کہا جا سکتا ہے۔ مصنف نے اپنے انداز، طرزِ تحریر اور الفاظ کے چناؤ کے علاوہ اپنے تخیل سے بھی قاری کے جذبات کو ابھارنے کی کوشش کی ہے، لیکن بعض مقامات پر ان کی جذبات نگاری میں مبالغے کی اس حد تک آمیزش ہو جاتی ہے، جو قاری کے جذبات کو بوجھل کر دیتی ہے۔ جذبات کی شدت کی وجہ سے ان کے بیان میں سنجیدگی، دلیل اور منطق کم ہو گئی ہے، جس سے تصنیف کا علمی و تحقیقی معیار متاثر ہو رہا ہے۔ سیرت جیسے اہم موضوع پر قلم اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ مصنف واقعات کے بیان میں صداقت اور خلوص سے کام لے، محض اپنے تخیل کا سہارا نہ لے۔ جذبات نگاری میں تخیل کی فراوانی سے بیان کا سارا حسن ماند پڑ جاتا ہے اور حقائق کے بیان پر مبالغے کا گماں ہوتا ہے، نیز اس سے تحریر کی تاثیر اور اس کے لسانی معیار میں بھی کمی واقع ہو سکتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ آئی۔اے شیروا(I. A. Shirova)، *How to Analyse Fiction* (پیٹر برگ: بورلے آرٹ، ۲۰۰۶ء)، ص۹۔

۲۔ جیمز لوری کلفرڈ(James Lowry Clifford)، *From Puzzle To Portrait : Problems of literary Biographers*، (چیپل ہل: یونیورسٹی آف نارتھ کیلیفورنیا پریس، ۱۹۷۰ء)، ص۹۱۔

۳۔ https://www.cusd80.com/cms/lib/AZ01001175/Centricity/Domain/8219/jolliffes-rhetorical-framework1.pdf۔ تاریخ ملاحظہ ۲ جنوری ۲۰۲۲ء بوقت ۲:۰۰ بجے۔

۴۔ ابدال بیلا، آقاﷺ (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء)، ص۲۰۔

۵۔ ایضاً، ص۵۴۹۔

۶۔ ایضاً، ص۷۹۵۔

۷۔ ایضاً، ص۸۷۹۔

۸۔ ایضاً، ص۲۵، ۲۴۔

۹۔ ایضاً، ص۲۳۔

۱۰۔ ایضاً، ص۴۷۳۔۴۷۴۔

۱۱۔ ایضاً، ص۶۳۱، ۶۳۲۔

۱۲۔ ایضاً، ص۵۳۳۔

۱۳۔ ایضاً، ص۳۲۴۔

۱۴۔ ایضاً، ص۴۷۔

۱۵۔ ایضاً، ص۲۹۹۔

۱۶۔ ذوالکفلی۔احماد(Zulkifli.Akhmad)، اسلان نور۔امیری(Islan Nur. Amiri)، "Analysis of Students Understanding in using Formal and Informal Expression"، مشمولہ *Al-Lisan*، جلد۳، شمارہ ۳(اگست ۲۰۱۸ء): ص۹۴۔۱۰۳۔

۱۷۔ ایضاً۔

۱۸۔ عابد علی عابد، البیان، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء)، ص۱۴، ۱۵۔

۱۹۔ ابدال بیلا، آقاﷺ، ص۶۳۔

۲۰۔ ایضاً، ص۳۹۰۔

۲۱۔ ایضاً، ص۵۰۳۔

۲۲۔ ایضاً، ص۵۰۵۔

۲۳۔ ایضاً، ص۵۰۸۔

۲۴۔ ایضاً، ص۵۱۰۔

۲۵۔ ایضاً، ص۵۲۷۔

۲۶۔ ایضاً، ص۵۹۵۔

۲۷۔ ایضاً، ص۶۳۱۔

۲۸۔ ایضاً، ص۱۳۷۔

۲۹۔ ایضاً، ص۲۱۷۔

۳۰۔ ایضاً، ص۲۷۰۔

۳۱۔ ایضاً، ص۳۱۷۔

۳۲۔ ایضاً، ص۳۵۲۔

۳۳۔ ایضاً، ص۳۸۹۔

۳۴۔ ایضاً، ص۴۴۶۔

۳۵۔ ایضاً، ص۴۷۰۔

۳۶۔ ایضاً، ص۴۹۷۔

۳۷۔ ایضاً، ص۵۰۳۔

۳۸۔ ایضاً، ص۵۰۴۔

۳۹۔ ایضاً، ص۵۱۹۔

۴۰۔ ایضاً، ص۵۵۹۔

۴۱۔ ایضاً، ص۶۴۰۔

42۔ ایضاً، ص۸۰۴۔

43۔ ایضاً، ص۱۹۸۔

44۔ ایضاً، ص۲۵۷۔

45۔ ایضاً، ص۵۵۷۔

46۔ ایضاً، ص۶۰۸۔

47۔ ایضاً، ص۶۵۵۔

48- ایضاً، ص ۶۹۳۔

49- ایضاً، ص ۱۵۷۔

50- ایضاً، ص ۹۵۲۔

51- ایضاً، ص ۸۰۴۔

52- ایضاً، ص ۹۳۶۔

53- ہیری آر۔وارفل(Harry R.Warfel)،" Syntax Makes Literature "، مشمولہ Journal Information، جلد ۲۱، شمارہ ۵ (فروری ۱۹۶۰ء): ص ۲۵۱-۲۵۵۔

۵۴- ایضاً۔

۵۵- ایضاً، ص ۳۰۔

۵۶- ایضاً، ص ۴۵۔

۵۷- ایضاً، ص ۴۸۔

۵۸- ایضاً، ص ۱۲۹۔

۵۹- ایضاً، ص ۱۳۲۔

۶۰- ایضاً، ص ۲۹۳۔

۶۱- ایضاً، ص ۵۹۳۔

۶۲- ایضاً، ص ۶۲۳۔

۶۳- مولوی عبدالحق ،قواعد اردو،(دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۹۴۰ء)، ص ۲۷۰۔

۶۴- عصمت جاوید ،نئی اردو قواعد (نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۱ء)، ص ۲۱۰۔

۶۵- نوول، جین آئر (Novel.Jane Eyre)،)،" Syntactic Analysis of Sentence Adverbials Observed in the Victorian "، مشمولہ Arab World English Journal جلد ۱۱، شمارہ ۲ (جون ۲۰۲۰ء): ص ۴۹-۵۸۔

۶۶- ابدال بیلا، آقا ﷺ ، ص ۲۷۔

۶۷- ایضاً، ص ۲۹۰۔

۶۸- ایضاً، ص ۳۵۴۔

۶۹- ایضاً، ص ۴۶۷۔

۷۰- ایضاً، ص ۵۹۰۔

۷۱- ایضاً۔

۷۲- ایضاً، ص ۶۶۸۔

۷۳۔ ایضاً، ص۸۱۶۔

۷۴۔ عصمت جاوید ،نئی اردو قواعد، ص۶۳۔

۷۵۔ مولوی عبدالحق ،قواعد اردو ،ص۳۲۰۔

۷۶۔ ابدال بیلا،آقاﷺ ، ص۵۲۱۔

۷۷۔ ایضاً، ص۵۶۸۔

۷۸۔ ایضاً، ص۵۶۹۔

۷۹۔ ایضاً، ص۶۹۶۔

۸۰۔ ایضاً، ص۳۳۴۔

۸۱۔ ایضاً، ص۳۴۵۔

۸۲۔ ایضاً، ص۳۴۲۔

۸۳۔ ایضاً، ص۳۸۴۔

۸۴۔ ایضاً، ص۴۱۹۔

۸۵۔ ایضاً، ص۴۳۱۔

۸۶۔ ایضاً، ص۴۳۵۔

۸۷۔ ایضاً، ص۴۴۹۔

۸۸۔ ایضاً، ص۴۷۳۔

۸۹۔ جے۔اے۔کڈن(J. A. Cuddon)، *Dictionary of Literay Terms and Literary Theory*،(لندن: پینگوئن بکس، ۱۹۹۲ء)، ص۶۴۔

۹۰۔ ابدال بیلا،آقاﷺ ،ص۳۴۳۔

۹۱۔ ایضاً، ص۴۳۳۔

۹۲۔ ایضاً، ص۵۰۵۔

۹۳۔ ایضاً، ص۵۱۱۔

۹۴۔ ایضاً، ص۵۹۵۔

۹۵۔ ایضاً، ص۶۰۹۔

۹۶۔ ایضاً، ص۶۰۵۔

۹۷۔ ایضاً، ص۵۱۹۔

۹۸۔ ایضاً، ص۵۲۰۔

۹۹۔ ایضاً، ص۵۲۲۔

۱۰۰۔ ایضاً، ص۶۳۵۔

۱۰۱۔ ایضاً، ص۶۷۳۔

۱۰۲۔ ایضاً، ص۶۷۵۔

۱۰۳۔ ایضاً، ص۷۴۰۔

۱۰۴۔ ایضاً، ص۷۴۱۔

۱۰۵۔ ایضاً، ص۸۸۷۔

۱۰۶۔ ایضاً، ص۱۱۳۰۔

۱۰۷۔ ایضاً، ص۵۲۹۔

۱۰۸۔ ایضاً، ص۴۳۴۔

۱۰۹۔ ایضاً، ص۵۳۹۔

۱۱۰۔ ایضاً، ص۵۹۴۔

۱۱۱۔ ایضاً، ص۷۱۔

۱۱۲۔ ایضاً، ص۹۵۲۔

۱۱۳۔ ایضاً، ص۲۱۹۔

۱۱۴۔ جے۔اے۔کڈن(J. A. Cuddon)، *Dictionary of Literay Terms and Literary Theory*، ص ۴۴۲۔

۱۱۵۔ ابدال بیلا،آقاﷺ ،ص۲۷۲۔

۱۱۶۔ ایضاً، ص۳۰۴۔

۱۱۷۔ ایضاً، ص۷۰۵،۷۰۶۔

۱۱۸۔ جے۔اے۔کڈن(J. A. Cuddon)، *Dictionary of Literay Terms and Literary Theory*، ص۲۹۔

۱۱۹۔ ابدال بیلا،آقاﷺ ،ص۱۴۲۔

۱۲۰۔ ایضاً، ص۴۴۲۔

۱۲۱۔ ایضاً، ص۱۸۔

۱۲۲۔ مولوی عبدالحق ،قواعد اردو،ص۲۳۱۔

۱۲۳۔ جے۔اے۔کڈن(J. A. Cuddon)، *Dictionary of Literay Terms and Literary Theory*، ص۲۵۔

۱۲۴۔ ابدال بیلا،آقاﷺ ، ص۳۲۔

۱۲۵۔ ایضاً،ص ۱۶۱۔

۱۲۶۔ ایضاً،ص ۱۶۳۔

۱۲۷۔ ایضاً،ص ۲۰۵۔

۱۲۸۔ ایضاً،ص ۲۵۷۔

۱۲۹۔ ایضاً،ص ۵۹۸۔

۱۳۰۔ ایضاً،ص ۲۰۸۔

۱۳۱۔ ایضاً،ص ۲۰۹۔

۱۳۲۔ ایضاً،ص ۲۵۳۔

۱۳۳۔ ایضاً،ص ۴۷۷۔

۱۳۴۔ ایضاً،ص ۶۵۸۔

۱۳۵۔ ایضاً،ص ۷۰۳۔

۱۳۶۔ جے۔اے۔کڈن(J. A. Cuddon)، *Dictionary of Literay Terms and Literary Theory*، ص ۴۰۔

۱۳۷۔ ابدال بیلا،آقاﷺ ،ص ۴۵۷۔

۱۳۸۔ ایضاً،ص ۱۹۷۔

۱۳۹۔ ایضاً،ص ۱۹۷۔

۱۴۰۔ ایضاً،ص ۱۹۹۔

۱۴۱۔ ایضاً،ص ۲۰۵۔

۱۴۲۔ ایضاً،ص ۲۰۷۔

۱۴۳۔ ایضاً،ص ۳۰۱۔

۱۴۴۔ ایضاً،ص ۴۸۷۔

۱۴۵۔ جے۔اے۔کڈن(J. A. Cuddon)، *Dictionary of Literay Terms and Literary Theory*، ص ۲۹۹۔

۱۴۶۔ ابدال بیلا،آقاﷺ ،ص ۲۸۔

۱۴۷۔ ایضاً۔

۱۴۸۔ ایضاًص،۲۹،۳۰۔

۱۴۹۔ ایضاً،ص ۳۰۔

۱۵۰۔ ایضاً،ص ۴۹۔

۱۵۱۔ ایضاً، ص ۵۵۔
۱۵۲۔ ایضاً، ص ۱۳۹۔
۱۵۳۔ ایضاً، ص ۱۵۱۔
۱۵۴۔ ایضاً، ص ۱۵۳۔
۱۵۵۔ ایضاً، ص ۲۰۵۔
۱۵۶۔ ایضاً، ص ۲۱۰۔
۱۵۷۔ ایضاً، ص ۲۵۲۔
۱۵۸۔ ایضاً، ص ۲۹۸۔
۱۵۹۔ جے۔اے۔کڈن(J. A. Cuddon)، *Dictionary of Literay Terms and Literary Theory*، ص ۴۳۵۔
۱۶۰۔ ابدال بیلا، آقاﷺ، ص ۴۸۔
۱۶۱۔ ایضاً، ص ۴۸۲۔
۱۶۲۔ ایضاً، ص ۴۸۲۔
۱۶۳۔ ایضاً، ص ۵۰۹۔
۱۶۴۔ ایضاً، ص ۵۱۱۔
۱۶۵۔ ایضاً، ص ۵۰۹۔
۱۶۶۔ ایضاً، ص ۵۷۲۔
۱۶۷۔ ایضاً، ص ۸۴۱۔
۱۶۸۔ ایضاً، ص ۸۲۰۔
۱۶۹۔ ایضاً، ص ۸۶۲۔
۱۷۰۔ ایضاً، ص ۹۴۶۔
۱۷۱۔ جے۔اے۔کڈن(J. A. Cuddon)، *Dictionary of Literay Terms and Literary Theory*، ص ۸۸۰۔
۱۷۲۔ ابدال بیلا، آقاﷺ، ص ۳۸۲۔
۱۷۳۔ ایضاً، ص ۳۸۹۔
۱۷۴۔ ایضاً، ص ۵۰۶۔
۱۷۵۔ ایضاً، ص ۳۴۴۔
۱۷۶۔ ایضاً، ص ۶۹۷۔

۱۷۷۔ ایضاً، ص۷۹۔

۱۷۸۔ ایضاً، ص۸۰۷۔

۱۷۹۔ ایضاً، ص۷۱۷۔

۱۸۰۔ ایضاً، ص۷۳۹۔

۱۸۱۔ ایضاً، ص۷۴۸۔

۱۸۲۔ ایضاً، ص۷۶۹۔

۱۸۳۔ ایضاً، ص۷۷۶۔

۱۸۴۔ ایضاً، ص۷۷۸۔

۱۸۵۔ ایضاً، ص۸۱۱۔

۱۸۶۔ ایضاً، ص۸۱۶۔

۱۸۷۔ ایضاً، ص۸۱۷۔

۱۸۸۔ ایضاً، ص۹۱۴۔

۱۸۹۔ ایضاً، ص۱۱۳۲۔

۱۹۰۔ جے۔اے۔کڈن(J. A. Cuddon)، *Dictionary of Literay Terms and Literary Theory*، ص۵۴۲۔

۱۹۱۔ ابدال بیلا،آقاﷺ ،ص۲۶۱۔

۱۹۲۔ ایضاً، ص۲۸۵۔

۱۹۳۔ ایضاً، ص۵۰۵۔

۱۹۴۔ ایضاً، ص۵۰۸۔

۱۹۵۔ ایضاً، ص۵۲۱۔

۱۹۶۔ ایضاً، ص۸۲۱۔

۱۹۷۔ ایضاً، ص۸۵۱۔

۱۹۸۔ جے۔اے۔کڈن(J. A. Cuddon)، *Dictionary of Literay Terms and Literary Theory*، ص۷۹۵۔

۱۹۹۔ ابدال بیلا،آقاﷺ ،ص۲۹۔

۲۰۰۔ ایضاً، ص۵۳۰۔

۲۰۱۔ ایضاً، ص۵۹۶۔

۲۰۲۔ ایضاً، ص۵۹۹۔

۲۰۳۔ ایضاً، ص ۶۲۴۔

۲۰۴۔ ایضاً، ص ۶۵۳۔

۲۰۵۔ ایضاً، ص ۷۹۲۔

۲۰۶۔ ایضاً، ص ۱۰۲۲۔

۲۰۷۔ ایضاً، ص ۱۰۴۶۔

ماحصل

ماحصل

جدید فکری مباحث اور معاشرے کے بدلتے ہوئے رجحانات کی وجہ سے دنیا بھر میں ادب کی تفہیم و تجزیے کے بنیادی نظریات و خیالات میں تیزی سے تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں، جس سے ادب کی تعبیر و وضاحت کا ایک نیا رخ سامنے آیا ہے۔ وقت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق سوانح نگاری میں بھی سائنسی، عقلی اور تنقیدی طریقوں کے زیر اثر، نئے مکاتب فکر اور رجحانات و میلانات پروان چڑھے ہیں۔ چناں چہ سوانحی ادب میں نئے اسالیب اور نئی جہتیں متعارف کروائی گئی ہیں۔ سوانحی ادب جو کہ انیسویں صدی تک عظیم انسانوں کی داستان حیات، حکمرانوں کے عروج و زوال اور تاریخ وار حقائق کے بیان تک محدود تھا، بیسویں صدی میں سماجی اور معاشی سطح پر اس کا کینوس وسیع ہوا ۔اب اکیسویں صدی میں بین العلومی رویہ عام ہو چکا ہے۔ جس کے تحت سوانحی ادب میں صرف مادی اور ثقافتی مطالعات کا احاطہ ہی نہیں کیا جاتا بلکہ سائنس کی دیگر شاخوں مثلاً جغرافیہ، سماجیات، معاشیات، نفسیات، علم آثار قدیمہ، علم بشریات، علم لسان و زبان اور جنسیات و نسلیات وغیرہ میں بھی ربط پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سوانح و سیرت نگاری کے تحقیقی طریقہ کار نہ صرف مؤرخین کے لیے بلکہ ادب، معاشیات اور سیاسیات سمیت دیگر شعبوں میں ہونے والی تحقیق کے لیے بھی بہت اہم ہیں۔ زیر نظر مقالہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس مقالے میں ابدال بیلا کی کتاب آقاﷺ کو سیرت، سوانح، تاریخ اور ادب کے جدید نظریات کے تحت دیکھا گیا ہے۔ ان کی تصنیف آقاﷺ سیرت کی کتاب ہے۔ ۱۱۴۴ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں ایک سے زیادہ اصناف کے عناصر یکجا نظر آتے ہیں، یوں تو یہ تصنیف سیرت نگاری کا ایک نمونہ ہے، جس میں سید الانبیا حضرت محمد ﷺ کی زندگی، سیرت اور سوانح بیان کی گئی ہے لیکن اس میں سوانح نگاری کا انداز اختیار کیا گیا ہے، تاہم مصنف نے سوانح لکھتے ہوئے کہیں بھی یہ حقیقت فراموش نہیں کی کہ وہ ایک عام انسان کی سوانح نہیں لکھ رہے، بلکہ ایک مقدس نبی اور برگزیدہ پیغمبر ﷺ کی سیرت و کردار پر قلم اٹھا رہے ہیں۔

اس کتاب میں اصول سیرت، اصول سوانح نگاری، تاریخ نویسی اور ادبی نثر کے اصول و ضوابط کا استعمال ملتا ہے۔ اس تصنیف کے کثیر الجہت ہونے کی وجہ سے اس کا تحقیقی و تنقیدی تجزیہ بھی کثیر العلومی انداز سے کیا گیا۔ اس مقصد کے لیے چار مختلف علوم سیرت، سوانح، تاریخ اور ادب کی تحقیق و تنقید کے نظری پیمانے استعمال کیے گئے۔ ان اصناف کے ادبی اظہار کی جانچ کے لیے ایک فریم ورک تشکیل دیا گیا، جس کے تحت آقاﷺ کا تحقیقی و تنقیدی تجزیہ کر کے نتائج کی منطقی پرکھ کے قابل ہوا جا سکے۔ اس مقالے کے لیے درج ذیل تحقیقی سوالات ترتیب دیے گئے۔

۱۔ آقاﷺ میں سیرت نگاری کے روایتی اسلوب کی پیروی اور اس سے انحراف کی کیا صورتیں اختیار کی گئی ہیں؟

۲۔ ہیئت، ساخت اور بنیادی ڈھانچے کے اعتبار سے آقاﷺ کی نوعیت کیا ہے اور اس تصنیف کو جدید سوانح نگاری کی کون سی قسم میں شمار کیا جاسکتا ہے؟

۳۔ آقاﷺ میں تاریخی بیانیے کی کون سی قسم کو کس انداز سے برتا گیا ہے؟ نیز تاریخی واقعات کے بیان میں معروضی حقائق کی موضوعی وضاحت کس طرح کی گئی ہے؟ اور اس بیان میں تخیل کی کارفرمائی کس حد تک نمایاں ہے؟

۴۔ آقاﷺ کے اسلوب میں ادبی حربوں کا استعمال واقعہ نگاری کو کس طرح متاثر کرتا ہے؟

مقالے کی تحریر کے دوران ان سوالاتِ تحقیق کے جوابات حاصل کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ آقاﷺ میں روایتی سیرت نگاری کی پیروی اور اس سے انحراف کی صورتیں معلوم کرنے کے لیے معروف علما و محققین و ناقدین؛ مولانا شبلی نعمانی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، ڈاکٹر حمید اللہ، ڈاکٹر سید عبد اللہ اور مستشرقین میں سے لیز لی ہیز لٹن کے وضع کردہ اصول سیرت نگاری کو مد نظر رکھتے ہوئے محقق نے کچھ اصول سیرت نگاری اخذ کیے۔ ان اخذ کردہ اصول سیرت نگاری کی مختلف عنوانات کے تحت درجہ بندی کی گئی۔ ان اصولوں کی روشنی میں آقاﷺ کے تجزیے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مصنف نے اپنی تصنیف میں سیرت نگاری کے روایتی اسلوب کی پیروی کے ساتھ ساتھ جدید سوانح نگاری اانداز اپنایا ہے۔ سیرت کے روایتی اسلوب کے مطابق آقاﷺ میں بھی مصنف نے تاریخی حقائق کو زمانی ترتیب کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری آپ ﷺ کی سوانح پاک سے آشنا ہونے کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کی تعلیمات اور آپؐ کے اخلاقِ حسنہ سے بھی واقفیت حاصل کرتا چلا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی پوری تصنیف میں یہ بات اپنے پیشِ نظر رکھی کہ وہ اللہ پاک کے محبوب ترین نبیؐ، جو کہ تمام انبیا کے سردار ہیں، کی حیاتِ مقدسہ پر لکھنے کی جسارت کر رہے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کو عام انسان کی بجائے نورِ مجسم سمجھ کر مصنف نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ انھوں نے اپنی تصنیف میں کسی مخصوص مسلک کا پرچار نہیں کیا، نہ ہی مختلف مسالک کی کہیں بحث چھیڑی ہے۔

سیرت نگاری کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے ابدال بیلا نے اپنی تصنیف میں نہ صرف قبل طلوع اسلام کے معاشرے کی عکاسی کی ہے، بلکہ حضور اکرم ﷺ کے زمانے کے معاشرتی نظام پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ عہد نبویؐ میں مسلم معاشرے کی تشکیل اور اس کے امتیازی اصولوں سے بھی متعارف کرواتے ہیں۔ سیرت کی دیگر تصانیف کی طرح آقاﷺ میں بھی مصنف نے نہ صرف اس عہد میں اخلاقی و سماجی اور سیاسی حالت اور غریب طبقے کی بے چینی اور اضطراب کو بھی بیان کیا ہے، بلکہ اس معاشرے پر نبی کریم ﷺ کے آفاقی پیغام کے مثبت اثرات کا بھی

تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ سیرت نگار کے لیے ضروری قرار دیا جاتا ہے کہ وہ متعلقہ ملک کی قدیم تاریخ کے بارے میں اچھی طرح آگاہ ہو۔ ابدال بیلا بھی واقعات کے بیان میں جہاں مناسب سمجھتے ہیں، ان علاقوں کے بارے میں قاری کی معلومات میں اضافہ بھی کرتے چلے جاتے ہیں۔

ابدال بیلا چوں کہ خود بھی پاکستانی فوج سے منسلک رہے، اس لیے بہت باریکی سے آپ ﷺ کی ان کامیابیوں کا تجزیہ کرتے ہیں، جو آپ ﷺ نے بحیثیت سپہ سالار اور جرنیل کے حاصل کیں۔ انھوں نے آقا ﷺ کتاب میں مختلف غزوات کے ذکر میں آپ ﷺ کی دفاعی حکمتِ عملیوں کا بھی تجزیہ کیا ہے۔ یوں تو سیرتِ نبوی ﷺ کی تمام تصانیف میں آقا ﷺ کی طرف سے اپنائی گئی حکمتِ عملیوں کا ذکر ہوتا ہے۔ لیکن آقا ﷺ میں ابدال بیلا کی طرف سے آپ ﷺ کی ہر حکمتِ عملی پر تبصرہ بھی ملتا ہے۔ مصنف نے آقا ﷺ کی جنگی بصیرت کا ایک اور پہلو سامنے رکھتے ہوئے بتایا کہ دراصل آقا ﷺ آنے والے زمانوں کے لیے فوجی قیادت کے حوالے سے اصول طے کر رہے تھے۔

ابدال بیلا نے بہت سی جگہوں پر روایاتِ سیرت کی تنقید و تنقیح بھی کی ہے، بلکہ ایک جگہ تو باقاعدہ جدید سیرت نگاروں کو ردِ روایت کا اختیار دینے کا بھی مطالبہ کیا ہے۔ مصنف نے جو بھی واقعہ بیان کیا ہے اس کے ساتھ واقعے کی تفہیم کے لیے اپنی ذاتی رائے ضرور دی ہے۔ کسی بھی واقعے سے پہلے یا بعد میں اس واقعے کے متعلق اپنی ذاتی رائے دینے کے بعد، اگر ضروری ہو تو بحث و تمحیص سے بھی کام لیا ہے۔ مصنف اکثر واقعات کے بیان سے پہلے استقرائی انداز اختیار کرتے ہیں۔ واقعے کے بیان سے پہلے اس کے سیاق و سباق یا پھر اس واقعہ کے محرکات کی وضاحت کرتے ہیں، تاکہ قاری کا ذہن واقعہ کی طرف متوجہ ہو جائے۔ کبھی کبھی استخراجی انداز میں واقعے کے بعد کی تفصیلات بیان کرتے ہیں، جیسے حقائق کی وضاحت کر رہے ہوں۔

آقا ﷺ کتاب میں مصنف نے سیرت کے واقعات کی تاویل میں سیرت نگاری کی روایت کے مطابق قرآنی آیات سے استفادہ تو کیا ہے، لیکن ان میں سے اکثر کا صرف اردو ترجمہ ہی دیا ہے۔

انجیل، زبور، تورات اور ہندوؤں کی مقدس کتب سے بھی حوالے اردو میں ہی درج کیے ہیں۔ ان تراجم کے لیے انہوں نے کون سی کتب کا مطالعہ کیا، اس کا ذکر کہیں نہیں کرتے۔

احادیث کی اہم کتب میں سے زیادہ تر ابنِ کثیر اور ابن ہشام کے حوالے دیے ہیں، کچھ دیگر کتبِ احادیث کے حوالے بھی درج ہیں۔ مثلاً صحیح مسلم، صحیح بخاری، ترمذی، نسائی وغیرہ۔

ایک خامی یا کمزوری جو ہمیں مصنف کی تصنیف میں نظر آتی ہے وہ یہ کہ وہ حوالوں کا زیادہ اہتمام نہیں کرتے۔ جو حوالے ان کی تصنیف میں موجود ہیں ان کو بھی مکمل حوالہ نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ نہ تو مصنف نے یہ وضاحت کی ہے کہ

انہوں نے احادیث کی کتب کے کون سے ایڈیشن کا مطالعہ کیا ہے اور نہ یہ واضح کیا ہے کہ اس تصنیف کے لیے عربی و فارسی کی اصل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے یا فلاں فلاں مترجم کے تراجم سے رہنمائی لی گئی ہے۔واقعات کے بیان میں حوالوں یا حواشی کا نہ ہونا قاری کو دورانِ مطالعہ دقت میں مبتلا کر دیتا ہے، جس سے تحریر کی روانی تو برقرار رہتی ہے، لیکن واقعات کے فہم میں ایک قسم کا خلا محسوس ہوتا ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے مصنف واقعے کی روانی پر بعض اوقات حوالوں کو قربان کر دیتے ہیں۔ کیوں کہ یہ ضروری نہیں کہ مصنف کی تحریر کردہ سیرت کی کتاب کا صرف اہلِ علم یا حافظِ قرآن حضرات ہی مطالعہ کریں گے۔ سطحی علم رکھنے والا انسان یقیناً آیات کی تصدیق کے لیے مشکل سے دوچار ہو گا۔ سیرت نگاری اس طرح کے غیر محتاط رویے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ان کا یہ انداز ان کے اپنے دعوے کے برعکس دکھائی دیتا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ سیرت کی اس تصنیف کے ذریعے وہ مغربی دنیا میں آقا ﷺ کا پیغام پہنچانے چلے ہیں، لیکن کوئی بھی نو مسلم یا غیر مسلم ان واقعات کو پڑھے گا تو وہ یقیناً ان آیات یا سورہ کے حوالہ جات کے معاملے میں تشنگی محسوس کرے گا۔

جن تمام اشعار سے مصنف نے اپنی تصنیف کو مزیّن کیا ہے، ان کے بارے میں یہ نہیں بتایا کہ ان اشعار کے ماٰخذ کون سے ہیں۔ عربی اشعار کے اردو تراجم کے دوران قارئین یہ جاننے سے قاصر رہتے ہیں کہ کیا یہ تراجم مصنف نے خود کیے ہیں یا کہیں اور سے نقل کیے ہیں۔ مصنف کی طرف سے اس قسم کی کوئی وضاحت نہیں ملتی۔ مصنف کو شعر کے آخر میں یا حواشی میں ان اشعار کے ماخذات کا ذکر ضرور کرنا چاہیے تھا تاکہ قاری چاہے تو ماخذ کو دیکھ کر خود تصدیق کر لے۔

سیرت کا موضوع سیرت نگار سے جہاں تصنیف کے فنی مراحل میں احتیاط کا تقاضا کرتا ہے، وہاں مواد کی پیش کش میں بھی احتیاط ناگزیر ہے۔ آقا ﷺ کے مصنف نے سیرت کی اس تصنیف میں دو مقامات پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو حضور پاک ﷺ کا بھتیجا لکھا ہے، حالاں کہ وہ آپ ﷺ کے چچا زاد بھائی تھے۔ چچا زاد کے علاوہ ان کا آقا ﷺ سے داماد کا رشتہ بھی تھا۔ مصنف کا ان کو نبی کریم ﷺ کا بھتیجا لکھنا یقیناً صریح غلطی ہے۔ کوئی نو مسلم، جو اسلام کی تاریخ نہ جانتا ہو، وہ اگر اس تصنیف کا مطالعہ کرے گا، تو یقیناً الجھن کا شکار ہو گا۔

آقا ﷺ کے اسلوب میں ایجاز و اختصار نمایاں ہیں۔ مصنف نے کسی بھی واقعہ کے بیان میں لمبی چوڑی تفاصیل میں جانے سے گریز کیا ہے اور بہت کم الفاظ میں اپنا مدعا بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔، تاہم بعض مقامات پر مصنف نے اس حد تک اختصار سے کام لیا ہے کہ واقعہ پوری طرح واضح نہیں ہو پاتا۔ کم الفاظ میں پورے معانی کا ابلاغ ہو جائے ، تو ہی اسے ایجاز کہا جاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس قدر کم الفاظ منتخب کیے جائیں کہ مدعا ہی پوری طرح سمجھ نہ آئے۔ مثال کے طور پر جب غزوہ احد میں آقا ﷺ نے اپنے سب لوگوں کو جمع کر کے صورتِ حال سے آگاہ کیا

اور قریش کی فوج کی تفصیل بتائی تو ان کو اپنا ایک خواب بھی سنایا جو اسی رات آقاﷺ نے دیکھا تھا۔ مصنف نے خواب سنانے کے بعد بتایا کہ نبی پاکﷺ نے اس خواب کی تعبیر بھی بیان فرمائی تھی جو بعد کے واقعات سے سچ نکلی۔ یہاں مصنف نے خواب کی تعبیر کا ذکر تو کیا ہے لیکن بیان نہیں کی۔ جس کی وجہ سے واقعے میں ایک قسم کا خلا محسوس ہوتا ہے۔ اسی طرح عبداللہ بن سلام نے قبول اسلام سے پہلے آقاﷺ سے سوال کیے تھے۔ گمان تھا کہ آقاﷺ جواب نہ دے پائیں گے لیکن آقاﷺ نے تینوں سوالوں کے جواب دے دیے۔ یہاں پہ مصنف کو سوالات کا ذکر کرنے کے بعد سوالات بیان کرنے چاہیے تھے، تاکہ واقعہ مکمل سمجھ آجائے، لیکن سوالات کا بیان نہ کرنا تشنگی کا احساس دلاتا ہے۔ آقاﷺ میں مصنف کی طرف سے حد سے زیادہ اختصار قاری کے لیے متن کی تفہیم میں دقت کا باعث بنتا ہے۔

تحقیقی مقالے کا دوسرا سوال آقاﷺ کی ہیئت، ساخت اور بنیادی ڈھانچے کے حوالے سے تھا۔ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے دو مغربی ناقدین جیمز لوری کلفرڈ (1978ء-1901ء : Clifford اور James Lowry) اور مائیکل بینٹن (Micheal Benton) کی تصانیف *From Puzzles to Portraits : Problems of Literary Biographer* اور *Literary Biography : An Introduction* میں موجود نظریاتی و تنقیدی مباحث کو آقاﷺ کے سوانحی عناصر کی تحقیق کے لیے منتخب کیا گیا۔ کلفرڈ کے خیال میں ایک سوانح نگار کے لیے اپنی سوانح نگاری کی نوعیت، ساخت، ہیئت اور بنیادی سمت متعین کرنا ایک مشکل اور اہم فیصلہ ہوتا ہے۔ سوانح نگاروں کی اسی مشکل کو کم کرنے کے لیے انہوں نے سوانح نگاری کی مختلف اقسام میں درجہ بندی کی ہے۔ ہر چند کہ یہ درجہ بندی آسان کام نہیں تاہم کلفرڈ نے سوانح نگاری کی جو اقسام گنوائی ہیں ان میں معروضی بایو گرافی، علمی، تاریخی بایو گرافی، فنکارانہ (ادیبانہ) بایو گرافی، بیانیہ بایو گرافی اور افسانوی بایو گرافی شامل ہیں۔

مائیکل بیٹن کی تصنیف میں ادبی سوانح نگاری کے خصائص کا تفصیلی تجزیہ ملتا ہے۔ اس میں وضاحت کی گئی ہے کہ کس طرح تاریخی حقائق کو بیانیہ کی روایت سے جوڑا جائے؟ بینٹن نے ادبی سوانح نگار کے لیے ضروری قرار دیا کہ ان کی "زندگی کی کہانی" میں روایتی کہانی کی طرح آغاز، وسط اور اختتام ہونا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے سوانح نگار کے لیے بیانیہ میں مہارت کو ضروری قرار دیا ہے۔

مندرجہ بالا تنقیدی مباحث کی روشنی میں کتاب آقاﷺ کا تجزیہ کیا گیا کہ ادبی سوانح نگار کی حیثیت سے آقاﷺ کتاب کے مصنف، اپنی تصنیف میں کہانی کے تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے کس طرح آغاز، وسط اور اختتام کی طرف بڑھے ہیں۔

آقاﷺ میں سیرتِ نبی پاک ﷺ کو ایک کہانی کے انداز میں بیان کرنے کے لیے، مصنف نے اپنی تصنیف کی ہیئت اور ڈھانچے سے لے کر مواد کی پیش کش تک، اپنے ذہن کو موضوع سے باہر نہیں جانے دیا۔ اپنی تحریر میں روانی اور تسلسل برقرار رکھنے کے لیے مصنف نے ہر ممکن کوشش کی ہے۔ آقاﷺ کے مصنف نے اپنی تصنیف میں Interwoven technique تکنیک کی مدد سے بھی خوب کام لیا ہے۔ اس تکنیک میں سوانح نگار، قاری کو جمالیاتی انداز میں صاحبِ سوانح کی تخلیقات کی طرف راغب کرتا ہے اور اپنی تحریر کے درمیان ہی (اس کی تخلیقات کا) تجزیہ پیش کرتا ہے۔ جیسا کہ آقاﷺ میں ہم دیکھتے ہیں کہ مصنف نے نامحسوس طریقے سے نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات کا پرچار کیا ہے۔

ابدال بیلا بنیادی طور پر چوں کہ ایک ناول نگار اور افسانہ نگار ہیں، اس لیے ان کا سارا کام ہی ادبی نوعیت کا ہے۔ ایک ادیب ہونے کے ناطے انھیں واقعہ نگاری میں کمال حاصل ہے۔ وہ واقعے کی تمام جزئیات کو اپنے تخیل سے ایسے بیان کرتے ہیں کہ واقعے کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ ان کی تصنیف میں جن اشخاص کا ذکر ملتا ہے، ان کے مخصوص امتیازات اور خصوصیات کو کردار نگاری میں نمایاں رکھتے ہیں۔ وہ کسی بھی کردار کی زندگی کے متعلق اہم خدوخال کو مثلاً واقعات و حالات، اس کی عادات و اطوار، حرکات و سکنات، اس کے حلیہ، لباس اور طرزِ گفتگو کو اس کے مزاج کے عین مطابق اس طرح اجاگر کرتے ہیں کہ قاری کی نگاہوں کے سامنے اُس انسان کی چلتی پھرتی شخصیت نمایاں ہو جاتی ہے۔

آقاﷺ کے مصنف نے اپنی تصنیف میں واقعات کے بیان میں کرداروں کی ذہنی استعداد کو دیکھتے ہوئے، جہاں مناسب لگا، وہاں ان کا نفسیاتی تجزیہ کر کے مختلف کرداروں کے باطنی محرکات تک رسائی کی کوشش کی ہے۔ آقاﷺ میں دیگر اشخاص کے علاوہ انھوں نے اپنے شعور کو عام انسانوں کی سطح پر لا کر رسولِ پاک ﷺ کی نفسیاتی کیفیت کا تجزیہ کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ مصنف آقا ﷺ کی نفسیاتی کیفیت کی ترجمانی میں اپنی ذاتی رائے اور تخیل کا سہارا لیتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ ایک سوانح نگار کی اس خوبی سے انکار نہیں کیا سکتا کہ وہ اپنے تخیل اور قیاس کی مدد سے حقیقت کو ڈھونڈ نکالتا ہے۔ اگرچہ آقاﷺ میں بھی مصنف کے پیشِ نظر یہ بات رہی ہے کہ وہ عام انسان کی سوانح نہیں لکھ رہے، لیکن اس کے باوجود وہ بہت سے مقامات پر آقا ﷺ کی نفسیاتی و بشری کیفیات کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ ہر چند کہ وہ احترام کی حدود سے باہر نہیں گئے، لیکن حقیقت یہ ہے محبوبِ خدا، محمد مصطفی ﷺ، جن کا رتبہ اللہ پاک کے بعد سب سے بلند ہے، ان کی نفسیات تک رسائی کسی بشر کے بس کی بات ہے نہیں۔

سیرت نگاری جیسے نازک موضوع پر علمِ نفسیات کے اطلاق کے حوالے سے یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ نفسیات در حقیقت ذہنی سر گرمیوں کا علم ہے۔ وہ واقعات جو ۱۷۵ء میں رونما ہوئے، ان کے بارے میں جان کاری پندرہ سو سال بعد کرنی ہے۔ ماضی کے بارے میں گفتگو چوں کہ نتائج کو دیکھ کر ہوتی ہے، اس لیے اس حوالے سے مفروضات تو قائم کیے جا سکتے ہیں لیکن انہیں مکمل حقیقت نہیں کہا سکتا۔ یہ مفروضات تبھی وجود میں آتے ہیں، جب تجربہ اس زمانے کے انسانی افعال و کردار سے جڑا ہوا ہو۔ چیزیں سیاق و سباق کے بغیر اپنی حقیقت کی طرف نہیں جا سکتیں۔ اس لیے آج کے مصنفین ماضی کے کرداروں کی ذہنی سر گرمیوں کی تہہ تک اس لیے مکمل طور پر نہیں پہنچ سکتے، کیوں کہ ان کے پاس ماضی کے واقعات کا مکمل سیاق و سباق نہیں ہوتا۔ جہاں تک نفسیاتی تجزیے کا تعلق ہے، تو ماضی کے دیگر کرداروں کی نفسیات کا جائزہ تو عام انسانی افعال کے تناظر میں لیا جا سکتا ہے، لیکن نبی پاک ﷺ کی ذاتِ اقدس کے بارے میں چوں کہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نہ تو اپنی مرضی سے کچھ بولتے تھے اور نہ ہی کچھ کرتے تھے، اس لیے آپ ﷺ کے افعال کے باطنی محرکات کا تجزیہ عام نفسیاتی اصولوں کی روشنی میں نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی اسے درست قرار دیا جا سکتا ہے۔

سوانح نگاری کی اقسام کا آقا ﷺ پر اطلاق کرنے اور اس تصنیف کے آغاز، وسط اور اختتام کے انداز کا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد محقق کی رائے ہے کہ اس تصنیف کو ادیبانہ/فنکارانہ بایو گرافی (Artistic Biography) کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔ مذکورہ تصنیف میں پیش کیے گئے اقتباسات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ابدال بیلا اپنی تصنیف آقا ﷺ میں تصوراتی تخلیقی فن کار کے طور پر حقائق کو پیش کرتے ہیں۔ اگرچہ سلاست، روانی اور شگفتگی کے دیگر لوازمات ان کی تصنیف میں بہت نمایاں ہیں اور پوری تصنیف میں ناول اور کہانی کا انداز نظر آتا ہے، لیکن سیرت جیسے نازک اور حساس موضوع کا عنوان ہی کائنات کی سب سے معتبر ہستی کی داستانِ حیات ہے۔ جس کے بیان میں تخیلاتی اسلوب سے مبالغے کا گمان ہوتا ہے۔ اس موضوع میں تخیل کا استعمال عام سوانح نگاری کے مقابلے میں زیادہ احتیاط کا متقاضی ہے۔ اگرچہ یہ سچ ہے کہ کسی بھی سیرت نگار کے لیے اپنے قیاس اور تخیل کو ذہنی ادراک سے الگ کرنا ممکن نہیں، لیکن نبی کریم ﷺ کے اعمال و افعال کے بارے میں خیال بافی سے کام لینا یا قیاس میں اس حد تک آگے چلے جانا کہ غیب کی باتوں کے جاننے کا دعویٰ کرنا پڑے، یہ سب سنجیدہ سوانح نگار کو زیب نہیں دیتا۔ آقا ﷺ کے متن میں مصنف کی طرف سے حد سے زیادہ تخیل کی آمیزش بعض مقامات پر حقیقت کو مسخ کرنے کا باعث بنتی ہے۔ اس سے تصنیف کا علمی و تحقیقی معیار غیر معتبر معلوم ہوتا ہے۔

ملحوظ رہے کہ جدید سوانح نگاری سوانح نگار سے یہ مطالبہ بھی کرتی ہے کہ اسے تاریخی حقائق کی تفصیلات پر مکمل عبور حاصل ہو، تاکہ وہ حقائق کی صداقت کو برقرار رکھتے ہوئے ڈرامائی انداز میں زندگی کی تخلیقِ نو کر سکے۔ یعنی وہ

اپنی رائے اور بصیرت سے واقعات کو دوبارہ تخلیق کرے اور بتائے کہ یہ واقعہ اس طرح ہوا ہو گا، تاہم یہ ضروری ہے کہ وہ واقعے کی مزید تفصیلات کو حواشی میں لازماً درج کرے۔ ماخذ کی تفصیلات فراہم کرنے سے ایک تو مزید مواد کی نشان دہی ممکن ہو سکتی ہے اور دوسرا مصنف کا بیان مستند اور معتبر ہو سکتا ہے۔ آقاﷺ کتاب کو اس حوالے سے دیکھا جائے تو مصنف اس اصول پہ پورا اترتے ہوئے محسوس نہیں ہوتے۔ ان کا اپنا دعویٰ ہے کہ انہوں نے کسی بھی واقعے کے بارے میں مختلف روایات میں سے کسی ایک مخصوص روایت کا انتخاب بہت سوچ بچار کے بعد کیا، لیکن انہوں نے اپنی تصنیف میں کہیں بھی ان روایات کا ذکر نہیں کیا، نہ ہی حواشی یا حوالہ جات میں ان روایات کو بیان کیا۔ سوانح نگاری کا یہ بنیادی اصول ہے کہ تمام شواہد کی تفاصیل اضافی نوٹس یا حواشی میں بیان کی جائیں۔ بے شک غیر ضروری طوالت سے بچنے کے لیے انہیں متن میں جگہ نہ بھی دی جائے، لیکن قاری تک ماخذ کو پہنچانا سوانح نگار کی ذمہ داری ہے۔ اپنی تصنیف میں ابدال بیلا اس ذمہ داری سے مکمل طور پر عہدہ برآ ہوتے نظر نہیں آتے۔

مقالے کے چوتھے تحقیقی سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے جارن ریوزن Jorn Rusen (۱۹۳۸ء) اور ڈیوڈ کار David Carr (1940ء) کے تاریخی نظری مباحث کو پیمانے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ ان مصنفین کے یہ نظری مباحث ان کی تصانیف بالترتیب *History :Narration, Interpretation, Orientation* اور *History , Fiction and Human Time: Historical imagination* میں بیان ہوئے ہیں۔ ان کتب میں موجود مباحث کی روشنی میں آقاﷺ میں تاریخی بیانیے کی نوعیت، معروضی حقائق کی موضوعی وضاحت اور تاریخی بیانیے میں تخیل کی کار فرمائی کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

اس تجزیے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ آقاﷺ کے متن میں تاریخی بیانیے کی چاروں اقسام؛ روایتی، تنقیدی، مثالی اور جینیاتی اگرچہ ایک دوسرے سے منفرد ہیں، مگر یہ ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتیں، بلکہ ان کا ایک باہم تعلقِ مسلسل ہے۔ آقاﷺ کے متن میں بیانیے کی روایتی قسم زیادہ نمایاں ہے۔ روایتی بیانیے کے طور پر آقاﷺ کے مصنف نے سیرت کی روایات کو ہم تک پہنچایا ہے۔ انہوں نے بہت سی جگہوں پر اخلاقیات کو بھی روایت کے طور پر بیان کیا ہے اگرچہ واقعاتِ سیرت کی روایات کو مصنف نے اپنے انداز سے بیان کیا ہے، لیکن جہاں انہوں نے ضروری سمجھا، مختلف کتبِ سیرت یا احادیث کی کتب سے اپنی بات کی توثیق کے لیے اقتباسات بھی نقل کیے ہیں لیکن ان اقتباسات یا کتب کے مکمل حوالے فراہم نہیں کیے جو کہ کسی بھی روایت کے بیان میں ناگزیر ہوتے ہیں۔ روایات کے بیان میں حوالے درج نہ کرنا یا حواشی میں ان کا ذکر نہ کرنا مصنف کی تصنیف کے مستند ہونے پر ایک سوالیہ نشان ہے۔

مثالی بیانیے کو اپناتے ہوئے وہ صرف روایات کے بیان پر ہی اکتفا نہیں کرتے، بلکہ جگہ جگہ عقلی استدلال سے بھی کام لیتے ہیں۔ وہ اپنے تاریخی شعور سے مختلف روایات کے بیان کے بعد، ان روایات سے عام اصول اخذ کر لیتے ہیں اور اپنے تدبر سے ان اصولوں کو موجودہ حالات پر لاگو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تنقیدی تاریخی شعور بھی ان کے ہاں دیکھا جا سکتا ہے۔ مصنف سیرت نگاروں کی بیان کردہ اکثر روایات کی نہ صرف نفی کرتے ہیں، بلکہ پنے تدبر سے دلائل بھی دیتے ہیں۔ جینیاتی بیانیے کی رو سے مصنف اکثر واقعات کے بیان کے بعد روایات کو مان تو لیتے ہیں، لیکن متحرک ارتقا کی اس قسم کے مطابق واقعے کی وضاحت بھی بیان کرتے ہیں۔

تاریخی ادراک جو دراصل ایک وقوفی عمل ہے، اس کے دونوں پہلوؤں؛ معروضی اور موضوعی، کی وضاحت آقاﷺ کے متن سے کی جا سکتی ہے۔ معروضی پہلو، جو کہ ماضی کے تجربے سے متعلق ہے اور موضوعی پہلو، جو زندگی کے مسائل کی نشان دہی اور ان کے حل سے متعلق ہے۔ دونوں پہلو ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ ان دونوں پہلوؤں کی مدد سے مصنف ہر واقعے کی وضاحت کرتے ہیں۔ ہر واقعے کے بیان کے بعد اپنی ذاتی رائے سے وضاحت کرنے کا انداز پوری تصنیف پر حاوی ہے۔

تخیل کے بارے میں عام تصور ہے کہ ہم جو کچھ بھی سنتے ہیں یا سوچتے ہیں، ہمارا دماغ پہلے اس کی تصویر بناتا ہے۔ ہر شخص اپنے دماغ پر نقش ان تصاویر کی مدد سے واقعہ بیان کرتا ہے۔ اب یہ ہر انسان کی دماغی صلاحیت اور بیانیے پر منحصر ہے کہ وہ کس قدر گہرائی میں جا کر تصاویر کھینچتا ہے اور اپنے منفرد انداز سے ان کو بیان کرتا ہے۔ ابدال بیلا کی تصنیف کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود کو واقعے کے مناظر میں ایسا گم کر لیتے ہیں کہ ہر منظر زندہ ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔ مصنف نے اپنی تصنیف میں زیادہ تر فطری مناظر کی تصویر کشی کی بجائے سیرتِ نبوی ﷺ کے واقعات کے مناظر کی ہو بہو تصویر کشی کرنے کی کوشش کی ہے۔ مصنف کی طرف سے کی گئی منظر کشی میں ان کے تخیل کا عمل دخل ہوتا ہے۔ یہ تو واضح ہے کہ تاریخی حقائق کے بیانیے میں حقیقت کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا ہے، جو ان حقائق کو تاریخی اسناد فراہم کرتا ہے۔ معروضی حقائق کی موضوعی وضاحت اور واقعات کے بیان میں تخیل کی کارفرمائی کی وجہ سے بیانیے اور حقیقت میں تعلق استوار ہوتا ہے۔ اسی لیے بیانیہ داستانی انداز کا حامل ہو جاتا ہے، لیکن جہاں تک سیرت نگاری کا تعلق ہے تو اس صنف میں جب تخیل کے کار منصبی کی بات کی جائے تو یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ اس صنف میں تخیل کا استعمال ہر طرح سے جائز ہے۔ یہ موضوع سیرت نگار سے عام تاریخ نگاری کے معاملے میں زیادہ احتیاط کا تقاضا کرتا ہے۔ چودہ سو سال پہلے کے واقعات کے بیان میں حد سے زیادہ تخیل مبالغے کو جنم دیتا ہے۔ آقاﷺ میں بعض مقامات پر مصنف کی مبالغہ آرائی حقیقت کو مسخ کرنے کا باعث بن رہی ہے۔ اس سے اس تصنیف کا علمی و تحقیقی معیار بھی متاثر ہو رہا ہے۔

آخر میں ڈیوڈ جولف کے پیش کردہ فریم ورک کی روشنی میں آقاﷺ کے متن کا ادبی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ڈیوڈ جولف کے اس فریم ورک کے دو حصے ہیں۔پہلے حصے کو بلاغت (Rhetorical Situation) کا نام دیا گیا ہے۔اس حصے میں ان اندرونی و بیرونی محرکات کا جائزہ لیا گیا ہے، جن کی ترغیب سے مصنف نے اپنی تصنیف لکھی۔اس میں تصنیف کی ضرورت، قارئین اور تصنیف کے مقصد کے حوالے سے سے بحث کی گئی ہے۔فریم ورک کے دوسرے حصے کو کشش انگیزی (Appeals) سے موسوم کیا گیا ہے، اس میں یہ دیکھا گیا ہے کہ مصنف کی طرف سے منطقی استدلال کا استعمال کس انداز سے کیا گیا ہے؟ مصنف نے اپنی تصنیف میں کس نقطہ نظر کا پرچار کیا ہے؟ ان کا اندازِ بیان کیسا ہے؟ انھوں نے اسلوب کیسا اختیار کیا؟ ان کے اسلوب میں ادبی حربوں کا استعمال واقعہ نگاری کو کس طرح متاثر کرتا ہے؟۔

اس فریم ورک کی روشنی میں آقاﷺ کے مصنف کی زبان و بیان کا تجزیہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ مصنف نے اپنے بیانیے کو ان محاسن سے مزّین کرنے کی کوشش کی ہے ،جو دراصل شاعری کا خاصہ سمجھے جاتے ہیں۔آقاﷺ کے بیانیے میں امیجری، تلمیح، تکرار، مبالغہ ، تشبیہ ،استعارہ اور خطیبانہ سوالات جیسی تکنیکوں اور حربوں کے استعمال کو محض لفظی بازی گری اور تصنع نہیں کہا جا سکتا، بلکہ ان کی تمام تکنیکیں ان کی تصنیف کا حصہ بن کر سامنے آتی ہیں۔ اگرچہ مصنف نے یہ تصنیف سیرتِ پاکﷺ جیسے اہم اور سنجیدہ موضوع پر لکھی ہے، لیکن ان کی زبان غیر رسمی اور بے ساختہ ہے۔انہوں نے اپنی تصنیف میں جذباتی زبان بھی استعمال کی ہے۔آقاﷺ کے مصنف ابدال بیلا نے مختلف جگہوں پر الفاظ کو ان کے لغوی معنوں کے بجائے مجازی معنوں میں استعمال کیا ہے۔بہت سے مقامات پر حضور اکرمﷺ کے اصحاب کا ذکر کیا تو ان کا نام لینے کے بجائے لفظ "پروانہ "استعمال کیا اور آپﷺ کی ذاتِ مبارکہ کے لیے "شمع "کا لفظ استعمال کیا ہے۔پروانہ چوں کہ شمع کا متوالا ہوتا ہے اور شمع کے روشن الاؤ کے سامنے اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، لیکن شمع کے معاملے میں اس کا شوق اور وارفتگی کم نہیں ہو پاتی۔آقاﷺ کے جان نثار ساتھیوں کے آقاﷺ سے والہانہ عشق کی وجہ سے مصنف نے جب بھی کسی صحابی کی آپﷺ سے محبت کا ذکر کیا تو لفظ "پروانہ "ہی استعمال کیا۔

ابدال بیلا کے ہاں ہمیں لفظیات کے استعمال میں تنوع ملتا ہے۔انہوں نے اپنی بات کی مکمل تفہیم کے لیے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جو ان کے خیال میں کسی بھی غیر جانب دار لفظ سے زیادہ قائل کرنے والے ہیں۔کبھی تو ہندی زبان کے الفاظ کا سہارا لیا ہے تو کبھی اردو عبارت کی روانی میں انگریزی زبان کے ان الفاظ کا بے دریغ استعمال کیا ہے، جو ہماری عام بول چال کا حصہ ہیں اور کبھی ایسے جذباتی الفاظ اپنی تحریر میں استعمال کیے ہیں، جن کو پڑھ کر فوراً قاری کے اندر الفاظ سے متعلقہ مثبت یا منفی جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ آقاﷺ میں جہاں الفاظ کے چناؤ سے تحریر میں

تنوّع، زور اور جوش پیدا کیا گیا ہے، وہاں قاری کو اس تصنیف کے متن میں بہت سے مقامات پر غلط املا اور غلط رموزِ اوقاف کے مسائل سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مصنف نے واقعاتِ سیرت کو ادبی پیرائے میں بیان کر کے اپنی تصنیف کو ادبی تصانیف کی صف میں لا کھڑا کیا ہے، لیکن کسی ادبی تصنیف میں املا اور رموزِ اوقاف کی اغلاط سے مصنف کے بارے میں کچھ اچھا تاثر قائم نہیں ہوتا۔ بہت سے مقامات پر رموزِ اوقاف اور املا کی اغلاط کی موجودگی ان کی تصنیف کا ادبی حسن ماند کر رہی ہے۔ کسی بھی ادیب کی تصنیف کی زبان اس کی اپنی ذات کی ترجمان ہوتی ہے، اس لیے ادبا کے لیے ضروری ہے کہ زبان و املا پر ان کی مکمل دسترس ہو، کیوں کہ املا اور رموزِ اوقاف کی اغلاط سے بعض اوقات متن کے معنی بھی بدل جاتے ہیں، جو قاری کے لیے الجھن کا باعث بن سکتے ہیں۔ آقاﷺ کے متن میں یہ اغلاط مصنف کے غیر سنجیدہ رویے کا ثبوت ہیں۔

آقاﷺ میں جملوں کی اقسام، تنوّع اور ان کی ترتیب کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اپنی نثر میں طویل جملے بھی استعمال کیے ہیں اور مختصر جملے بھی۔ مصنف نے ان جملوں میں بہت کم حروفِ عطف کا استعمال کیا ہے حتیٰ کہ رموزِ اوقاف کی دوسری علامتیں بھی بہت کم استعمال کی ہیں۔ مخصوص الفاظ پر زور دینے کے لیے اور جملے کے کسی حصے کو پر جوش بنانے کے لیے وقفے کے لیے زیادہ تر صرف علامتِ سکتہ (،) کا استعمال کیا گیا ہے، جو کہ ذرا سے توقف کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ بہت کم حروفِ عطف کے استعمال سے جملے زیادہ پیچیدہ اور مبہم ہو گئے ہیں، ان کی تفہیم میں بعض اوقات دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ابدال بیلا کی سیرت کی تصنیف آقاﷺ کا مقصد قارئین کے دلوں میں رسول اکرم ﷺ کی محبت پیدا کرنا ہے۔ معروضی حقائق کے بیان میں عقیدت کا پہلو نمایاں ہے۔ مصنف نبی اکرم ﷺ کا پیغام تمام بنی نوع انسان تک پہنچانا چاہتے ہیں، بالخصوص مغربی دنیا میں آقا ﷺ کی تعلیمات کا پرچار کرنا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے اپنی تصنیف میں جہاں بھی ممکن ہوا، وہ اسلام اور عیسائیت کو قریب لانے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنی تحریر کے دوران قاری کی اخلاقی تربیت کا کوئی موقع ضائع نہیں ہونے دیتے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی تصنیف میں ترغیب کا پہلو نمایاں ہے۔ آقاﷺ میں مصنف، جابجا قاری کو آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس سے والہانہ عقیدت اور محبت کی طرف راغب کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آقاﷺ کو اول سے آخر تک جذبات نگاری کا مرقع کہا جا سکتا ہے۔ مصنف نے اپنے انداز، طرزِ تحریر اور الفاظ کے چناؤ کے علاوہ اپنے تخیل سے بھی قاری کے جذبات کو ابھارنے کی کوشش کی ہے، لیکن بعض مقامات پر ان کی جذبات نگاری میں مبالغے کی اس حد تک آمیزش ہو جاتی ہے، جو قاری کے جذبات کو بوجھل کر دیتی ہے۔ جذبات کی شدت کی وجہ سے ان کے بیان میں سنجیدگی، دلیل اور منطق کم ہو گئی ہے، جس سے تصنیف کا علمی و تحقیقی معیار متاثر ہو رہا ہے۔ سیرت جیسے اہم موضوع پر قلم اٹھانے کے

لیے ضروری ہے کہ سیرت نگار واقعات کے بیان میں صداقت اور خلوص سے کام لے، محض اپنے تخیل کا سہارا نہ لے۔ جذبات نگاری میں تخیل کی فراوانی سے بیان کا سارا حسن ماند پڑ جاتا ہے اور حقائق کے بیان پر مبالغے کا گماں ہوتا ہے، نیز اس سے تحریر کی تاثیر اور اس کے لسانی معیار میں بھی کمی واقع ہو سکتی ہے۔

کسی بھی تصنیف کے معیاری ہونے کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کے حوالے مستند ہوں لیکن مصنف نے اپنی تصنیف میں تاریخی استناد اور شہادتوں کو بھی بہت سے مقامات پر نظر انداز کیا گیا ہے۔ آقاﷺ کے آخر میں مصنف نے کتابیات کے عنوان کے ذیل میں ۱۹۴ کتب کی نامکمل سی فہرست دی ہے لیکن انہوں نے کون سی کتب کے کون سے ایڈیشن کا مطالعہ کیا ہے یا عربی و فارسی کی اصل کتب ان کے زیرِ مطالعہ رہیں یا ان کے تراجم ان کی نظر سے گزرے، مصنف کی طرف سے اس کی کوئی وضاحت نہیں ملتی۔ کتابیات میں درج تمام کتب کے حوالے ان کی تصنیف میں نظر نہیں آتے۔ مصنف کو ان تمام مصادر کی تفصیلات کی نشان دہی کرنی چاہیے تھی جن سے انہوں نے اپنی تصنیف کے لیے استفادہ کیا ہے تاکہ قاری کو یہ اندازہ لگانے میں بھی سہولت ہوتی کہ مصنف نے ان مراجع اور مصادر کو سمجھنے یا انہیں نقل کرنے میں کوئی غلطی تو نہیں کی۔ اس تصنیف میں معروضیت پر جذبہ عقیدت حاوی ہے، جس کا مقصد قارئین کے دلوں میں رسول اکرم ﷺ کی محبت پیدا کرنا ہے۔ کسی بھی معتبر تحقیقی تصنیف میں حواشی و حوالہ جات کا جس قدر اہتمام ہونا چاہیے، یہ تصنیف اس سے محروم ہے۔ اس لیے محقق کی رائے ہے کہ اس تصنیف کو سیرت کے معتبر مآخذ میں شمار نہیں کیا جا سکتا تاہم یہ ترغیبی ادب کا حصہ سمجھی جا سکتی ہے۔

کتابیات

کتابیات

آزاد،ابوالکلام۔رسولِ رحمتؐ،مرتبہ:مولاناغلام رسولؐ مہر۔لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز،۱۹۷۰ء۔

اخماد،ذوالکفلی (Akhmad ,Zulkifli.)،امیری،اسلان نور(Amiri ,Islan Nur.)۔"Analysis of Students Understanding in using Formal and Informal Expression"، مشمولہ: *Al-Lisan* ۔جلد۳شمارہ۳،اگست۲۰۱۸ء۔

اسدالقادری،مولانا۔سیرتِ رسولؐ ۔کراچی:المعین لمیٹڈ،۱۹۸۱ء۔

اسماعیل،سید محمد۔رسولِ عربی اور عصرِجدید۔کراچی:مکتبہ طلوعِ سحر،۱۹۶۹ء۔

اعوان،الیاس بابر۔ بنیادی تنقیدی تصورات(تھیئری/تناظرات)۔لاہور: عکس پبلی کیشنز،۲۰۱۸ء۔

التاجی،احمد۔"سیرۃ النبی العربی محمد رسولؐ"۔مشمولہ:مصطفیٰ البابی الحلبی۔مصر: ۱۹۷۸ء۔

المبحذ عربی اردو۔کراچی:دارالاشاعت،۱۹۷۵ء۔

الواجدی،ندیم۔"سیرت نگاری کے بعض اہم پہلو"۔مشمولہ: نقوش رسولؐ نمبر،جلد۱،ش۱۳۰۔دسمبر۱۹۸۲ء۔

انور،خورشید۔قرۃالعین حیدر کے ناولوں میں تاریخی شعور۔نئی دہلی:انجمن ترقی اردو،۱۹۹۳ء۔

ایڈل،لیئن(Edel,Leon) ۔ *Literary Biography* ۔ٹورنٹو:یونیورسٹی آف ٹورنٹو پریس،۱۹۵۷ء۔

ایڈل،لیئن(Edel,Leon)۔ *Biography :A Menifesto*۔لندن:یونیورسٹی آف ہوائی پریس،۱۹۷۸ء۔

ایڈل،لیئن(Edel,Leon)۔ *Writing Lives*۔نیویارک:نارٹن،۱۹۸۴ء۔

اگیرز،جارج(Iggers,George)۔ *New Directions in Europian Histriography*۔لندن: ژیل یونیورسٹی،۲۹۸۴ء۔

بیلا،ابدال۔ آقاﷺ۔لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۵ء۔

بینٹن،مائیکل(Benton,Micheal) ۔ *Literary Biograohy:An Introduction* ۔لندن:ویلی بلیک ویل پبلشرز،۲۰۰۹ء۔

پرنٹے،مائیکل(Printy,Micheal), *Skinner and Pocock in Context: Early Modern Political Thought Today*۔لندن:ژیل یونیورسٹی،۲۰۰۹ء۔

تائب،حفیظ۔کتابیاتِ سیرت رسولؐ(۱۹۸۷ء-۱۹۳۷ء)۔لاہور:نیشنل بک آف پاکستان،س ن۔

جاوید، عصمت۔نئی اردو قواعد۔نئی دہلی:ترقی اردو بیورو،۱۹۸۱ء۔

جعفری،رئیس احمد۔رسالتِ مآبؐ۔لاہور:اشاعت منزل،س ن۔

جین آئر ،نوول (Jane Eyre ,Novel)۔" Syntactic Analysis of Sentence Adverbials Observed in the Victorian"مشمولہ: *Arab World English Journal*، جلد۱۱،

شمارہ۲، جون۲۰۲۰ء۔

چشتی،ایس۔زمان۔نقوشِ سیرت۔لاہور:پروگریسوبکس،۲۰۰۷ء۔

حالی،الطاف حسین حیات جاوید۔نئی دہلی:ترقی اردو بورڈ،۱۹۷۹ء۔

حسین، مبشر۔عثمان، عبدالکریم۔دورِ جدید میں سیرت نگاری کے رجحانات۔اسلام آباد: ادارہ تحقیقاتِ اسلامی،۲۰۱۵ء۔

حمیداللہ، محمد۔خطباتِ بہاول پور: ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔بہاول پور:اسلامیہ یونی ورسٹی،۱۹۸۱ء۔

ایضاً۔عہدِ نبوی میں نظامِ حکمرانی۔دہلی:مکتبہء جامعہ،۱۹۸۱ء۔

ایضاً۔پیغمبر اسلام ﷺ، مترجم:پروفیسر خالد پرویز۔ملتان:بیکن بکس،۲۰۰۵ء۔

خالد،انور محمود۔اردو نثر میں سیرت رسول ﷺ۔لاہور: اقبال اکادمی پاکستان،۱۹۸۹ء۔

خان، سر سید احمد۔الخطبات الا حمدیہ فی العرب والسیرۃ محمدی۔لاہور:ادارہ دعوت القرآن، س ن۔

خان، شیر نوروز۔ذخیرہ کتب سیرت۔اسلام آباد:ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، س ن۔

دریابادی، عبدالقوی۔معاصرین : عبدالماجد دریا بادی۔کراچی: مجلسِ نشریاتِ اسلام، س ن۔

دریابادی، عبدالماجد۔سیرتِ نبوی قرآنی۔لاہور:مکہ بکس، س ندارد۔

رینڈرز،ہینس،ہان،ڈی۔بن(Randers,Hanss)،(Han,De.Binne)۔ *Biographical Turns: Lives in History*۔لندن:راؤٹ لیج،۲۰۱۷ء۔

ایضاً، *Theoratical Discussions of Biography* ۔لندن:راؤٹ لیج،۲۰۱۴ء ۔

رینڈرز،ہینس۔ہیملٹن،نیگل۔ (Hamilton,Nigel)۔(Render,Henss)۔ *The ABC of Modern Biographhy*۔لندن:راؤٹ لیج،۱۰ستمبر۲۰۱۸ء ۔

ریوزن،جارن(Rusen,Jorn)۔ *Narrativity and Objectivity in the Historical Studies - in Symposium : History and Limits of Interpretation* لندن:رائس یونیورسٹی،۱۹۹۶ء۔

ریوزن،جارن(Rusen,Jorn)۔ *History: Narration, Interpretation, Orientation* ۔ نیو یارک: برگ ہان بکس،۲۰۰۵ء۔

سٹریچی،لٹن (Strachey Lytton)۔ *Emint Victorian* ۔نیویارک:گارڈن سٹی پبلشرز،۲۰۰۹ء۔

سعید، حکیم محمد۔ *In Search of Manuscripts in Quarterly hamdard Islamicus.*، جلد۱۳، شمارہ۲۔کراچی: ہمدرد فاؤنڈیشن،۱۹۹۰ء۔

شاہین،امیر اللہ خان۔فنِ سوانح نگاری۔دہلی:طاہر بک ایجنسی،جون۱۹۷۳ء۔

شیرووا ،آئی۔اے(Shirova ,I. A)۔ *How to Analyse Fiction* ۔پیٹربرگ:بورلے آرٹ،۲۰۰۶ء۔

صدیقی، محمد شکیل۔ بر صغیر پاک و ہند میں سیرت نگاری کے رجحانات(مقالہ برائے پی ایچ ڈی)۔ جامع کراچی:۲۰۰۵ء۔
صدیقی، محمد یٰسین مظہر۔خطبات سیرت(مصادرِ سیرت کا تجزیاتی مطالعہ)۔اسلام آباد:ادارہ تحقیقاتِ اسلامی،۲۰۱۷ء۔
طاہر القادری، محمد۔سیرۃ الرسولؐ کی تہذیبی و ثقافتی اہمیت۔لاہور: منہاج القرآن پبلی کیشنز، ستمبر ۲۰۰۷ء۔
عابد، عابد علی۔انتقاد۔ادارہ فروغ اردو،۱۹۵۶ء۔
ایضاً۔اسلوب۔ادارہ فروغ اردو۔۱۹۷۶ء۔
ایضاً۔ البدیع۔لاہور: مجلس ترقی ادب، مارچ ۱۹۸۵ء۔
ایضاً۔ البیان۔لاہور: مجلس ترقی ادب، فروری ۱۹۸۶ء۔
عارف، نجیبہ۔"نوآبادیاتی عہد میں اردو سیرت نگاری: چند مخصوص رجحانات واسالیب کا جائزہ"۔مشمولہ: دورِ جدید میں سیرت نگاری کے رجحانات ۔ اسلام آباد : دائرہ تحقیقات اسلامی، مارچ ۲۰۱۱ء۔
عبدالحق ،مولوی۔ قواعد اردو ۔۔دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۹۴۰ء۔
عبداللہ، سید۔"فن سیرت نگاری پر ایک نظر"۔مشمولہ : فکر و نظر۔شمارہ نمبر ۱۳۵۔اسلام آباد : دائرہ تحقیقات اسلامی، ۱۹۷۶ء۔
علی، سید شاہ۔اردو میں سوانح نگاری۔ڈھاکہ : گلڈ پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۶۱ء۔
علی، مبارک۔"اردو میں تاریخ نویسی"۔مشمولہ: تاریخ۔ سہ ماہی، شمارہ نمبر ۳۲، تاریخ نویسی نمبر، جنوری ۲۰۰۷ء ۔
غازی، محمود احمد۔محاضرات سیرت طبع سوم۔ لاہور: الفیصل ناشران، ۲۰۰۹ء۔
فاخرہ، ممتاز۔اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا : ۱۹۱۴ تا ۱۹۷۵ء۔دہلی : رونق پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۴ء۔
فاطمہ، آنسہ الطاف۔اردو ادب میں فن سوانح نگاری کا ارتقا۔دہلی : اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۷۴ء۔
فتح پوری، فرمان۔اردو نثر کا فنی ارتقا۔لاہور : الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء۔
فریزر، رابرٹ(Fraser Robert,)۔دیباچہ: *After Ancient Biography*۔سوئزرلینڈ: سپرنگر نیچر، ۲۰۲۰ء۔
فیصل، ملک راشد۔حالی کی سوانح نگاری(حیاتِ جاوید کی روشنی میں)۔دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۷ء۔
قدوائی۔آصف۔مقالاتِ سیرت۔لکھنؤ: مجلس تحقیقاتِ نشریاتِ اسلام، ۱۹۶۷ء۔
قریشی، اشتیاق حسین۔بر عظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ۔(مترجم: ہلال احمد زبیری)۔کراچی: شعبہء تصنیف و تالیف و ترجمہ، ۱۹۹۹ء۔
کار، ڈیوڈ (Carr,david) *History,Fiction and Human Time in Symposium : History and its limits of Interpretation*۔لندن: رائس یونیورسٹی۔۱۹۹۹ء۔

کار،ڈیوڈ (Carr,david) ۔ "History, Fiction and Human Time: Historical Imagination and Historical Responsbility"، مشمولہ *Ethics of History*، ۲۰۰۴ء۔

کاظمی،احمد سعید۔معراج النبیؐ۔کراچی: مدینہ پبلشنگ کمپنی، س ن۔

کڈن، جے۔اے (Cuddon ,J. A.)۔ *Dictionary of Literay Terms and Literary Theory* ۔ لندن: پینگوئن بکس، ۱۹۹۲ء۔

کلفرڈ، جیمز لوری (Clfford ,James Lowry)۔ *From Puzzle To Portrait:Problems of Literary Biographer*۔ چیپل ہل: یونی ورسٹی آف نارتھ کیلی فورنیا پریس، ۱۹۷۰ء۔

کیسنیا، خواسٹووا (Kesnia,khwastova) *Problems of Historical Cognition in the Light of Contemporary Interdisciplinary Studies*۔ماسکو، ۱۹۹۷ء۔

گل، صادق علی۔فن تاریخ نویسی (ہومر سے ٹائن بی تک) ۔لاہور: پبلشرز ایمپوزیم، ۲۰۰۲ء۔

لورینا پی، ریپینا (, Lorina P , Repina)۔ "Historians in Search of new ways at the border of the centuries"۔ مشمولہ: *Codrul Cosminului* ۔ جلد ۱۹، طبع دوم ۔ دسمبر ۲۰۱۳ء۔

ماہر القادری، مولانا۔درِ یتیم۔لاہور: گوشہ ادب، ۱۹۸۰ء۔

عبد اللہ، محمد ۔" معاشرت نبویؐ: بیسویں صدی میں سیرت نگاری کا اہم رجحان"۔ مشمولہ: دورِ جدید میں سیرت نگاری کے رجحانات۔ اسلام آباد : دائرہ تحقیقات اسلامی ،مارچ ۲۰۱۱ء۔

مورس، اندرے (Mourios,Andre). *Aspect of Biography*۔امریکہ: کیمبرج یونیورسٹی پریس، ۱۹۶۶ء۔

نارنگ، گوپی چند۔ادبی تنقیدی تصورات۔لاہور: سنگِ میل پبلشرز، ۱۹۹۹ء۔

ناصر، نصیر احمد۔پیغمبرِ اعظم و آخرؐ۔لاہور: فیروز سنز، سن ندارد۔

ندوی، ابوالحسن۔"سیرۃ نگاری کی ذمہ داریاں"۔ مشمولہ: نقوش رسول نمبر جلد اول، شمارہ نمبر ۱۳۰، ۱۹۸۲ء۔

ایضاً ۔ رحمت عالمؐ۔کراچی: مجلس نشریات اسلام، س۔ن۔

ندوی، سید سلیمان۔سیرت النبیﷺ جلد سوم۔لاہور : ادارہ فروغ اردو، ۱۹۹۱ء۔

ایضاً۔ خطبات مدراس ۔ لاہور : سنگ میل پبلیکیشنز۔ ۲۰۰۳ء۔

ندوی، محمد جنید۔"سیرت نگاری کے مآخذ، اصول اور منہج"۔ مشمولہ: السیرتہ العالمی ۔ ۱۴۲۵ھ۔

نعمانی، شبلی، سیرت النبیﷺ جلد اول تا ہفتم۔اسلام آباد : نیشنل بک فاونڈیشن، ۱۹۹۱ء۔

واحدی، ملا۔حیات ِسرورِ کائنات۔کراچی: دفتر رسالہ نظام المشائخ، ۱۹۵۴ء۔

وحید الدین، مولانا۔مطالعہ سیرت ۔نیو دہلی: نائس پرنٹنگ پریس، ۱۹۹۹ء۔

وارفل ،ہیری آر (Warfel, Harry R)۔ "Syntax Makes Literature"۔ مشمولہ :
Information Journal۔ جلد ۲۱، شمارہ ۵، فروری ۱۹۶۰ء۔

ہیزلٹن، لیزلی (Hezleton, Lasley)۔ *The First Muslim*۔ لندن: اٹلانٹک بکس، ۲۰۱۳ء۔

ویب سائٹس (Websites):

www.goodreaders .com/book/show/55445018111

https://www.cusd80.com/cms/lib/AZ01001175/Centricity/Domain/8219/jolliffes-rhetorical-framework1.pdf

http://www.innovativeresearchpublication.com/singapore/paper%2078.pdf

https://www.merriam-webster.com

https://drkhalidiqbal.wordpress.com

https://www.humsub.com.pk/364747/abu-fahad-nadvi-6,3:30pm

https://ur.autograndad.com/808605/1-تاریخ-نگاری.html